

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۲۱۶

RESERVED

مختصر تاریخ تہذیب

مصنفہ

جان ایس ہائی لینڈ۔ ایم۔ اے (کیمبرج)

مترجمہ

سید مبارز الدین رفعت صاحب

شائع کردہ



انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

قیمت جلد پیر بلا جلد عم

۱۹۴۴ء

طبع اول

حیات کیا ہے؟

اس میں حیات (جان) کی ابتدا اور اس کے ارتقا کو سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے، اور وضاحت کے لیے بہت سی رنگین و سادہ تصاویر اور اشکال دی گئی ہیں۔ قیمت مجلہ ایک روپیہ دس آنے (پندرہ) بلا جلد ایک روپیہ چار آنے (پندرہ) ۹۹۹۲ م



مکالمات سائنس

سائنس کے نقطہ نظر سے زندگی اور انسان کی تخلیق پر دل چپ مکالمے ہیں، جنہیں پروفیسر نصیر احمد صاحب عثمانی نے خاص سلیقے سے مرتب کیا ہے، زبان عام فہم ہے اور ہر شخص اسے شوق سے پڑھ سکتا ہے، اور معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے۔

قیمت مجلہ دو روپیہ (عشر) بلا جلد ایک روپیہ آٹھ آنے (پندرہ)

لئے کا پتا

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

سہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۲۱۶

مختصر تاریخِ تمدن

مصنّف

جان ایس ہائی لینڈ ایم۔ اے (کیمبرج)

مترجمہ

سید مبارز الدین رفعت صاحب

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

قیمت جلد سب سے بلاملہ ۸

۱۹۳۲ء

طبع اول

۹۰۱۵۹
۱۱۸ م

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱	پہلا باب تاریخ کی ابتدا	۱
۲۶	دوسرا باب تہذیب کا مفہوم - ہندستان اور چین	۲
۴۴	تیسرا باب عیسائیت اور اسلام	۳
۶۲	چوتھا باب یونان	۴
۸۵	پانچواں باب روم	۵
۱۱۴	چھٹا باب قرون وسطیٰ	۶
۱۵۷	ساتواں باب قومیت	۷
۱۸۴	آٹھواں باب بین قومیت	۸
۲۰۴	نواں باب یونان قدیم کا احیا اور جدید تخریکیں	۹
۲۴۰	تاریخی جدول	۱۰

M.A. LIBRARY, A.M.U.



U49994

مطبوعہ
(ہمدرد پریس دہلی)



بسم اللہ الرحمن الرحیم

Shariff Ahmed.

پہلا باب

تاریخ کی ابتدا

زمین کی پیدائش | بے شمار قرون پہلے آفتاب، زمین، سیارے اور ان کے چاند سب مل کر ایک شعلہ زن گیس تھے۔ تیزی سے گردش کرنے والی یہ دھبہ ہوئی گیس جب رفتہ رفتہ سرد ہونے لگی تو اس کے ٹکڑے الگ ہونے لگے۔ یہ ٹکڑے آہستہ آہستہ سخت ہوتے ہوئے سیارے اور ان کے چاند بن گئے۔ چونکہ یہ الگ الگ نظام شمسی کے ارکان اپنی ماں سے بہت چھوٹے تھے، اس لیے مرکزی آفتاب کے مقابلے میں یہ جلد سرد ہو گئے۔ اس طرح ہماری زمین ایک عرصہ دراز کے بعد موجودہ حالت کو پہنچی۔ اس کا اندرونی حصہ گرم اور اس کی بیرونی سطح سخت اور سرد ہو۔ یہ مرکزی آفتاب سے روشنی اور حرارت حاصل کرتی ہو جو ابھی تک بے حد شعلہ زن ہو۔ ابتدا میں جب خود زمین بھی بے حد گرم تھی، تمام سمندروں کا پانی کرہ ہوا میں وسیع ابر کی شکل

میں بخار بنا ہوا تھا۔ جیسے جیسے سردی کے مدارج طے ہوئے لگے، بخار کثیف ہو کر بارش میں تبدیل ہوتا گیا اور اس طرح سمندر عالم وجود میں آئے۔

بہت زمانے کے بعد غالباً ان گرم سمندروں کے ساحلوں پر سب سے پہلے زندگی کا ظہور ہوا۔ اس زندگی کا طریقہ

زندگی کی ابتدا

ظہور اب تک سرسبز راہ ہے۔ پہلا ذی حیات مادہ غالباً ایک نرم اور چھپی سی شے تھی، جس میں ہڈی اور صدف کا وجود نہ تھا۔ یہ مادہ تقسیم ہوتا ہوا بڑھتا گیا۔ اس کے بعد سمندر کی تہ میں اسی مادے سے سمندری کائی، گھونگے، کیڑے اور کیڑے پیدا ہوئے اور آخر میں مچھلیاں وجود میں آئیں۔ زندگی کی ان ابتدائی شکلوں میں سے بہت سی شکلوں کے متعلق آج ہمارے پاس ٹھیک ٹھیک صحیح معلومات موجود ہیں، کیوں کہ (مثلاً) جب گھونگے مر گئے تو ان کی سخت سپیاں سمندر کی تہ کی کیچڑ میں دفن رہ گئیں۔ اس کے بعد جیسے جیسے دریاؤں کے ذریعے ریت اور نرم مٹی زمین سے بہہ کر سمندر میں آتی گئی، کیچڑ کی تازہ تہیں ان پرانی سپیوں پر جمی گئیں۔ یہ کیچڑ اوپر کے مسلسل بڑھتے ہوئے بوجھ کے دباؤ سے بتدریج سخت ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس نے چٹان کی شکل اختیار کر لی۔ پھر کئی زمانوں بعد یا تو کسی اچانک زلزلے یا تقسیم وزن میں آہستہ آہستہ وقوع پذیر تغیرات نے جو سطح زمین پر کہیں ہوئے تھے، سمندر کی تہ میں کیچڑ کی ان چٹانوں کو اُبھار دیا تاکہ وہ خشک زمین کا ایک حصہ یا پہاڑوں کا بلند سلسلہ بن جائیں۔ اس حالت میں یہ

۱۔ اب بعض سائنس دانوں کا دعویٰ ہے کہ دوسرے سیاروں کی طرح زمین کی کوئی بے شمار سرد شہلوں کے دفن کر آئے سے ہوئی۔ ان شہلوں کے تصادم نے بے حد حرارت پیدا کر دی تھی۔

چٹانیں بارش اور ندیوں کے بہاؤ سے کٹ گئیں اور اسی طرح ایک عرصہ دراز کے بعد گھونگولوں کی وہ پُرانی سیپیاں جو ان چٹانوں میں دفن تھیں، نمودار ہو گئیں۔ اس طرح ہم قدیم جان داروں کی سیپیوں اور ہڈیوں کو بہت بڑی تعداد میں چٹانوں میں دفن دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی باقیات ”رِکاز“ کہلاتی ہیں۔ غالباً زمین کے سرد ہونے کے کم سے کم ایک ارب سال گزرنے کے بعد پہلی چٹانیں بنیں۔ اس طولِ طویل مدت کا نصف زمانہ گزرنے سے پہلے کافی سخت اعضا کے ساتھ کسی جان دار مخلوق نے ارتقا نہیں پایا تھا کہ وہ رِکاز کے طور پر چٹانوں میں محفوظ رہ سکتی۔

زندگی کا ارتقا | اب عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ زندگی کے ارتقا کا ایک بلا فصل عمل انسان کے عالم وجود میں آئے تک مسلسل جاری رہا۔ مختلف وقتوں میں خفیف تغیرات نے ایک انفرادی جان کو دوسرے انفرادی جان دار کے مقابلے میں ان کی شکل و صورت، دشمنوں سے اپنی حفاظت اور بچوں کی پرورش کے بارے میں بہتر مواقع عطا کیے۔ ایسے جان دار جو کم زور تھے یا اپنی حفاظت کے سامان سے آراستہ نہیں تھے، یا تو مار ڈالے گئے یا خود انھیں بھوکوں مرنا پڑا اور وہ اپنی نسل کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اس لیے قاعدے کے طور پر پہلی نسل سے دوسری نسل کے لیے ایسے جان دار چھانٹے گئے جو زیادہ مضبوط اور سامانِ حیات سے زیادہ آراستہ تھے۔ اس طرح مستقل ترقی کی بنیاد پڑی۔ نئی قسم کے جان دار ایک بے یک عظیم تغیرات یا ایسے معمولی تغیرات کے جمع ہو جانے سے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، یا تدریجی موسمی تغیرات اور دوسرے حالات میں عالم وجود میں آئے ہوں گے جن کی وجہ سے مخصوص جان دار ہی پھلے پھولے (یعنی ایسے جان دار جو سرد زمانے

میں سفید بال رکھتے تھے، اسی طرح آغز کا ریشہ جان دار ایک جدید مخلوق کے ارتقاء تک جیتے رہے۔

پھر ایسے صفات کے حامل بعض جان دار پیدا ہوئے جو بالکل مختلف حالات میں زندہ رکھنے کے قابل تھے۔ زندگی کی جدید تنظیم کے پیش رو غالباً یہی تھے۔ معمولی مینڈک خود اپنی زندگی کی داستان سے اس قسم کے تغیر کی ایک دل چپ مثال پیش کرتا ہے۔ اپنی ابتدائی منزلوں میں وہ مچھلی ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ خشکی کا ایسا جانور بن جاتا ہے جو پھیپھڑوں سے سانس لیتا ہے۔ یہ موضوع ابھی پوری طرح سمجھا نہیں گیا ہے خصوصاً وہ طریقہ کار جس سے جدید نشو و ارتقا تواریث اختیار کرتا ہے، ابھی تشنہ ہے لیکن رکاز اور موجودہ جانوروں کی تاریخ حیات کے مطالعے اور متعدد دوسرے ذرائع سے ابتدائی ذی حیات مخلوق سے لے کر خود انسان تک ارتقاء کے ایک واضح سلسلے کا پتا چلا یا جا سکتا ہے۔

ہوام پرندے اور پستانے | پہلے پہل زندگی نے پودوں کی صورت میں رفتہ رفتہ سمندر سے نمودار ہو کر خشک زمین میں اپنا گھر بنایا۔ بڑے بڑے جنگل پیدا ہوئے، سرسبز ہوئے اور سڑگل گئے۔ ان کے رکاز آج ہمیں معدنی کوئلے کی صورت میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ان قدیم جنگلوں میں بہت سے بڑی شکل کی حیات حیوانی متعدد درانوں تک کیڑوں کی شکل میں رہی۔ ان میں سے بعض بہت جسیم تھے۔ اس کے بعد سب سے پہلے ہوام نمودار ہوئے۔ یہی ہمارے سانپوں، چھپکلیوں اور گرومچھوں کے پیش رو ہیں۔ ان ابتدائی ہواموں میں بعض نہایت عظیم الجثہ تھے۔ ان کے باقی ماندہ رکاز سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا طویل

سوفٹ سے بھی زیادہ تھا۔ ان میں سے بعض درختوں کے پتے اور بعض گوشت کھاتے تھے۔

ان ہواموں کے بعد پرندے پیدا ہوئے۔ پہلے پہل یہ بڑی بڑی چمگادڑوں سے مشابہ تھے۔ ان کے پر یا حقیقی پنکھ نہ تھے، مگر بڑے بڑے زبردست دانت ہوتے تھے۔ اس کے بعد حقیقی پرندے نمودار ہونے شروع ہوئے۔

اس کے بعد زمین کے مدار اور اس کے محور میں تبدیلی کی وجہ سے ضرور ہو کہ ایک اچانک تغیر پیدا ہوا ہو۔ اس سے تمام یا تقریباً تمام بڑے بڑے ہوام غائب ہو گئے۔ ان کے مرنے کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ ان کے پوست اور چھلکے شدید سرد زمانے میں ان کی کافی حفاظت نہ کر سکے۔

غالباً ایک طویل وقفے کے بعد بڑے پستانوں نے ان کی جگہ لے لی۔ ہواموں کے عہد میں پستانینے نشو و ارتقا پائے تھے، مگر غالباً یہ چاہوں سے زیادہ بڑے نہ تھے۔ جب بڑے بڑے ہوام غائب ہو گئے تو پستانوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا اور ان کی متعدد اور مختلف قسمیں ظاہر ہونے لگیں۔ ماحول کے دباؤں اور ان کی ذاتی قابلیتوں نے ان کی

رہبری کی کہ وہ ایسا طریقہ زندگی اختیار کر میں جس سے بہتر سے بہتر طریقے پر ان کی بقا ممکن تھی۔ ان میں سے بعض پانی میں واپس چلے گئے (جیسے وہیل مچھلی) اور بعض درختوں پر چڑھ گئے (جیسے بندر) مگر تقریباً یہ تمام

ملہ ہوام اٹھ رہے تھے۔ اس کے جسم پر چھلکے ہوتے ہیں، مگر بال نہیں ہوتے۔ پستانینے اپنے بچوں کو دودھ پلاتا ہے جو انڈوں سے پیدا نہیں ہوتے۔ پھلی کی طرح ہوام اپنے بچوں سے بہت بے پروا ہوتا ہے، مگر پستانینے کی یہ خصوصیت کہ وہ اپنے بچوں کی بڑی حفاظت کرتا ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے نشو و ارتقا کو ترقی دینے والے اہم محرکات میں ہے۔

مختلف قسم کے پستانیں ایک ہی اُعلیٰ اور اہم سمت میں ترقی کر رہے تھے۔ یعنی اپنے ماحول پر پوری طرح اثر انداز ہونے اور بقا کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک عظیم تر دماغ کا ارتقا۔

ان دُور دراز زمانوں میں پائے جانے والے حیوانوں میں بعض نہایت ہی عظیم الجثہ تھے۔ غالباً ایک ارب سال پہلے ان ہی میں سے خود راست انسان کے مورث پیدا ہوئے۔ یہ مخلوق دنیا میں اس وقت جو جانور موجود ہیں ان کی بہ نسبت انسان سے زیادہ مثالی تھی، لیکن ہمارے علم میں اس وقت جو ادنا ترین انسانی نسل ہے، یہ ان سے بھی بہت کم درجے پر تھی۔

انسان کی تخلیق ہمیں اس کا علم نہیں کہ کس طرح، کب یا کہاں پہلی مرتبہ انسان روئے زمین پر نمودار ہوا۔ بہت ممکن ہے اس کا اصلی وطن ایشیا یا اس سے متصل جزیروں میں رہا ہو۔ اس کے فانت ہو فطرتاً میوے اور نرم جڑیں کھانے کے لیے موزوں ہیں، ان کی ساخت کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ یہ منطقہ سارہ کی آب و ہوا میں جہاں سال بھر ایسی غذا مل سکتی ہے، انسان کے اندر پیدا ہوئے۔ ہمیں اس کا بھی ٹھیک ٹھیک علم نہیں کہ ابتدائی انسان کو بقیہ حیوانی مملکت سے ملانے والے ماقبل انسانی مورثوں کا کیا حال تھا۔ غالباً اس کا قریب ترین مورث ایک بڑا سا بندرتھا۔ اس کے ہاتھ پر چمپانزی یا گورلا بندر سے مثالی تھے، لیکن اس کے پیر مضبوط اور ہاتھ نسبتاً چھوٹے تھے۔

بعض لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ اس طرح انسان کو حیوانوں کی نسل سے ثابت کرنا نہ صرف انسان کو ذلیل کرنا ہے بلکہ خدا کی بھی توہین کرنی ہے جو اس کا خالق ہے، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ جس صبر و سکون کے ساتھ ہماری نسل

کی تعمیر ہوئی ہے، جدید انکشافات اس کے بارے میں حیرت انگیز طریقہ تخلیق کا اظہار کرتے ہیں جس کا پہلے تصور بھی کرنا محال تھا۔ خدائے دنیا اور اس کے بننے والوں کی کس طرح تحقیق کی، اس کا کچھ اندازہ کرنے اور اس کی صنعت و حکمت کے آگے سرنگوں ہو جانے کے لیے ہمیں سائنس کچھ اس سے بھی زیادہ آمادہ کرتی جو اس سے پہلے ممکن ہی نہ تھا۔

جاؤ! میں ایک ایسے حیوان کی رکازی ہڈیاں
اولین انسانی نقوش دریافت ہوئی ہیں جو نصف بندر اور نصف

انسان تھا۔ یہ ایسی زمین کی تھوں میں پائی گئیں جس کی طبعی حالت سے پتا چلتا ہے کہ یہ مخلوق آج سے پانچ لاکھ سال پہلے زندہ تھی۔ تقریباً اسی زمانے کے پتھر کے نہایت سادہ آلات یورپ میں بہت بڑی تعداد میں دریافت ہوئے ہیں۔ یہ دستی کلہاڑیاں ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اسی قسم کی نیم انسانی مخلوق نے ٹھوکنے، پیسنے اور لٹانے کے لیے بنایا تھا جس کی ہڈیاں جاؤ! میں پائی گئی ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کو ابتدائی انسان کے قطعی سلسلے کا پتا چلے، تقریباً ڈھائی لاکھ سال کا وقفہ آتا ہے۔ دوسرا واضح ثبوت جو ہمارے پاس موجود ہے، وہ چند ہڈیاں ہیں، جو جرمنی میں ہائیڈل برگ کے مقام پر پائی گئیں۔ یہ ہڈیاں 'انسانی' ہڈیوں کی بہ نسبت اس مخلوق کی ہڈیوں سے بہت زیادہ خراب ہیں جو جاؤ! میں پائی گئی ہیں۔ مگر یہ بعید از قیاس ہے کہ یہ جبراً انسانی گھٹگو کے لیے استعمال کیا گیا ہو گا۔ ہم جانتے ہیں کہ اسی 'ہائیڈل برگ کے انسان' کے عہد میں یورپ میں خوف ناک شیر، شیربہر، ہاتھی گینڈے اور انا بیٹھے رہتے تھے۔

اس کے بعد ہمارے علم میں تقریباً ایک لاکھ سال کا ایک اور وقفہ آتا ہے۔ پھر ہمیں سکس میں پلٹ ڈاؤن کے مقام پر ایک ایسی مخلوق کی کھوپڑی ملتی ہے جس کا دماغ موجودہ انسان اور جاوا کے انسان کے دماغ کی درمیانی حالت میں تھا۔ اس کے بندر جیسے جبڑوں سے ثابت ہوتا ہے کہ غالباً یہ مخلوق راست انسان کی مورث نہیں بلکہ ان ہر جہتی ارتقاؤں میں سے ایک ارتقائی صورت تھی۔ اپنے حریفوں کے مقابلے میں یہ تنازعہ بقل کے سامان سے اچھی طرح آراستہ نہیں تھی، اسی لیے امتداد زمانہ سے یہ بھی ہوام اور پتائیوں کی طرح روئے زمین سے مفقود ہو گئی۔

ابتدائی انسان کے اولین نقوش جو یقیناً انسانی ہیں، پچاس ہزار سے قبل سے شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ نقوش جرمنی کی ایک وادی میں پائے گئے ہیں جو نین ڈر تھال کہلاتی ہے۔ یہ "نین ڈر تھال کا انسان" نہ تو سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا اور نہ اپنا سر اڈ پر اٹھا سکتا تھا۔ اس کے ٹھوڑی نہیں تھی اور شاید وہ گفتگو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی بندر سے متا ہے تھا، لیکن اس کی دماغی استعداد کسی بھی بندر سے کم سے کم دگنی تھی، اسے حیوانوں میں نہیں بلکہ انسانوں میں شمار کرنا چاہیے۔ نین ڈر تھال نسل کے اس ابتدائی انسان کی اور بہت سی ہڈیاں اور دوسرے نقوش جو یورپ اور افریقہ کے مختلف حصوں میں پائے گئے، ہمارے پاس موجود ہیں۔ "بعض حالات میں فردوں کو ضروری آلات اور غذائے ساتھ باقاعدہ طور پر دفن کیا گیا تھا تاکہ یہ دوسری زندگی میں فوراً کام آسکیں۔ بلاشبہ نین ڈر تھال وضع کے یہ انسان اپنے سر کی ساخت میں ایک خاص حد تک بندر سے متا ہے تھے..... تاہم اس کے باوجود وہ انسان ضرور تھے اور ان کا دماغ موت کے بعد کی

زندگی پر یقین رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اس طرح اب ہم زندگی کی ابتدا سے لے کر ان گنت زمانوں کے منت رقتار اور پرازالام ارتقل کے بعد آخر کا۔ انسان تک جا پہنچے ہیں۔ اس سلسلے میں ہر ہر قدم بے شمار افراد کی موت اور کل صنف کی فنا کے ذریعہ غذا حاصل کرنے اور بقا کی مہیب کش کش جاری رکھنے کے ساتھ اٹھایا گیا۔ یہ تدریجی ارتقا مکمل قربانی اور ناقابل شمار آلام اور مصائب پر حاوی تھا۔ اس میں حیوان حیوان کا اور نسل نسل کا شکار کر رہی تھی۔ اب یہ بات ہم پر بالکل واضح ہو کر اپنی اولاد کے لیے اپنی جان دینے پر ماں کی رضامندی اور حیوانوں کے گرد ہوں میں غذا حاصل کرنے اور حفاظت کے باہمی تعاون کرنے کی قابلیت، بقا کے دوزبردست عامل ہیں۔ ماں کی محبت اور برادری کا جذبہ ایسی چیزیں تھیں جو اعلا سے اعلا قسم کی زندگی کے نشو و ارتقا میں خود انسان کی تخلیق سے مدتوں پہلے ہی بے حد اہمیت رکھتی تھیں۔

انسان کی ابتدائی سلیں مختلف قسم کے

قدیم حجری عہد کا انسان

تھیں۔ یہ پتھر کا ایک ٹکڑا لے کر اس کی سطح اس طرح صاف کرتی تھیں کہ ان کی کوئی موزوں شکل بن جائے۔ اس کا ایک کنارہ کاٹنے کے لیے چھوڑ دیتی تھیں۔ ان آلات کو جلا دینا انھیں نہ آتا تھا۔ ہم ان انسانوں کو قدیم حجری عہد کا انسان کہتے ہیں۔

یہ ابتدائی حقیقی انسان جو اب سے غالباً پچاس ہزار سال پہلے دنیا میں رہتے تھے، ان کی زندگی نہایت دشوار تھی۔ ان کی دنیا خوف ناک درندوں

سے معمور تھی۔ جن غاروں میں یہ رہتے تھے، انھیں حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے شیر اور بچھ ان سے لڑتے رہتے تھے۔ جوں جوں زمین کے محور نے واضح طور پر ترچھی راہ اختیار کی آب و ہوا سرد سے سرد تر ہوتی جاتی تھی۔ زمین کے بڑے بڑے حصے "گلیشیر" نے خوب ڈھک گئے، یہ گویا ایک عظیم برفانی عہد کی ابتدا تھی۔ ایسے گلیشیر گرین لینڈ اور اپس برجن میں اب تک موجود ہیں، لیکن اس سے پہلے آگ دریافت ہو چکی تھی۔ اس کی دریافت سے تمدن کی رفتاریں بڑی تیزی پیدا ہو گئی۔ یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، اس انسان نے خرگوش سے بڑے جانوروں کا شکار کیا ہوگا۔ جیسے یہ شکاری تھے، غالباً غودان کا بھی شکار کیا جاتا ہوگا۔ میوے، اٹے، پرند، مینڈک، مچھلی، سانپ اور ایسے ہی جانوروں پر ان کی زندگی بسر ہوتی تھی۔ غالباً انھیں اس بات کا بھی شعور نہیں تھا کہ آیا ان کی غذا تازہ ہو یا ادھ مسڑی مکران میں سرداری، اور ان کی سماجی زندگی میں جماعت بندی یا چھوٹے چھوٹے قبیلوں کی ابتدا ہو گئی تھی۔

جب گرم موسم نے پھر ایک بار برفانی عہد کی جگہ
کرومیگ نارڈ | لے لی یعنی جب زمین کا جھکاؤ اس کے محور کی نسبت

کم ہونے لگا تو یورپ میں ایک نئی اور اعلیٰ قسم کا انسان نمودار ہونے لگا۔ غالباً یہ جدید نسل اپنے پیش رفتین ڈرتھال کے انسانوں سے الگ ہی پیدا ہوئی تھی۔ غالباً اس کا پہلا وطن ان سرزمینوں میں ہوگا جو اس وقت بحیرہ روم میں تہ آب ہیں۔ یہ نوادار دین ڈرتھال کے لوگوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ترقی یافتہ اور بہت زیادہ حقیقی انسان تھے۔ یقیناً اس نسل (یہ نسل کرومیگ نارڈ^۱)

۱۔ "کرومیگ نارڈ" فرانس میں ایک مقام ہے۔ جہاں ان کے ڈھانچے پہلی مرتبہ

دریافت ہوئے۔

کہلاتی ہی کے بعض افراد آج کل کے انسان سے بڑا دماغ رکھتے تھے۔ یہ بڑے شکاری تھے اور گھوڑوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ ان گھوڑوں کو وہ کھایا کرتے تھے مگر شاید ان پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نوبت تک کبھی جانور پالے نہیں گئے۔ ایک قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ یہ کرو میاگ نارڈ بہت اچھی طرح کام کر سکتے تھے۔ انھوں نے مختلف تصویریں اور خاص کر جانوروں کی تصویریں بہت اچھی بنائی ہیں۔ ان میں سے بہت سی تصویریں جو غالباً مذہبی اغراض کے لیے اُتاری گئی تھیں، گہرے غاروں میں پائی گئی ہیں۔ ان کے خلع اور رنگ نہایت شان دار ہیں اور یہ زندگی اور حرکت سے معمور ہیں۔ کرو میاگ نارڈ لوگوں نے ہڈیوں اور ہرن کے سینگوں پر بھی تصویریں اور نقش و نگار کندہ کیے ہیں۔ انھیں آئندہ زندگی کا پورا پورا یقین تھا۔ اس لیے وہ اپنے مژدوں کو شان دار طریقے پر دفن کرتے تھے۔ ان کے اور ان کی رشتہ دار نسلوں کے عہد میں جواب سے پندرہ ہزار سال پہلے کا زمانہ جو یورپ نے یادہ تر وسیع اور کھلی چراگا ہوں سے پٹا ہوا تھا۔ ان چراگا ہوں پر ہرنوں اور گھوڑوں کے گلے چرا کرتے تھے۔

جدید حجری عہد کا انسان | اس کے بعد آب و ہوا میں پھر ایک بڑا تغیر ہوا۔ یورپ مستقل طور پر زیادہ گرم و مرطوب ہو گیا اور رفتہ رفتہ بڑے جنگلوں سے پٹ گیا۔ ان جنگلوں میں ہم میدانوں میں رہنے اور گھوڑوں اور ہرنوں کا شکار کرنے والے انسانوں کی جگہ ایک دوسری لہ ان کی ایک نظام گاہ میں تقریباً دس لاکھ گھوڑوں کی ہڈیاں پائی گئی ہیں۔

سٹہ جوزف یورپ ہی میں (اور اس سے کچھ کم شمالی امریکہ میں) ماقبل تاریخ انسان کے آثار کی اطمینان بخش تحقیقات ہوئی ہو۔

نسل کو نمودار ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ نسل پتھر کے آلات بنانے کی ایک نئی اور
 اعلا قابلیت رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہو کہ یہ ”جدید حجری عہد“ کے انسان کہلاتے
 ہیں۔ ان کے آلات نہایت خوب صورتی سے بنائے جاتے تھے اور چلا
 دینے کے لحاظ سے قدیم حجری عہد کے انسان کے آلات سے مختلف ہیں۔
 جدید حجری عہد کے انسان کرومیاگ نارڈ لوگوں کی طرح تصویریں نہیں
 بنا سکتے تھے، مگر انھوں نے زمین جوڑنے کی ابتدا کر کے تمدن میں بڑا اضافہ
 کیا۔ غالباً انھوں نے انتشاری طریقہ کاشت کو اختیار کیا تھا۔ یعنی کبھی
 ایک قطعہ زمین پر کاشت کرتے تھے تو کبھی دوسرے پر۔ اس طرح کی
 کاشت اب بھی ہندستان کے بعض جنگلی قبیلے کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے
 گتے، گائیں، اور بھیڑ بکریاں پالی تھیں۔ برتن بنانا بھی جانتے تھے، زیب
 وزینت کے لیے سونے کے استعمال سے بھی یہ واقف تھے۔ کچھ مدت کے
 بعد یہ اپنے آلات اور ہتھیار پتھر کی جگہ تانبے اور کانسی کے بنانے لگے۔ کانسی
 دراصل تانبے اور ٹین کامرکب ہو اور دونوں سے زیادہ سخت ہوتی ہو۔ آخر
 میں غالباً تین ہزار سال پہلے لوہا استعمال ہونے لگا جو پہلے پہل کوئلے کی آگ
 پر پگھلایا جاتا تھا۔ دُور دراز مقامات پر رہنے والے لوگوں کے درمیان سونا،
 عنبر اور سخت قسم کے پتھروں کے تبادلوں میں ایک ابتدائی قسم کی تجارت وجود
 میں آئی۔ اس زمانے کے یورپ میں جدید حجری عہد کے بہت سے لوگ جھیلیوں
 کے کنارے نہایت محنت سے ستون پر بنائی ہوئی قیام گاہوں میں رہا کرتے
 تھے۔ جھیلی گاہوں میں رہنے والے لوگوں نے اس طریقے پر وحشی دزدوں اور
 دشمنوں اور قبیلوں کے حملوں سے اپنی حفاظت کا انتظام کیا تھا۔

بنی نوع انسان کی نسلیں | قدیم حجری عہد کے انسان زمین پر دوڑ
دوڑ تک پھیل گئے تھے۔ ان کی باقیات

اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تقریباً ہر جگہ ایک خاص سطح تک
ہی ترقی کی تھی۔ لیکن جدید حجری عہد کے یہ انسان ان سے بالکل مختلف تھے۔
تمام دنیا میں ہم ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے والی مختلف نسلوں
میں منقسم پاتے ہیں۔ ان کی ہر نسل اپنی مخصوص جسمانی خصوصیات (جلد کا
رنگ، سر کی ساخت اور بالوں کی طبعی حالت) ایک خاص معیار تمدن
اور اپنی زبانوں کا ایک خاص گروہ رکھتی تھی۔

شمال مشرقی یورپ اور شمال مغربی ایشیا میں شمالی قفقازی نسل یا
نسلیں پھیل گئیں۔ یہ سفید فام انسانوں پر مشتمل تھیں اور جنگلوں اور میدانوں
میں خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتی تھیں۔ یہ جو زبانیں بولتی تھیں، وہ آریائی
زبانیں کہلاتی ہیں۔

امریکہ اور مشرقی ایشیا غالباً اس وقت آپس میں ملے ہوئے تھے۔ ان
میں زرد فام منگول نسل آباد ہو گئی۔ یہ نسل ایک مخصوص اور نمایاں خاندان
کی زبان بولتی تھی۔ افریقہ اور منطقہ حارہ کے دوسرے ملکوں میں ایک سیاہ
فام نسل پھیل گئی جس کو جشی نسل کہا جاتا ہے۔ اس نسل کی زبانیں مختلف
تھیں۔

لے غالباً اس وقت شمال مغربی ایشیا جنوبی ایشیا سے ایک بڑے درمیانی بحیرے کے
حائل ہونے کی وجہ سے جدا تھا۔ اس کے آثار اب بھی بحر اسود، بحر خزر اور بحر ارل
میں پائے جاتے ہیں۔ ۲۵ آریائی گروہ میں سنکرت، یونانی، لاطینی اور بہت سی زندہ
یورپی زبانیں شامل ہیں۔

شمالی قفقازیوں اور حبشیوں کے درمیان جنوبی قفقازی (یا بحر روم کی) نسل آباد تھی۔ اس نسل کے لوگوں کا رنگ گندم گوں، بال سیاہ اور زبانیں مختلف تھیں۔ ان کی زبانوں میں سامی گروہ کی زبانوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ جنوبی قفقازی نسل دور دور تک پھیل گئی۔ ہندستان کے ڈراوڑی باشندے غالباً یہیں سے نکلے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ بحر الکاہل کے جزائر کے راستے وسطی اور جنوبی امریکہ پہنچے ہوں اور اس کے بعد دنیا میں چاروں طرف پھیل گئے ہوں۔

ان بڑے بڑے گروہوں کے علاوہ دوسری نسلیں اور دوسرے خاندانوں کی زبانیں بھی تھیں، مگر نسلوں اور زبانوں کی تقسیم کا پورا مضمون بہت پیچیدہ اور قیاسی ہے۔

آریا | ہمیں اس بات کا پوری طرح یقین ہے کہ تاریخ کی ابتدا پر شمالی قفقازی یا آریا نسل جنوبی قفقازی نسل کی وجہ سے مغربی اور جنوبی سمتوں میں تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ یہ شمالی قفقازی یا آریا نسل زبانوں کی تقسیم پر آسانی کے لحاظ سے آریا کہلاتی ہے لیکن یہ غلط ہے۔ مغرب میں بڑھنے والے آریا کلٹ کہلاتے تھے۔ یہ مفتوحہ آبادی کو انگلستان، فرانس اور جزیرہ نما اسپین کے انتہائی مغربی جانب ڈھکیلتے ہوئے آخر کار خود بھی بحر ظلمات تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، آریا قبیلے مختلف ناموں کے ساتھ اطالیہ، یونان، ایران اور ہندستان میں گھس گئے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنا گھریلو اسباب ایسی گاڑیوں پر لا کر آئے جو بیلوں سے کھینچی جاتی تھیں۔ مویشی کی بڑی قدر و قیمت تھی اور یہی دولت کی خاص نشانی سمجھی جاتی تھی۔ جب یہ پھیلے ہوئے آریا بڑے بڑے چرے دریاؤں یا سمندروں کے

ساحلوں پر پہنچے تو انھوں نے اپنے لیے کشتیاں بنائیں اور ان کے ذریعے انھیں پار کیا۔ یہ اپنے رہنے کے لیے لکڑی کے مکان تیار کرتے تھے اور اپنے مردوں کو جلا دیا کرتے تھے۔ ہزار ہا سال پہلے کی خانہ بدوشانہ زندگی کی طرح ابتدا میں ان کی گزر بسر مویشی پر ہوتی تھی۔ مگر جب بعد میں یہ مغرب اور جنوب میں اپنے نئے وطنوں میں مقیم ہو گئے تو انھوں نے زراعت شروع کر دی اور بیلوں سے ہل جوتے کا کام لینا شروع کیا۔ یہ وہی ہیں تھے جو باد یہ پیائی میں ان کی گاڑیاں کھینچا کرتے تھے۔ یہ جہاں بھی گئے اپنے ساتھ اپنے گیت لیتے گئے۔ یہ گیت صدیوں تک ان کے تہواروں اور مذہبی رسموں کے موقعوں پر گائے جاتے رہے۔ اس طرح شمال مغرب میں ساگا، یونان میں رزمیہ داتانیس، ایران میں زندوستان اور ہندستان میں ویدک اشوک وجود میں آئے۔ اس طرح آریا اپنے ساتھ ادب، تاریخ اور فلسفے کے بیج لے آئے۔ اگرچہ اب تک تحریر کا طریقہ ایجاد نہیں ہوا تھا، تاہم ہر چیز زبانی ایک دوسرے تک پہنچتی رہی۔ انھیں نوعمر مذہبی پیشوایا شاعر احتیاط کے ساتھ حفظ کر لیتے تھے۔ یہ قدیم آریا الگ الگ کنہوں میں منقسم نہیں تھے، بلکہ بڑے بڑے مشترکہ خاندانوں میں رہا کرتے تھے۔ بعض وقت یہ خاندان سینکڑوں افراد پر مشتمل ہوتے تھے۔ ایسے بہت سے خاندانوں کو ملا کر قبیلے بنائے گئے تھے اور ہر قبیلہ اپنے سردار کا مطیع و فرماں بردار ہوتا تھا۔ اکثر یہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ اپنے نئے وطنوں میں آباد ہوتے ہی ان آریاؤں کا ہر قبیلہ اپنے حصہ ملک پر قابض ہو گیا، اور اس کے مختلف خاندان گائوں میں بس گئے۔

خانہ بدوش [شمالی اور مشرقی یورپ، اور مغربی وسط ایشیا جہاں سے آریا

آئے تھے، وہاں اور بھی بہت سے آریا باقی رہ گئے تھے۔ برناتی زمانوں کے بعد کرۂ زمین کا موسم سرد بجا گرم ہوتا جاتا تھا۔ پہلے تو سرد اور بخر میدان تھے، جیسے کہ اب بھی سیریا میں موجد ہیں۔ پھر اس کے بعد شدید بارش کا عہد آیا۔ اور اس سے جنگل اُگ گئے۔ پھر زمین خشک ہونے لگی اور گرمی کا عمل شروع ہوا۔ جنگل رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے اور ان کی جگہ بڑے بڑے سبزہ نواروں نے لے لی۔ یہ بھی روز بہ روز خشک ہوتے گئے اور اس طرح گھاس بھی کم سے کم آگئے لگی۔ ان خطوں میں رہنے والے قبیلوں کا دار۔ مدار صرف مویشی پر تھا اور گھاس کے بغیر انھیں کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ادھر تو وہ آریا جو مغرب اور جنوب میں ترک وطن کر گئے تھے، مغربی اور جنوبی یورپ اور جنوبی ایشیا کی زرخیز اور سیر حاصل زمینوں میں ایک متمدن زندگی اختیار کر رہے تھے۔ ادھر وہ آریا جو پیچھے رہ گئے تھے، اپنے جانوروں کے لیے چارے کی تلاش میں مسلسل باد یہ پیمانی یا باغادہ بدخلہ زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ لوگ چمڑے کے نیچوں یا بعض اوقات بڑی بڑی گاڑیوں میں رہتے تھے۔ ان گاڑیوں کو وہ اپنا اسباب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بہتوں کی گزر بسر تقریباً تمام تر گھوڑیوں کے دودھ پر ہوتی تھی۔ جوں جوں آب و ہوا خشک سے خشک تر ہوتی گئی، خانہ بدوش قبائل کی باد یہ پیمانی بھی زیادہ سے زیادہ وسیع ہوتی گئی۔ اس کے علاوہ جیسے جیسے ان کی اور ان کے مویشیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ رسد بھی گھٹنے لگی حالانکہ تنزل پر زیر رسد کے لیے زیادہ سے زیادہ مانگ تھی۔ یہ تنازع بقاء اور بقا کے اس عمل کی صرف ایک مثال ہو جو آغازِ حیات سے کارفرما ہو۔ ماقبل انسان مؤرخوں کے ارتقا میں ان گنت زمانوں قبل جس طرح پیش آیا تھا، میدانی

قبیلہ غذا کی گھنٹی ہوئی رسد اور بعد میں دشمنوں کے دباؤ کی وجہ سے نئی سمت میں پناہ کی جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔ یہاں مشرقی منگولی قبیلے اپنا بے رحمانہ دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس طرح انھوں نے تاریخ کی رفتار پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہزاروں سال تک ہم شمالی اور مشرقی یورپ اور مغربی وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں میں مغرب اور جنوب کی فتح و تسخیر میں اپنے بھائیوں کی پیروی کرنے کا میلان پاتے ہیں۔

پہلے پہل تو سب حملہ آور آریا تھے مگر کچھ عرصے بعد شمالی مشرقی منگولیوں نے آریاؤں کو پیچھے کی طرف ڈھکیلنا شروع کر دیا۔ یہ منگولی خانہ بدوش ابھی اسباب کی بنا پر آگے بڑھنے پر مجبور ہوئے تھے، جنھوں نے آریاؤں کو بے وطن کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ چین میں ایک زبردست اور متمدن حکومت تشکیل پا چکی تھی۔ اس طرح مختلف وقتوں میں ہن، ترک، منغل اور بہت سے دوسرے منگولی قبیلے آریاؤں کے نقش قدم پر چل کر جنھیں وہ اپنے آگے سے ڈھکیل رہے تھے، مغرب اور جنوب پر حملہ آوروں کی حیثیت سے نمودار ہوتے رہے۔

اس طرح وسط ایشیا کا بخر ہو جانا دنیا کی تاریخ میں ایک زبردست اہمیت رکھنے والا واقعہ تھا۔ اس کے بڑے بڑے میدانوں میں دو نہ ختم ہونے والی جفاکش قوتیں یعنی منگول اور آریا پرورش پاتی تھیں۔ ان کے ٹکڑ بٹن لے دوسرے ملکوں اور ان کی آبادیوں کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔

اب ہم بہت عینری سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ غالباً آریاؤں کی پہلی مرتبہ جنوب اور مغرب میں نقل و حرکت سے بہت

۱۔ تہذیب اور تمدن کے حدود پر آئندہ باب میں بحث کی جائے گی۔

دنوں پہلے جنوبی قفقازی نسل نے بہت سے مختلف خطوں میں اعلیٰ درجے کا تمدن حاصل کر لیا تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آریا ہی وہ پہلے وحشی غارت گرتھے جنہوں نے قدیم تمدن کو برباد کر دیا۔

بنی نوع انسان نے پہلے پہل مصر اور عراق میں حقیقی تہذیب حاصل کی۔ یعنی قوت کی تنظیم کی، دولت جمع کی، علم کو یاد دہان کیا اور فنون میں مہارت پیدا کی۔ ان ملکوں کی بے انتہا زرخیز اور سرسبز و شاداب زمینیں دجلہ، فرات اور نیل سے سیراب ہوتی تھیں۔ یہ زمینیں تھوڑی سی محنت سے ایک کثیر آبادی کی دد امی پرورش کا سامان ہوتا کر سکتی تھیں۔

عراق دجلہ اور فرات کے زریں حصے میں جہاں گہوئیں خود رو اُگتے تھے، دنیا کے پہلے حقیقی شہر وجود میں آئے۔ یہاں نہریں بنائی گئیں اور زراعت کو کافی ترقی دی گئی۔ بڑے بڑے معبد تعمیر کیے گئے، اعلیٰ پیمانے پر آسودگی حاصل کی گئی اور آخر میں ایک بڑی سلطنت پیدا ہوئی جو پورے عراق پر حاوی تھی۔ یہ سلطنت سامری سلطنت کہلاتی ہو اور۔ پانچ اور چھ ہزار سال قبل مسیح کے درمیان کسی زمانے میں موجود تھی۔ غالباً سامری پہلے لوگ تھے جنہوں نے تحریر کو ترقی دی۔ ایک طویل عرصے تک یہ تحریر بہت ہی بھٹی اور بڑے ہلکی سی رہی۔ اس کی ایک اصلاح شدہ صورت وحشی مصور تحریر میں ہیں جو اب تک غیر متقدم قوموں میں پائی جاتی ہیں۔ ان تحریروں میں ایسی چیزوں کی بھٹی تصویریں بنائی جاتی تھیں جن کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس سامری سلطنت کو خانہ بدوش سامری عربوں نے (یہ آریا نہیں تھے) فتح کر دیا۔ یکے بعد دیگرے یہ موج در موج آتے گئے، پہلے حملہ آور عکا دی کہلاتے تھے۔ عکا دیوں کے بعد آشوری اور ان کے بعد کھانی آئے۔ ان حملہ آوروں نے خود

بھی اپنی مستحکم سلطنتیں قائم کیں اور طاقت ور مرکزی حکومت اور بڑی بڑی قوموں کے ذریعے ان کی مداخلت اور توسیع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہو کہ انسانی معاشرے نے بہت بڑی حد تک ترقی کر لی تھی۔ لوگوں نے وسیع ترین جماعتوں میں متحد ہونا سیکھ لیا تھا۔ عراق میں آریاؤں کے پیش روؤں کے نمودار ہونے سے ہزاروں سال پہلے یقیناً خانہ بدوش قبیلوں اور شکاری گردہوں کا دور قطعی طور پر ختم ہو چکا تھا۔ آخر کار مسیحی مہم میں ان آریاؤں (اور ایرانیوں) نے کلدانی حکومت کو تباہ کر دیا اور خود اپنی یعنی ایرانی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ آریاؤں سے پہلے سامری سلطنت کی بنائے لے کر کلدانی سلطنت کے زوال تک تقریباً پانچ ہزار سال کے دوران میں اس سرسبز و شاداب اور آسودہ و خوش حال خطے میں اعلیٰ درجے کا تمدن حاصل کر لیا گیا تھا۔ یونے کا استعمال شروع ہو گیا تھا اور اسے گاڑی کے پیٹوں میں لگایا جاتا تھا۔ دُور، دُور تک تجارت ترقی کر گئی تھی۔ عالی شان محلات اور شہر پیدا ہو چکے تھے۔ ان کی ترین آرایش بہترین مجسموں سے کی گئی تھی۔ ایک حد تک ادب بھی پیدا ہو گیا تھا، اگرچہ بھونڈی طرزِ تحریر اور لکھائی کے سامان کے فقدان کی وجہ سے اس میں بہت سی رکاوٹیں تھیں۔

اس اثنا میں کچھ اسی طرز کا تمدن مصر میں عروج پر تھا۔ اس تمدن مصر کے آثار کے تحفظ میں خشک آب و ہوائے نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ مقبرے اور معابدہ جن میں یہ آثار پائے جاتے ہیں عوامی نیل کے لے سامری رسم خطے ایک بھدھی تہم کے معنوں میں خط سے ترقی پائی تھی۔ پہلے پہل پتھر پر لکھی جاتی تھی، پھر مٹی کی تختیوں پر لکھی جانے لگی۔ اس کے لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ کسی نوک دار آلے سے نرم مٹی پر پہنچی وضع کی سیدھی لکیریں کھینچی جاتی تھیں اس وجہ سے اس گردے سے تعلق رکھنے والے خطوط کو ”سینھی“ کہا جاتا ہے۔

بالائی اور زیریں حصے میں کثیر تعداد میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ نیل وہ عظیم الشان دریا ہے جس کا سالانہ سیلاب مصر میں بارش کے بدل کا کام دیتا ہے اور دونوں کناروں پر کی زمین کی پٹیوں کو غیر معمولی طور پر سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے۔ قدیم ترین مقبروں کی جانچ کرنے سے ایسے لوگوں کا پتا چلتا ہے جو ابھی وحشی ہی تھے۔ اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنے دوستوں کی لاشوں کے بعض حصے کھانے کے عادی تھے۔ لیکن پانچ ہزار سال قبل مسیح کے قریب مصری پتھر سے کام لے رہے تھے، کاشی کا استعمال جانتے تھے اور اسی عہد کے سامریوں سے بالکل مختلف لیکن اتنی ہی اچھی مصور تحریر کا استعمال کر رہے تھے۔

بے انتہا سرسبز و شاداب ہونے کے باوجود مصر اپنے ملک کی سرحدوں پر وسیع ریگستانوں کے واقع ہونے کی وجہ سے دشمنوں کے حملوں سے محفوظ تھا۔ اس طرح اس کی تہذیب بغیر کسی خلل کے ترقی کر سکتی تھی۔ پیائیس کاغذ جو لکھنے کے کام آتا تھا، اس کی بے شمار برکتوں کی وجہ سے اس کی ترقی میں بڑی مدد ملی۔ مصریوں نے مختلف سمتوں میں اور خاص کر نئون لطیفہ اور فن تعمیر میں حیرت انگیز کام پایابی حاصل کی۔ عظیم الشان عمارتیں خصوصاً عبادت گاہیں اور مقبرے تعمیر ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور اور حیرت انگیز جینرہ کے اہرام ہیں جن کا زمانہ ۲۵۰۰ سال قبل مسیح سے بھی پہلے کا ہے۔ عراق کی طرح مصریوں نے بھی ایک بہترین طرز کی مجسمہ سازی کو ترقی دی۔ انھوں نے نہایت چابک دستی سے خوب صورت تصویریں بنائیں۔ یہ ایک مکمل مذہبی نظام رکھتے تھے، جس میں بہت سے دیوتاؤں کی پرستش شامل تھی۔ ان دیوتاؤں میں بعض تباہی معبود تھے اور بعض قدرتی مظاہر (جیسے خدائے شمس) ان میں سے بہتوں کو انسان یا حیوان کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے مختلف علوم

خاص طور پر علم ہیئت میں بڑی ترقی کی تھی۔

مختلف زمانوں میں مصری سلطنت عرب اور عراق کے حملے ہستی رہی اور پھر اس نے انھی سمتوں میں وسعت اور فتوحات حاصل کیں۔ یہ فتوحات مشہور یونانی فاتح سکندر اعظم کے زمانے تک جاری رہیں۔ اس فاتح نے مصر کو زیر کر کے اسے اپنی یونانی سلطنت کا ایک حصہ بنا لیا۔

کریٹ ایک تیسری قسم کے تمدن کو غالباً اسی زمانے میں جب کہ مصر اور عراق کا تمدن عروج پر تھا، بحرِ روم کے جزیرہ کریٹ میں عروج حاصل ہوا۔ یہ سنی آئی تمدن کہلاتا ہے۔ یہ تمدن یونان، اطالیہ اور بحرِ روم کے دوسرے ملکوں میں پھیل گیا۔ تجارتی اور بحری تمدن ہونے کی وجہ سے یہ مصر اور عراق کے تمدنوں سے مختلف تھا، جن کی بنیاد زرخیز و آبائی دادیوں میں رکھی گئی تھی۔ ۳۵۰۰ سال قبل مسیح سے پہلے ہی اہل کریٹ مشاق ملاح اور تاجر تھے۔ اس کے بعد ترقی کے طویل اور پرامن دور میں انھوں نے ایک اخلاقی کاروباری اور فن تعمیر کو نشوونما دی۔ ان کی کوزہ گری، پارچہ بانی، ہمت تراشی، مصوری اور اس کے ساتھ جو اہل ہاتھی دانت اور دھاتوں پر ان کے کام ایسے ہی لائق تحسین ہیں جیسے کہ کسی بھی عہد میں انسان نے انجام دیے۔

گزشتہ چند سالوں کے دوران میں بڑے بڑے محلوں کے بعض کھنڈروں کا پتہ چلا گیا ہے اور احتیاط کے ساتھ ان کی کھدائی کی گئی ہے۔ ان محلوں کو منی آن بادشاہوں اور امیروں نے تعمیر کیا تھا۔ یہ عمارتیں تہایت شان دار، پُر شکوہ، پیچیدہ اور پُر تکلف تھیں۔ ان میں پانی کے نل، حمام اور ایسی ہی

۱۰ یہ نام کریٹ کے روایتی بادشاہ مناس سے لیا گیا ہے۔

بہت سی سہولتیں پیدا کی گئی ہیں۔ آرام و آسائش کے نقطہ نظر سے یہ اتنے قابل تعریف ہیں کہ قدیم دنیا میں یہ باتیں کسی سے ہینا نہ ہو سکیں۔ ... اس سال قبل مسیح سے کچھ پہلے اس کو یہ سلطنت کو حملہ آور آریاؤں نے فتح کر کے بہت بڑی حد تک تباہ و برباد کر دیا۔ یہ حملہ آور یا غالباً ہلینی یا یونانی تھے۔

فنیقی | منی آن حکومت کے پورے زوال سے بہت عرصے پہلے ایک دوسری تجارتی اور بحری قوم نے بحرِ روم کے خطے میں سر بلندی حاصل کر لی تھی۔ یہ فنیقی جنوبی قفقاز کی نسل کی سامی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدا میں یہ عرب سے خانہ بدوش حملہ آوروں کی حیثیت سے آئے تھے اور شام کے ساحل پر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں ان کا سب سے اہم شہر ٹائیبر واقع تھا۔ یہ شہر سمندر پار کی تجارت کا بہت شان دار مرکز بن گیا تھا کیوں کہ فنیقی بہت اچھے ملاح اور تاجر تھے۔ انھوں نے بحرِ روم کے ساحلوں اور جبل الطارق کے پار تک متعدد منڈیاں قائم کی تھیں۔ ان تجارتی منڈیوں میں سے بعض منڈیاں ترقی پا کر اہم ریاستیں بن گئی تھیں۔ ایسی ریاستوں میں قرطاجنہ کی فنیقی نوآبادی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ شہر قبل مسیح میں یہ ایک بڑی بحری سلطنت تھی۔ اس کے جہاز بہت دُور دُور تک ساحلوں اور شمال میں انگلستان تک جاتے اور تجارت کیا کرتے تھے۔ قرطاجنہ ایک بڑا صنعتی مرکز بھی تھا، ان کی صنعت خوب چمکی ہوئی تھی، خصوصاً پارچہ بانی کی صنعت کو یہاں بہت فروغ حاصل ہوا تھا۔ اس نے اسپین میں کانیں کھدوائیں اور افریقہ کے صحرائے اعظم کے پار تک وسطی افریقہ کی وحشی قوموں سے تجارت کی۔

کہا جاتا ہے ایک مرتبہ فنیقی ملاح خلیج سومرز سے شروع کر کے پورے

افریقہ کے گرد گھوم گئے تھے۔ اس قسم کے بحری سفر میں اُن کے تین سال صرف ہوئے۔ اپنی گزران کے لیے وہ ہر سال کسی مقام پر اتر پڑتے تھے، پھر گہروں کی کاشت کرتے اور اس وقت تک ٹھیرے رہتے جب تک کہ فصل پک کر کاٹنے کے قابل نہ ہو جاتی۔ غالباً فنیقی ہندستان اور سیلون سے بھی مستقل طور پر تجارت کیا کرتے تھے۔

حرف تہجی کے ذریعے لکھنے کی بیش بہا ایجاد کے لیے ہم بھی فنیقیوں کے زیر بار منت ہیں، ابتدائی قسم کی تحریروں کی طرح اس میں تحریری علامتیں ایشیا کی تصویریں یا ان کے خاکے نہیں ہوتے تھے، بلکہ یہ تحریری علامتیں معمولی بات چیت کی صوتیات کے مطابق ہوتی تھیں۔

یہودی قوم فنیقیوں کی ایک دوسری رشتے دار قوم تھی۔ اصلاً یہ **یہودی** بھی عرب کے خانہ بدوش تھے۔ یہاں سے انھوں نے پہلے عراق

کو ہجرت کی اور پھر وہاں سے مصر اور آخر میں فلسطین پہنچے۔ ولادت مسیح سے بارہ سو سال پہلے یہ فلسطین میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ یہودی ایک چھوٹی سی قوم پر مشتمل تھے۔ اور شروع ہی سے ان کی جماعت عجیب سی تھی۔ اس قوم کے ہمایہ مصر اور عراق تھے۔ یہ بد نصیب قوم ان دونوں کے بیچ میں راق تھی۔ مصر اور عراق کی عظیم شان سلطنتوں نے اس کو بار بار زیر کیا ہو۔ نویں صدی قبل مسیح میں صرف ایک مختصر زمانے کے لیے یہودیوں کو فوجی قوت اور مادی عظمت ضرور حاصل ہوئی تھی۔ یہ باتیں انھیں داؤد اور سلیمان جیسے دو طاقتور بادشاہوں کے تحت حاصل ہوئی تھیں۔ خرمالی کے اس مختصر زمانے کے بعد یہودی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے اور کچھ زمانے بعد آشوریوں اور کلدانیوں نے انھیں آسانی سے ختم کر دیا۔ لوگ

غلام بنائے گئے اور ان کی بڑی تعداد کو قید کر کے عراق اور اس سے بھی آگے لے گئے۔

جبکہ ہم اس کے بعد دیکھیں گے یہودیوں کا تمدن ان عظیم الشان سلطنتوں کے مقابلے میں کم زور ہونے کے باوجود بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اہمیت ماڈی کارناموں کے لیے نہیں بلکہ ان عظیم اخلاقی اور مذہبی تصورات کے لیے ہے جو اس چھوٹی ٹیسی قوم میں پیدا ہوئے۔ یہ عظمت ان پیغمبرانِ عظام کے لیے ہے جنہوں نے ان تصورات کی تبلیغ کی تھی۔

اسی دوران میں یہاں سے بہت دور ایشیا کی دوسری جانب چین | چین | میں آباد شدہ منگولی قوموں میں ایک دوسری طرز کا تمدن نشوونما پا رہا تھا۔ یہ تمدن جنوبی تھائی قوموں میں نشوونما یافتہ ان تمدنوں سے بالکل مختلف تھا جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔

عراق اور مصر کی طرح چین میں بھی سرسبز و شاداب دریائی وادیوں نے انسان کو وطن پر زندگی کی دعوت دی اور آباد کاروں کو آسودگی اور ترقی کے سامان مہیا کیے۔ ۲۰۰۰ سال قبل مسیح کے قریب ایک زبردست چینی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ کانسی دریافت کر لی گئی تھی اور اس پر نفیس کام کیا جاتا تھا۔ شہ ق۔ م کے قریب لوہا عام ہو گیا اور شہ ق۔ م میں چینی تہذیب اور تنظیم خانہ بدوش منگولی قبیلوں کو سلطنت کی سرحد کے باہر دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کو ایک زبردست مرکزی حکومت اور طاقت و رجحان کی حمایت حاصل تھی۔

اس زمانے سے بہت پہلے ہی سے چینیوں نے ایک مکمل مصور طرزِ تحریر کو ترقی دی تھی۔ اس کو دوام نصیب ہوا اور اب تک بھی یہ نہایت

بھڑکی شکل میں باقی ہے۔ ادب کا بھی کافی وسیع ذخیرہ پیدا ہو گیا تھا، اس کا بیش تر حصہ حسن و خوبی اور حکمت سے مملو ہے۔ بڑی بڑی نہریں اور نفیس عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ سلطنت کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ گئی تھی۔ یہاں ایک مستقبل اور مرقہ الحال سماجی نظام نے ترقی پائی جو اب تک باقی چلا آتا ہے۔ سلطنت جس وسیع ملک پر پھیلی ہوئی تھی اس کا نظم و نسق نہایت باقاعدہ طور پر کیا گیا تھا۔

اس طرح ہم نے اپنی نسل کے عروج کے ایک نہایت ہی مختصر **خاتمہ** سے جائزے کو زندگی کی ابتدا سے شروع کیا۔ اب ہم باقی انسان کے طویل زمانوں کے ارتقا اور قبل تاریخ کی بربریت سے گزر کر اس حد تک پہنچے ہیں، جہاں ایک وسیع تمدن زمین کے دو جدا گانہ علاقوں میں حاصل کیا گیا۔ یہ رقبے عراق، بحیرہ روم اور چین کے علاقے ہیں۔ اس طرح ہم نے اپنے مختصر سے جائزے کو مکمل کر دیا۔

ہم نے دیکھا کہ بنی نوع انسان کی تاریخ کے سب سے طویل دور تاریکی میں چھپے ہوئے ہیں۔ اسی تاریکی میں جہاں ہم انسان کو دھندلے طور پر حیوانوں سے فائقہ نشی اور دشمن قبیلوں سے دائمی طور پر معرکہ آرا دیکھتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ کس طرح ہر فانی زمانوں کے بعد رفتہ رفتہ زمین کی آب و ہوا کے گرم ہونے کے ساتھ ساتھ جدید جھری عہد کے انسان نے واضح طور پر ترقی شروع کر دی۔ کس طرح ان انسانوں کی مختلف نسلوں میں امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ کس طرح شمالی تفتقازی یا آریاں کی زمینوں کے خشک ہو جانے کے بعد جنگلوں اور میدانوں میں بڑھتی ہوئی خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرنے پر آہستہ آہستہ مجبور ہو گئے۔ کس طرح آخر کار وہ بڑی بڑی حملہ آور موجوں کی صورت میں

زیادہ زرخیز ملکوں کو ترک وطن کر گئے۔ یہ وہ ملک تھے جہاں جنوبی تہذیب سے پہلے تہذیب و تمدن کے مختلف مرکوزوں کو بہت بڑی حد تک ترقی دے چکے تھے۔ ہم نے اختصار کے ساتھ قدیم تہذیبوں پر ایک اجمالی نظر ڈالی۔ یہ تہذیبیں پہلے سرسبز و شاداب دریائی وادیوں میں اور اس کے بعد بحیرہ روم کے اطراف جمع ہوئیں۔ یہ تمدن بعد میں ایسی وسیع سلطنتوں کی صورت میں پھیلے جن کی بنیاد یا تو بڑی قوت اور فتح مندی پر یا بحری قوت اور تجارت پر رکھی گئی تھی۔ آخر میں ہم نے نہایت نمایاں چینی تمدن کے مختلف اور انفرادی ارتقاء کا مطالعہ کیا۔

دوسرا باب

تہذیب کا مفہوم۔ ہندستان اور چین

جیسے جیسے ہم بنی نوع انسان کی گزشتہ دو تین ہزار سالہ تہذیب کیا ہے؟ تاریخ کا زیادہ تفصیلی مطالعہ کرتے جاتے ہیں، ہم خاص طور پر ایسے ملکوں میں تمدنی ترقی کا رجحان زیادہ پاتے ہیں جہاں آریا نسل اس سے زیادہ متمدن جنوبی تہذیب سے دوچار ہوئی تھی۔ یہ آریا نسل ابھی تک کم و بیش خانہ بدوشانہ حالت میں ہی تھی۔ اس سلسلے میں چین ایک استثنائی مثال ہے، اور اس کے لیے ایک جگہ گاندھت کی ضرورت ہے، مگر ہم کو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حقیقی تہذیب کی علامتیں کیا ہیں؟

خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ تہذیب اور قدیم بربریت یا محض مادی تمدن میں امتیاز کرنا ہو، یہ اور بھی ضروری ہے۔

انسان نے اپنے ماقبل انسان مؤثر ثلثوں سے بہت سی جبلتیں ورثے میں پائی ہیں۔ یہ جبلتیں اب تک افراد اور جماعتوں کی زندگی اور سرگرمی میں پوشیدہ ہیں، اگرچہ انہیں ان کے اثر کا شعور نہیں۔ ایسی جبلتیں انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ موت سے بچے اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی سعی کرے۔ یہ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ بچوں کی پرورش کے ذریعے نسل کو برقرار رکھے۔ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ہراس چہرہ کی مدافعت کرے جو اس کی یا اس کے بچوں اور دوستوں کی سلامتی کو خطرے میں ڈالے۔ یہ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ باہم مل کر خدا کا قبیلا اور قوم کی صورت اختیار کرے تاکہ بہتر سے بہتر طریقہ پر تحفظ ذات اور آسودگی حاصل ہو سکے۔

اس طرح تہذیب کا عمل ان زبردست قدیم جبلتوں اور ان سے پیدا ہونے والی ساری سرگرمیوں کی آداد، ارادی اور بضامندانہ اطاعت میں مضمر ہے۔ یہ سرگرمیاں وسیع سے وسیع تر انسانی جماعتوں اور آخر کار بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔ اس طرح تہذیب ایک روحانی چیز ہے، جس میں آزاد و اجادی خدمت گواری اور اطاعت پذیری شامل ہے۔ اس کے برخلاف تمدن یکسر مادی اور خود غرضانہ ہو سکتا ہے۔ کثیر دولت، ناقابل مقاوت قوت اور وسیع علم کا مظاہرہ کرنے کے باوجود بھی یہ آزادی اور خدمت گواری ملے جبلتیں ایسے فطری یا موروثی میلانات ہیں جو تمام فکر و عمل کے مبدا اور محرک ہوتی ہیں خواہ یہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، یہ ایسی بنیادیں ہیں جن پر افراد اور قوم کا کردار و زندگی طویل پر تعمیر ہوتا ہے۔ ("سماجی نفسیات" صفحہ ۱۵، مصنف مکڈونلڈ)

کی روح سے عاری ہو سکتا ہے۔ تاہم اس کے باوجود تہذیب، تمدن کا ایک خاص
درجہ حاصل کیے بغیر شکل سے برقرار رہ سکتی ہے۔ تمدن کے بغیر علم اور ذرائع
حمل و نقل حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانیت کی
ہمہ گیر اور فیاضانہ خدمت کے لیے ناگزیر ہیں۔

دردندوں میں یہ جیلٹیں عموماً بے روک ٹوک کام کرتی ہیں۔ شیرانی
ضرورت کے مطابق شرکار کرتا ہے اور اپنے دشمنوں سے دوچار ہونے پر ان کا
مقابلہ کرتا ہے۔ شیرانی امکانی حد تک بچوں کی غور و پرداخت کرتی ہے۔ یہ تنہائی
کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن بہت سے دردندے جیسے بھیڑیے غول بنا کر رہتے
ہیں اور اس طرح اپنی اور اپنے بچوں کی بہتر طریقے پر حفاظت کا سامان مہیا کرتے
ہیں۔ غذا کے لیے انھیں بہتر مواقع ملتے ہیں اور مقابلے کے لیے زیادہ قوت
پیدا کرتے ہیں۔ عموماً ایسے غول کی رہنمائی سب سے زیادہ مضبوط کر لیا کرتا ہے۔
کسی زمانے میں ابتدائی انسان بھی گروہ یا غول کی صورت میں رہتا تھا۔ اس
گروہ کی قیادت ان میں کا سب سے زبردست مرد کیا کرتا تھا۔ اس قسم کی غولی
زندگی بجائے خود بے لگام جبلتوں پر ایک روک ہے۔ یا کم از کم قدیم جبلتیں
زیادہ ترقی یافتہ جبلتوں کی تابع ہو جاتی ہیں۔ شدید بھوک کی اضطراری حالت
میں سوا افراد ایک دوسرے کو مار کر نہیں کھاتے۔ غول میں لڑائیوں اور خاص کر
ایسی لڑائیوں کی نزاع عموماً ہمت افزائی نہیں کرتا جس میں موت واقع ہو۔
وہ اور دوسرے طریقوں سے بھی اپنے ساتھیوں میں ان جبلتوں کے ابھرنے
سے روکتا رہتا ہے۔ غولی زندگی سے ہٹ کر بھی بہت سے دردندوں میں گھریلو
زندگی کی نمایاں ملائشیں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ بچوں کی پرورش میں نر
مادہ کی مدد کیا کرتا ہے۔

بنی نوع انسان کی تاریخ دراصل اس عمل کی تاریخ ہے جس میں بڑے سے بڑے غول یا گروہ بنے اور جس میں مسلسل بڑھنے والی جماعتوں کے مفاد اور جماعتوں کے افراد اور خاندانوں کے مفاد کے درمیان صحیح توازن دریافت کیا گیا۔ حقیقی آزادی تہذیب کا مکمل فہم ہے۔ اس کی ترقی ہی اپنے اعلیٰ مفہوم میں تاریخ کا موضوع بحث بنتی ہے۔ تہذیب وہ حالت ہے جس میں ہر فرد اپنی تمام جبلتوں اور سرگرمیوں کو اراداً خدمتِ خلق کے لیے وقف کر کے ہی مکمل بنی نوع انسان کی بہترین خدمت انجام دے سکتا ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ قدیم قومیں جن کا مختصر سا ذکر ہم کر چکے ہیں، آزادی اور خدمت کے اعلیٰ معیار پر ایک حقیقی تہذیب کی بنیاد رکھنے میں بہت آگے نکل گئی ہوں۔ مصر، کریٹ، عراق، چین اور دوسرے مقامات پر بڑی بڑی انسانی جماعتیں ہزاروں سال سے ایسی زندگی بسر کر رہی تھیں جو تمام تر چرچا میں متحد، آسودہ اور منظم تھی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان قدیم سلطنتوں میں آزادی اور خدمت کے تصورات کو کسی حد تک محسوس ضرور کر لیا گیا تھا۔ بد قسمتی سے یہ قومیں فتنہ تحریروں پر پوری طرح واقف نہ تھیں، اس لیے اس بارے میں ان کی کامیابیوں کے متعلق ہماری معلومات نہایت ناقص ہیں۔ ہم ادھر ادھر سے ان کی حقیقی زندگی کی صرف جھلک ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی مادی

فنونیات یعنی ان کے مقابر، محلات، معابد اور ایسی ہی دوسری چیزیں گو حیرت انگیز ضرور ہیں، تاہم یہ چیزیں حقیقی تہذیب کی طرف ان کی پیش قدمی کا پتا چلانے کے لیے صحیح رہبر کا کام نہیں دے سکتیں، کیوں کہ تمدن کی ایسی علامتیں خارجی اور مادی ہیں۔ اس کے برخلاف جیسا کہ ہم ابھی کو چکے ہیں، تہذیب داخلی اور روحانی چیز ہے اور اس کا انحصار آزادی اور خدمت کے

تصویرات کے ادراک پر ہے۔

بہر حال یہ جماعتیں اور سلطنتیں نسبتاً جدا جدا اور منتشر تھیں۔ ان کی مثال وحشت اور بربریت کے وسیع ریگ زاروں میں نخلتوں کی سی ہے۔ تاریخ کے اس ابتدائی دور میں انسان کے لیے بنی نوع کی خدمت کرنا یا اس کو ہر طور ایک کل کے تصور کرنا بھی ممکن نہ تھا۔

آریاؤں کی آمد اور تحریر کے بہتر طریقوں کی ترقی کے ساتھ **آریا متوطن** ساتھ منظر بدلنے لگتا ہے۔ بنی نوع انسان کی حقیقی تہذیب اور آزادی کی جانب ترقی کا اندازہ لگانا اور یہ معلوم کرنا کہ بڑی بڑی قوموں اور عظیم شخصیتوں نے اس ترقی میں کیا حصہ لیا ہے اب نسبتاً زیادہ آسان ہے۔

حملہ آور آریاؤں نے غالباً لڑائی میں مدافعت کے لیے اپنی پہلی نوآبادیاں بسائیں۔ یہ محض بھدے سے حصار تھے، ان کے اندر خطرے کے وقت قبیلے جمع کیا جاسکتا تھا اور ان کے اطراف وسیع سے وسیع تر پہلے پرزراعت کی جاسکتی تھی۔ اس طرح جہاں زمین زرخیز تھی اور نوآبادی کے اطراف میں گھاس کی بہتات تھی، وہاں آباد کار دیہاتی زندگی نے وسط ایشیا کی خانہ بدوشانہ زندگی کی جگہ لے لی۔

جیسا کہ غولی مہدی میں سب سے زیادہ زبردست زرخول کی قیادت کرتا تھا، اسی طرح قبیلوں کی قیادت قبیلے کے سرداروں نے ہاتھ میں رہتی تھی۔ سردار قبیلے کی اطاعت قبیلے کے صدر اور قبائلی روح کے نمائندے کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ قبیلے کے افراد اس کے اور قبیلے کے لیے لڑ کر خوشی سے جان دے دیتے تھے۔ مگر سردار کسی معنی میں بھی خود مختار بادشاہ نہیں ہوتا تھا۔ غالباً اس کا انتخاب ہوا کرتا تھا، اور اسے بڑی حد تک بڑے بوڑھوں

کی بھدی سی مجلسِ شورٰی پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ یہ مجلس قبیلے میں شامل خاندانوں کے سرداروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ امن اور جنگ ہر زمانے میں وہ انہی لوگوں میں گھرارہتا تھا جو اس کے دوست اور ساتھی ہوتے تھے۔ یہ لوگ اس کے ماتحت نہیں، بلکہ اس کے ہم پایہ اور برابر کے ہوتے تھے۔ اس کی حیثیت ان میں محض سب سے زیادہ بہادر، سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے زیادہ معزز شخص کی سی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ کسی مشورے کی پروا نہ کرے اور اپنے رتبے کو قبیلے میں من مانی حکومت کرنے کے لیے استعمال کرے تو اس کو ضرور معزول کر کے اس کی جگہ کسی دوسرے کو منتخب کر لیا جائے گا۔

یورپ اور ایشیا کی تاریخ میں آریا قبیلوں کے نمودار ہوتے ہی سرداری کا یہ قبائلی نظام بہت نمایاں ہو گیا۔ اس نظام پر خاندانوں کے صدر نگہ رانی رکھا کرتے تھے۔ جب ان لوگوں نے مقیمانہ دیہاتی زندگی اختیار کر لی تو عام طور پر سردار کی قوت میں اضافہ اور توارث کا رجحان پیدا ہوئے لگا۔ اس طرح بہت بڑی حد تک بڑے بوڑھوں کی مجلس کا اقتدار گھٹ گیا۔ بہر حال ان خود ساختہ امیروں نے بڑھتے ہوئے اقتدار کی وجہ سے اپنا آپ نقصان کر لیا۔ یہ اقتدار ان کو عام طور پر آباد کار زندگی سے خود انہی کے ماتحت خاندانوں کے افراد اور مفتوحہ نسلوں کی باقیات پر عطا کیا تھا۔ ایسے لوگ جاگیروں میں رہتے تھے اور یہ جاگیریں سردار کی طرف سے امیروں اور ان کے خاندانوں کو عطا ہوتی تھیں۔

زرخیز ملک میں ایک پُر امن زندگی بادشاہ کے اقتدار کو بڑھانے کا رجحان رکھتی ہو۔ اسی طرح سردار پیدا ہوئے۔ سرداروں کے وجود میں آنے کے خاص طور پر حسب ذیل اسباب ہوئے۔ سب کچھ چھوڑ چھاؤ کر جنگ میں بادشاہ کا ساتھ دینے کے لیے خانہ بدوش سرداروں کی بہ نسبت آسودہ حال کسان بہت

کم آمادہ ہوتے تھے۔ چنانچہ قبیلے اور ملک کی حفاظت کے لیے فوجیں حاصل کرنے کے لیے اہل قبیلہ کو بذاتِ خود لڑنے کے لیے طلب کرنے کی بجائے بادشاہ ان پر ایک محصول مائد کرتا تھا۔ اس محصول سے حاصل شدہ رقم سے وہ سپاہیوں کو نوکر رکھ لیتا تھا۔ یہ کراے کے سپاہی جنھیں بادشاہ کی طرف سے تنخواہ ملتی تھی قبائلی فوج کی بہ نسبت زیادہ مطیع اور زیادہ تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ بادشاہ ان کراے کے سپاہیوں سے نہ صرف قبیلے کے لیے نئے ملک فتح کرنے کا کام لیتا تھا، بلکہ انھیں خود قبیلے میں اپنے اقتدار کو مطلق بنانے میں استعمال کیا کرتا تھا۔ جلد یا بدیر یہ طریقہ عمل تقریباً ان تمام ملکوں میں جاری ہو گیا جہاں حملہ آور آریا مقیم ہو گئے تھے۔

جب حملہ آور آریا غالباً ۱۲۰۰ سال قبل مسیح کے قریب آریا ہندستان میں | ہندستان پہنچے تو یہاں انھیں ڈراوری توہیں ملیں۔ یہ توہیں پہلے سے اچھی طرح آباد تھیں اور توہن میں بہت ترقی کر چکی تھیں۔ یہ ڈراوری غالباً ہزاروں سال قبل اس وقت مغرب سے یہاں آئے تھے جو کہ جنوبی قفقازی نسل مشرق کی طرف دنیا کے اطراف میں پھیل رہی تھی۔ غالباً انھوں نے حبشی قبیلوں کو پہلے سے ہندستان پر قابض پایا ہوگا لیکن یہ پورا موضوع بہت ہی مبہم ہے۔

آریاؤں کا رنگ صاف تھا، جب یہ فاتح کی حیثیت سے اپنے سے زیادہ سیاہ فام ڈراوریوں میں بس گئے تو فاتح اور مفتوح میں رنگ کے اعتبار سے امتیاز کیا جانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ آریا آقا مانے جاتے تھے اور ڈراوڑی زیر ہو کر غلام سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح ان نسلوں میں رنگ کی ایک حدِ قائل پیدا ہو گئی۔

آریاؤں میں جماعتی نظام پہلے ہی سے پیدا ہو چکا تھا۔ ان میں یہ رواج پڑ گیا تھا کہ قبیلے کے لیے ہر شخص ایک خاص خدمت انجام دیا کرے۔ یہ خدمت حاکم کی حیثیت سے انجام دے یا امیر کی حیثیت سے مذہبی پیشوائی کرے، یا کھیتی باڑی یا گائے بانی، بہر حال خدمت ہر ایک کی متعین کر دی گئی تھی۔ لڑکپن اور پُر امن زندگی کے ساتھ ساتھ ان خدمتوں میں توارث کا رجحان پیدا ہو گیا۔ بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا جانشین ہو کر بادشاہ بننے لگا اور امیر کا بیٹا امیر بن جاتا تھا۔ ان لوگوں کا تعلق چھتری طبقے سے تھا۔ مذہبی پیشوا کا بیٹا مذہبی پیشوا ہو جاتا تھا اور اس طرح ہر جنموں کا طبقہ وجود میں آیا۔ کسان کا بیٹا کسان ہی رہتا تھا اس طرح یہ عام لوگ ویش طبقے سے متعلق ہو گئے۔ رنگ کے اس امتیاز کے تحت مفتوح ڈراوڑی اور نا طبقہ بن گئے۔ ان میں ہر شخص کا رجحان ایک مخصوص خدمت انجام دینے کی طرف تھا۔ یہی موروثی ذاتیں بن گئیں جن کے افراد اپنے باپ کا پیشہ اختیار کر لیتے تھے۔ ان سب کو ملا کر شدر کہا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ذات بندی کا یہ پورا نظام مذہب کی منظوری سے ایک وسیع فرقہ بند تنظیم کی صورت میں مستحکم کر دیا گیا۔ اس تنظیم میں ہر فرقے کی درمیانی حد کو اس طرح واضح اور قطعی کر دیا گیا جیسے اصلی سفید فام آزاد آریاؤں اور سیاہ فام غلام ڈراوڑیوں میں کیا گیا تھا۔ اس امتیاز رنگ کے نام پر پورے نظام کا نام رکھا گیا کیوں کہ ہندستان کے خارج آریاؤں کی زبان سنسکرت میں رنگ کے لیے جو لفظ ہر وہ "ذات" کے معنی بھی دیتا ہے۔

گو ذات بندی کے اس نظام نے اپنے آپ میں اس خدمت کے تصور کو جو فرد جماعت کے لیے انجام دیتا ہو محسوس کر لیا تھا، پھر بھی یہ نظام خدمت کو اختیاری اور آزاد بنانے میں ناکام رہا۔ اس نے انسان، انسان کے درمیان

سخت حدود قائم کر دیے اور ہندستان کی کثیر آبادی کے حق میں دائمی دولت و غنائی کا فتوا صادر کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ نظام پورے ملک کے طویل و عرض اور راست جنوب میں ملک کی آخری حد تک پھیل گیا۔

گوتم بُدھ غالباً سب سے زیادہ عظیم الشان ہستی جس نے ہندستان میں جنم لیا وہ گوتم بُدھ کی شخصیت تھی (پیدائش قریباً ۵۵۰ ق۔ م) یہ ساکیا قبیلے کے ایک سردار کے بیٹے تھے۔ یہ قبیلہ شمالی ہندستان میں آباد ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ سنہ عیسوی کی ابتداء سے کوئی پان سو سال پہلے ہی وفات پا چکے تھے، لیکن ان کو اپنے ذاتی تصورات میں حقیقی آزادی اور حقیقی تہذیب کی یافت ہو چکی تھی۔ انھوں نے خود اپنے آپ کو اور اپنی ہر اس جز کو جو ان کے قبضے میں تھی، اپنی مرضی اور اختیار سے بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انھیں ایسے ذریعوں کی تلاش تھی جن سے بنی نوع انسان کی زندگی تکلیف اور مصیبت سے نجات پا جائے۔ ان کی کوشش تھی کہ یہ ذرائع تمام ذاتوں، قبیلوں اور نسلوں کو ایک عہد اتحاد میں منسلک کر کے آپس میں ملا دیں۔ یہ ذریعہ نجات اور عہد اتحاد انھوں نے احسان اور نفس کشی کی نئی بشارت میں پایا۔ اسی عقیدے کی انھوں نے تلقین کی ہے۔ جن ”حقائقِ جلیلہ“ کا انھوں نے اعلان کیا، ان میں سے دو یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

”تکلیف اور مصیبت کی حقیقتِ جلیلہ“ یہ ایک خواہش ہے جو اپنے آپ کو لذت اور جذبات میں شامل کرتی اور ہر وجود میں مسرت محسوس کر کے دوسرا جہم لینے کی محرک ہوتی ہے۔ یہ ایک خواہش ہر حسی لذت کے لیے، خواہش ہر بقاء و دوام کے لیے، خواہش ہر ماضی وجود کے لیے۔

”مصیبت اور ابتلا کے استیصال کی حقیقتِ جلیلہ“ یہ اس خواہش کا پوری

طرح دینا، معطل ہو جانا، ایک سپردگی، ایک بے اثری، ایک علیحدگی اور ایک بے تعلق کا نام ہو۔^۱

خواہش کو مطیع کرنے کے عقیدے اور اس کے ساتھ ہر مخلوق کے ساتھ رحم و مہربانی کی تعلیم نے انسان میں تمام دنیا کی خدمت کے لیے جبلت کو اپنی مرضی سے مطیع کرنے کا تصور پیدا کیا۔

گو تم بدھ کی ہمہ گیر تعلیمات پر ایمان لانا گویا فرقہ بندی کی ان حدوں

ذات پات کے خلاف بغاوت

کے خلاف احتجاج کرنا تھا۔ یہ حدیں وہ تھیں جو انسان انسان کے درمیان قائم کی گئی تھیں۔ اس اعتبار کے علاوہ اور اعتبارات سے ہندستان کی صحیح تاریخ ان عظیم تصورات کی تاریخ ہو جن کی ہندستان کے عظیم ترین فرزندوں نے تعلیم دی ہو، کیوں کہ ہندستان نے دنیا پر جو گہرا اثر ڈالا ہو، وہ ایک سیاسی اور عملی کارثر نہیں بلکہ روحانی اثر ہو۔ گو ذات پات کی قید اب بھی باقی ہو اور اب بھی اس نے ہندستان کی کثیر آبادی کو سینکڑوں الگ الگ جماعتوں میں تقسیم کر رکھا ہو، تاہم صدیوں سے یہاں ایسے عظیم المرتبت ہادیوں کا سلسلہ بندھا رہا ہو جنہوں نے بتایا کہ خدا کی نظر میں تمام انسان برابر برابر ہیں۔ ان ہی ہادیوں نے فرقہ بندی کی بجائے ایک وسیع کل کے ساتھ وفاداری کے تصور کو زندہ رکھا ہو۔

خود ہمارے زمانے میں ذات پات کے خلاف ہندستان میں بغاوت ہمیشہ سے کہیں زیادہ ہو۔ اب یہ بغاوت اتنی وسیع ہو گئی ہو کہ اس نے سماجی حلقے میں بھی ذات پات کے خلاف جنگ کر کے کو اپنے دائرہ عمل

میں داخل کر لیا ہے۔ اس کا اظہار ایسی کوششوں سے ہوتا ہے جو مختلف ذاتوں کے افراد کے درمیان ہر قسم کے سماجی تعلقات کو بڑھانے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ اس طرح ہندستان نے گوتم بدھ کی ان **خواہش کے خلاف جنگ** تعلیمات کو جو تمام بنی نوع انسان پر ایک احسانِ عظیم ہیں، کبھی نہیں بھلایا۔ ہندستان نے اس تعلیم کو بھی فراموش نہیں کیا جو مجاہدہ نفس سے متعلق ہے۔ گو اس تعلیم کو گوتم بدھ کے وقت سے لے کر چارے زماں تک ممتاز روحانی رہنماؤں کے ایک طویل سلسلے نے پُر زور طریقے پر سیکڑوں بار دہرایا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ نفس کشی ہی ہندستان کے خاص مکاتیب خیال و ادیان کا اصل اصول رہا ہے۔ انھوں نے واضح سے واضح طور پر بتایا کہ اگر انسان مرتبہ ولایت و نجات حاصل کر لیں تو انھیں چاہیے کہ وہ اپنی ذات کی خدمت اور اپنی خود غرضانہ جبلتوں اور خواہشوں کی تکمیل کو ترک کر دیں۔

تاریخ ہند کے دوسرے مَرخ ہندستان کی روحانی فتوحات اور بعض مخصوص زمانوں کے سیاسی

اتحاد کو چھوڑ کر ہندستان کی تاریخ خانہ جنگیوں اور بیرونی حملوں کی ایک لمبیل یادداشت ہے۔ بعض مخصوص زمانے جن میں اتحاد حاصل رہا، ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر وہ ہیں جو بدھ شہنشاہ اشوک اعظم (۲۷۲-۲۳۱ ق۔ م) اور مسلمان شہنشاہ اکبر اعظم (۱۵۵۶ء-۱۶۰۶ء) کے تحت گزرے ہیں۔ جب ابتدائی آریا حملہ آور ایک محکم اور دائمی سیاسی تنظیم کے ساتھ آباد ہو گئے اور مادری تمدن میں نمایاں حد تک ترقی ہوئی (اس کے ساتھ ساتھ وہ روحانی اکتفا بھی جن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں) تو ایران، یونان اور وسط ایشیا کی طرف

سے آریاؤں کے تنازعہ حملے ہوئے لگے۔ ان کے بعد یوہنشی (ریاکشاں) کے منگولوں اور ہمنوں کے حملے ہوئے۔ یہ مغرب اور جنوب کی طرف سے آریاؤں کا پیچھا کر رہے تھے۔ پھر ان کے بعد فاتح سامی عرب اور ترک افغانستان سے آئے۔ یہ اپنے ساتھ اپنا مذہب اسلام لیتے آئے۔ انھوں نے شمالی اور وسطی ہند میں یکے بعد دیگرے متعدد سلطنتیں قائم کیں۔ پھر ان کے بعد تازہ دم منگولی حملہ آور ترک اور مغل آئے۔ انھوں نے ایک زبردست اور عظیم الشان سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ آخر میں دورِ حاضرہ کے یورپی پہلے پہل تو تجارت کی غرض سے آئے اور بعد میں حکومت پر قابض ہو گئے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ملک میں جو بد نظمی اور انتشار پیدا ہوا وہ بہندراج ایک عظیم الشان برطانوی سلطنت کے عروج کا سبب بن گیا۔

گزشتہ صدی کے دوران میں ہندستان عالم گیر مغربی افکار و خیالات سے متاثر ہوئے لگا۔ اس کے باشندوں نے مغربی طرز کی آزادی شد و بد کے ساتھ طلب کرنی شروع کر دی ہے اور آج برطانوی عہدہ داروں کے ہاتھوں سے اقتداری مجالس قانونی کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہا ہے۔ اگر یہ لوگ جو اس قوت کو استعمال کر رہے ہیں، عہد گزشتہ کے عظیم روحانی تصورات کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں تو اُمید ہے کہ ہندستان دُنیا کے آگے اس سے بھی کہیں آگے اور عظیم الشان آزادی کی ایسی مثالیں پیش کر سکے گا جنہیں دُنیا نے اب تک کبھی نہیں دیکھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں شاعری، بُت تراشی اور سب سے بڑھ کر تعمیر کاری میں ہندستانی اُملا فن کارانہ ترقیوں کا مختصر ذکر کرنا ضروری ہے۔ غالباً دُنیا کی سب سے زیادہ حسین و جمیل عمارت اگرے کا تاج محل ہے۔ اس کو

شہنشاہ شاہ جہاں (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) نے اپنی محبوب ملکہ کے مقبرے کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ سائنس اور ریاضیات میں ہندستان نے قدیم زمانوں ہی سے قابل لحاظ کام کیا ہے۔

چین کی تاریخ مشرق بعید میں چینی تہذیب آریائی حملوں سے خلل انداز ہونے بغیر پھیلتی پھولتی رہی۔ یہ حملہ اور اس قوم کے سوا ہر جگہ قدیم قوموں پر ہتھوڑے کی طرح شدت سے ضربوں پر ضربیں لگا رہے تھے۔ ان قدیم قوموں کا تمدن تمام تمدنوں میں پہلا حقیقی اور مستقل تمدن تھا۔ یہ صحیح ہے کہ چین کے شمال میں دیشی خانہ بدوش رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً سلطنت کے آباد ملکوں پر حملے کیا کرتے تھے۔ ان ہنوں کو دور رکھنے کے لیے تیسری صدی قبل مسیح میں چین کی عظیم دیوار تعمیر کی گئی جو سرحد پر سمندر سے لے کر پہاڑوں کے بلند سلسلے تک چلی گئی ہے۔ لیکن آریاؤں کے برخلاف ہن آباد ہونے کے لیے کبھی نہیں آئے تھے۔ اگرچہ رفتہ رفتہ انھوں نے چینی تہذیب کا سطحی ہلکا رنگ اختیار کر لیا تھا، یہ صرف تباہ و برباد کرنا ہی جانتے تھے۔ آخر کار طاقتور ہان خاندان (تقریباً ۲۰۰ ق۔ م سے ۲۰۰ بعد مسیح تک) کے تحت چین کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ اس نے ہنوں کو سیدھے مغرب کی طرف پیچھے ڈھکیں دیا۔ اس کے بدلے میں ہنوں نے یہاں سے آریاؤں کو یورپ اور جنوب مغربی ایشیا کی طرف ڈھکیں دیا۔ پہلی منگولی نسل جو اس طرح ڈھکیل کر چین سے یورپ میں داخل کی گئی، یوہ شی تھی۔ اس منگولی نسل نے ولادت مسیح سے تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے مشرقی اور مغربی ایشیا کو جڈا کرنے والے عظیم شان سلسلہ کوہ کوپارک کے مغربی ترکستان فتح کر لیا۔ اس کے بعد جو چین کی بڑھتی ہوئی قوت ان حدود سے آگے نکل گئی۔ اس سے پہلے ہن اور منگولی

خانہ بدوش مغرب کی طرف سلسل ہٹائے گئے۔ یہاں تک کہ منگول ارمینیا میں
رومیوں سے دوچار ہوئے۔ ایک زبردست چینی سپہ سالار بحیرہ خزر تک
جا پہنچا تھا، اور کچھ عرصے تک روم اور چین کی سلطنتوں کے درمیان صُرف
سمندر ہی حدِ فاصل تھا مگر اس کے بعد چینی سلطنت میں تنزل اور بد نظمی
پیدا ہو گئی اور چینی اقتدار تیزی سے مشرقی جانب گھٹنے لگا۔

ساتویں صدی عیسوی میں ٹانگ خاندان کے تحت چینی سلطنت
پھر بحیرہ خزر تک وسیع ہو گئی اور ایک طویل عرصے تک متنقل طور پر مستحکم
اور پُر امن رہی۔ اس سلسلے میں ننگ منگ خاندان (جن کے زمانے میں
چین پر خانہ بدوش تاتاریوں کا زبردست حملہ ہوا تھا) خاص طور پر قابلِ ذکر
ہیں اور بڑے نام آور گزرے ہیں۔ آخر الذکر خاندان سترھویں صدی میں
منچوری حملہ آوروں کے ہاتھوں ختم ہو گیا۔ یہ خاندان ہمارے زمانے میں
جمہوریت قائم ہونے تک چین پر حکومت کرتا رہا جو۔

چینی تہذیب کی حدیں | بھونڈی اور شکل چینی طرزِ تحریک و تعلیم کی اشاعت
میں خطرناک طور پر مانع ہوئی۔ اس نے

سیاسی اقتدار کو ایک چھوٹی سی متمدن اور حصولِ علم کے لیے کافی فرصت رکھنے
والی جماعت کے ہاتھوں میں محدود کر دیا۔ تاہم اس تکلیف دہ رکاوٹ کے باوجود
چین والوں نے فنونِ لطیفہ اور علم و حکمت میں حیرت انگیز ترقی کی ہو۔ انھوں
نے نہایت وسیع اور منفعت بخش بیرونی تجارت کی بنیاد رکھی جہاں سی طبخا،
بارود اور چھاپا سب سے پہلے انھوں نے ہی ایجاد کیا ہو۔

ان میں کفو شش نامی ایک پیغمبر چھٹی صدی قبل مسیح میں گزرے ہیں۔
انھوں نے ایک اعلیٰ اور منظم زندگی کی تعلیم دی اور اعلیٰ اور منظم زندگی کی

ضرورتوں اور انسانی تعلقات کی تفصیلات کو آخری حد تک منضبط کرنے کی تلقین کی۔ چینی کردار کے ارتقا میں اس تعلیم نے بہت زبردست حصہ لیا ہے۔ ان بزرگ کے عرصہ دراز بعد بڑھمت چین میں پہنچا اور نہایت وسعت کے ساتھ پھیل گیا۔

چین کا مجرد پڑامن اور بیرونی حلوں سے محفوظ و مامون رہنا ہی اس کے جمود کا باعث ہوا۔ دوسرے ملکوں میں انسان مسلسل لڑائی جھگڑوں کے صدموں اور قوی دست دشمنوں سے کبھی نہ ختم ہونے والی کشاکش کی وجہ سے ترقی کرتے پر عبور ہوا بالکل اس طرح جیسے کہ زمانہ ماقبل انسان میں خود ہماری نسل کی مختلف شکلوں کے ساتھ پیش آچکا ہے، مگر چین میں اس کی زرخیز زمین اس کی مستحکم مرکزی حکومت، اس کے پہاڑ اور ریگستان اور سمندر کے محافظ حصار، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو مشکل ہی سے انسان کو ترقی کرنے پر مائل کر سکتی ہیں۔ ابتدائی زمانے میں انسانی جبلتوں کو ایک بڑی جماعت کی خدمت کے لیے تیار کرنے کے مسئلے کو حل کر لیا گیا تھا، اس لیے ہم کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چین والے ہزاروں برس سے (بعض وقفوں کے ساتھ) ایک ایسی زندگی بسر کرتے آئے ہیں جو کئی اعتبار سے فی الحقیقت جہذب اور امن پسند ہے۔ لیکن چینوں نے جس جماعت کی خدمت کی، اگرچہ وہ خود بہت وسیع، محترم اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن یہ خدمت پوری انسانیت کی خدمت کے مترادف نہیں ہو سکتی۔ رفتہ رفتہ یہ ترقی گوشہ نشینی اور قناعت پسندی میں گم ہوتی گئی۔ اہل چین کی نظر میں وہ لوگ جو ان کی "آسمانی بادشاہت" کے افراد نہیں تھے، بیرونی وحشی یا اجنبی شیطان بن گئے۔ اس اثنا میں ان کا تمدن فرسودہ اور بے کار ہوتا گیا اور ان کی عام زندگی فاسد ہو گئی۔ گزشتہ دو نسلوں کے دوران میں چین

کا دروازہ بڑی مشکلوں کے بعد دُنیا کے لیے کھل سکا ہو۔ اب بجائے اس کے کہ چینی تہذیب صرف ایک چوتھائی بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے وقف رہتی، اس سے پوری انسانیت کی خدمت گزاری کا مطالبہ کیا گیا ہو۔ اس قسم کے مطالبے نے فتنہ و فساد، انتشار، انقلاب اور رنج و اطم پیدا کیا، لیکن اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ چینی رُوح، جس کی پُر امن صنعت و حرفت اور جس کی شدید ضبط نفس نے ماضی میں اتنا کچھ حاصل کیا تھا، وہ ضرور اس قابل ہوگی کہ اپنے آپ کو ان نئے حالات کے لیے موزوں ثابت کرے اور اپنی وفادارانہ و صابر خدمت گزاری کے دامن کو پوری انسانیت کے لیے کشادہ کر دے۔

دُنیا کے لیے چین کی اہمیت اہل چین بڑے صابر، جفاکش اور پُر امن ہیں۔ اتنی زبردست اور بڑی جماعت کے

ساتھ وفادار رہنے کو اصفت بھی بہ درجہ اتم ان میں موجود ہے۔ یہ بڑی جماعت وہ ہے جس سے ان کی مملکت کی تشکیل ہوئی ہو۔ لیکن انسانیت کے لیے ان کی حقیقی اہمیت اس میں نہیں۔ ان کی حقیقی اہمیت ایسی مثال پیش کرتے ہیں کہ، کہ انسان اس پر عمل کر کے اپنی نسل کے مستقبل کے کام آ سکتا ہو۔

ہر چینی اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ خدا اور اس کے اسلاف (یہ اسلاف وہ ہیں جن کے وسیلے سے وہ خدا کی عبادت کرتا ہے) کی طرف سے اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لیے بہ رضا و رغبت اور بے دردی کے ساتھ اپنے آپ کو قربان کر دے۔ اس سے یہ مرکز نہیں سمجھنا چاہیے کہ چینی صرف اپنے ہی خاندان کی خدمت کرتا ہے کیوں کہ کئی اعتبار سے وہ نمونے کا شہری اور محب وطن بھی ہوتا ہے۔ اپنے معاملوں میں وہ ایمان دار اور قابل اعتماد ہوتا ہے۔ وہ کسی

ملہ چینی مملکت کی آبادی چالیس کروڑ کے لگ بھگ ہے۔

ذات پات کی قیدوں کا پابند نہیں کہ اپنے ہم جنسوں سے الگ ہو جائے۔ وہ قانون کا پابند اور اسن پسند ہوتا ہو۔ وہ اپنے عظیم الشان ملک کا احترام اور اس سے محبت کرتا ہو۔ لیکن ان سب باتوں کے علاوہ اس کی آزادانہ اور رضامندانہ خدمت گزاری کی صلاحیت کا مظاہرہ سب سے زیادہ واضح طور پر مستقل یعنی اپنے نفع نفع پسندوں اور آئندہ نسلوں کے ساتھ وابستگی کے سلسلے میں ہوتا ہو۔ اس کا ایمان ہو کہ یہ اس کا فرض ہو کہ خاندان کی پرورش کے لیے وہ اپنے آپ پر فرصت اور آرام کو حرام کرے۔ اس طرز عمل کا عکس اس محبت اور احترام میں نظر آتا ہو جس سے وہ اپنے والدین کے ساتھ پیش آتا ہو۔ والدین ہی نے اس کو زندگی بخشی اور زندگی کی نعمت سے متمتع ہونے کا موقع عطا کیا ہو۔ چینی مذہب اور خاص طور پر بزرگ فیلسوف کنفوشس کی تعلیمات نے اس قوی خاندانی احساس کو اتنا پاک اور مجلا کر دیا ہو کہ وہ دنیا کے متعلق چینی طرز عمل کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے ہو۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہو کہ چین انسانی زندگی کے سافقہ بار آور ہوتا ہو۔ بچے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ آبادی اتنی زیادہ ہو کہ زمین کی زرخیزی، قوم کی انتہائی محنت اور جفاکشی کے باوجود شدید افلاس اسے پیسے ڈالتا ہو۔ لوگوں کی کثیر تعداد ایسی ہو جو ہمیشہ نیم فاقہ کشی میں مبتلا رہتی ہو۔ ذرائع زندگی پر آبادی کا ہجوم رہتا ہو۔ یہاں تک کہ بعض وقت بارش کی قلت لاکھوں کو نذر اجل کر دیتی ہو۔ کہا جاتا ہو کہ چینی قید خانوں کو خوف ناک حالت میں رکھنا پڑتا ہو۔ اور سزائیں وحشیانہ دینی پڑتی ہیں کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو غریب لوگ جرم کا ارتکاب محض اس لیے کرتے لگیں گے کہ قید کر دیے جائے پر وہ قید خانے کے روزینے سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ یہ بھی کہا جاتا ہو کہ موت کی سزا کا

ملزم ایک ایسا بدل پیدا کر سکتا ہو جو اس خیال سے ملزم کی جگہ خوشی سے پھانسی پانے کے لیے تیار ہو جاتا ہو کہ اس کا معاوضہ رقمی صورت میں اس کے خاندان کو ادا کر دیا جائے گا۔ اس سے زیادہ عجیب کوئی قوم نہیں ہو سکتی جس کا فرد اپنے وارثوں کے لیے ذرائع معیشت ہتھ کر کے لیے بخوشی مرنے پر آمادہ ہو جائے۔

چینیوں کے تجارتی انتظامات اس طریقہ کار کی ایک واضح مثال

تصویر پیش کرتے ہیں جس میں لوگوں کے اغراض و مقاصد اور جبلتوں کو آنے والی نسل کی ضرورتوں کے لیے مطبوع کیا گیا ہو۔

"و وسیع چینی صنعتی انتظامات کو تمام تر مذہبی، بیش تر غیر مہر مزدوروں پر مشتمل ہیں اور یہ مزدور کوئی ایک تجارت کرنے والے افراد تک محدود نہیں ہیں۔ صنعتی ادارے اور مزدور میں معاملات طر پاتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے کہ کسی مزدور کا گانو کا ایک نوجوان صنعتی ادارے سے معاملہ کرے کہ وہ چند مقررہ سالوں (عموماً چھ سال) تک کے لیے اس کی مزدوری کا انتظام کرے۔ صنعتی ادارہ اسے یہاں بھیجا چاہتا ہو، وہ چلا جاتا ہو اور جو کام جس وقت کرنا چاہے، اسے انجام دیتا ہو۔ ادارہ اس کے کھانے، کپڑے اور رہنے کا انتظام کرتا ہو۔ اگر بیمار ہو جائے تو بیماریا کے زمانے میں یا اس چھ سال کے دوران میں وہ بے کار رہے تو اس کی گزر بسر کا انتظام بھی ادارہ ہی کے ذمے ہوتا ہو۔ اس پوری مدت میں وہ کوئی اجرت یا انعام نہیں پاتا، مگر چھ سال کے اختتام پر ادارہ اسے اس کے گانو کو بھیج دینے کا ذمے دار ہوتا ہو۔ اقرار کے مطابق رقم اسے یک مشت ادا کر دی جاتی ہو۔ ادارے کے مصارف بھی نمایاں طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ ادھر یہ بھی واضح ہو کہ ایک ایسا شخص جو گھربار سے دُور ہو اور جس کا سہارا دار مدار ادارے پر ہی ہوتا ہو، شستی، کاہلی یا نا اہلیت کا شبہ پیدا کرنے کے خطرے میں مبتلا ہونا گوارا نہیں کر سکتا کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو ادارے کو اس کے معاملے کے کسی جز کو حذف کر دینے کا موقع مل جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ مزدور بڑی

بے جگری اور بے رحمی کے ساتھ اپنے آپ کو کام پر لگاتا ہو۔ عموماً چھو سال کے اختتام تک اس کی طاقت اور صحت دونوں بحال رہتے ہیں اس لیے ادارے کو کسی مزید معاوضے کے لیے اس کی خدمات قبول کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ لیکن جب ایک بار وہ گھر پہنچ جاتا ہو اور اپنی مختصر سی پونجی حاصل کر لیتا ہو تو پھر منظر ہی بدل جاتا ہو۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی بیوی خرید کر لے جاتا ہو اور ایک خاندان کا باپ بن جاتا ہو۔“

ہو سکتا ہو کہ یہ غلامی کی ایک بھیانک تصویر معلوم ہو لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ چینی مزدور اپنی رضامندی سے اس لیے غلام بنتا ہو کہ اپنے بچوں کی جان بچانے کے لیے ذرائع معیشت بہم پہنچائے۔ یہ تمام محنت و مشقت اور معاشی حالات کا یہ سارا درد انگیزہ باوجود ایسی محنت و مشقت کو ضروری بنا دیتا ہو کہ صرف اس لیے پرغوشی برواشت کر لیا جاتا ہو کہ مستقبل کو لقا اور نسل کو استحکام نصیب ہوگا۔

تیسرا باب

عیسائیت اور اسلام

یہودی مذہب | اس سے پہلے ہم چھوٹی سی یہودی قوم کے فلسطین میں قیام اور اس کے عروج کا مختصر جائزہ لے چکے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ وہ مسلسل حملوں کے صدمے سہتی رہی اور مختلف وقتوں میں جلاوطن ہوتی رہی۔ ان مصیبتوں کے دوران میں دو اہم ترقیاں عمل میں آئیں۔ ایک تو یہ کہ یہودیوں میں پیغمبرانِ عظام کا سلسلہ بعثت شروع ہوا جنہوں نے ایک

ہمہ گیر خدا کی عظمت و قدوسیت کا اعلان کیا۔ دوسرے یہ کہ فلسطین میں ایک
نئی انسانی جماعت یعنی قوم کی صورت نے نشو و ارتقا پایا۔

یہودی جس خدا کی عبادت کرتے تھے وہ ابتداءً ان خانہ بدوش لوگوں کا
قبائلی معبود تھا لیکن مصر کی طویل جلا وطنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل
کی تعلیم نے ان میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ان کی نسل کا یہ خدا ان سے بہ طور اپنے
بنی گان خاص کے تقوے کا طالب ہے۔ تقوے سے مراد ایک سلسلہ قوانین کی پابندی
تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ قدیم جلیتوں کا انضباط صرف شخصی جماعتی اور آئے والی
نسلوں کی بہتری کے لیے ہی نہ کیا جائے بلکہ اس لیے بھی کیا جائے کہ خود خدا بندوں
سے طہارت، دیانت، محبت اور دوسرے صفاتِ حسنہ کا طالب ہو۔ چنانچہ

جیسا کہ شریعتِ موسوی میں ظاہر کیا گیا ہے، تقوے سے یہودیوں کے دل میں ایک
شخصی خدا کی اطاعت کا احساس پیدا کرنا تھا۔ بہر حال ایسے تقوے پر ایمان لانے
کے لیے ان کو مناسب طریقوں سے قابل اور مہذب بنایا گیا جس کی ان کو ضرورت
تھی کیوں کہ یہ اپنی خانہ بدوشانہ زندگی کے بعد بہ شکل ابھی قیام پزیر ہوئے تھے۔
کئی صدیوں تک یہودی اس بات پر ایمان رکھتے رہے کہ اس تقوے کا

خدا صرف ان ہی کا خدا ہے اور اطراف و جوانب کے باشندوں اور سلطنتوں سے
ان کی لڑائیوں میں وہ اپنے بند گان خاص کی مدد کرتا ہے۔ ان جنگوں میں ان کی
سلسل شکستیں اور بریادیاں ان کے خدا کی ایسی ناراضگی پر محمول کی گئیں جو اس
کو بھلا دینے اور اس کے حکام کی نافرمانی کا نتیجہ تھیں۔ اس طرح ان کے دل میں
یہ خیال جا گزریں ہو گیا کہ گناہ خدا کی مرضی کی خلاف ورزی کا نام ہے اور یہ خلاف
ورزی لازمی طور پر مبتلا ہے آلام کرتی ہے۔

اس کے بعد متعدد پیغمبر بھی بعد دیگرے مبعوث ہوتے گئے۔ ان پیغمبروں

میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت حضرت عیسیٰؑ تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس خُدا کے
خیر کی نسبت قومی تنگ خیالی کو دور کر کے عالم گیر خدائے خیر کے وسیع و عظیم تصور
کی تبلیغ کی کہ وہ ایک ایسا خُدا ہے جو تمام بنی نوع انسان کی نیکبیری اور اس سے
محبت کرتا ہے اور اپنے قانون کی پابندی سے خوش ہوتا ہے۔ تنہا اس کی مرضی اور
خوشی سے ساری دنیا امن و آشتی اور خیر و برکت حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن یہودی آباد
کے بیش تر حصے نے اس تصور کا ذرا بھی خیر مستقیم نہیں کیا اور نہ کبھی اس کو قبول
کیا کہ ان کا قومی خُدا دوسرے تمام بندوں کا بھی خُدا ہے۔ لیکن یہ تصور صرف پیغمبروں
کی ذات ہی تک محدود رہا بلکہ خود ان میں سے بڑی سے بڑی ہستی میں کچھ نہ کچھ
یہ تنگی خیال باقی رہی اور وہ اس خیال کو دور نہ کر سکے کہ خُدا کے پاس یہودی ایک
مرتبہ خاص پر فائز ہیں۔ اگرچہ وہ تسلیم کرتے تھے کہ یہ مرتبہ ان پر دوسرے بندگان خُدا
کی خدمتِ خاص کا فریضہ بھی عائد کرتا ہے۔

جس غیر یقینی آزادی سے یہودی محفوظ ہو رہے تھے اس کو
یہودی قومیت | پہلے تو آشوریوں نے ۷۲۲ ق۔ م میں پھر کلدانیوں نے
۶۰۵ ق۔ م میں یونانیوں نے سکندر جیسے فاتح عالم کی نیادت میں ایرانی
مملکت اور اس کے ساتھ فلسطین بھی فتح کر لیا۔ سکندر کے جانشین فلسطین پر
دو صاعی سو سال تک قابض رہے اور بسا اوقات ان کی حکومت بدترین اور
ظالمانہ رہی۔

یہودیوں میں اس عہد سے پہلے اور اس عہد کے دوران میں ایک ایسی
چیز نشوونما پانے لگی جو دنیا کے لیے نئی تھی۔ یہ نئی چیز قومیت کی روح کا شعور
تھا۔ فلسطین میں ایک قوم یعنی انسانوں کی ایک جماعت نمودار ہوئی۔ یہ اعتبار
نسل و توارث خود کو باہم منسلک سمجھتی تھی۔ ناس اپنی زبان بولتی تھی اور اپنے

ہی خاص خط آراضی میں بستی تھی۔ تاریخ، حب وطن کے جذبے اور روایات نے اس کو یہ تصور سکھایا کہ وہ اپنی خاص تمدن کی آپ ہی مالک ہو اور تمام دوسری جماعتوں سے یہ علیحدہ جماعت ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہو۔ قومیت ایک ایسی چیز ہو جو زیادہ تر جذبات اور احساسات پر مبنی ہوا کرتی ہو اس لیے یہ اس کی تعریف کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ قومیت کی جو تعریف اوپر کی گئی ہو اس کا ہر فقرہ ایک یا ایک سے زیادہ ایسی قوموں کے لیے غیر صحیح ثابت کیا جاسکتا ہو جنہوں نے امتیازی قومیت کو حاصل کر کے اسے برقرار رکھا ہو۔ لیکن آج کل قومیت کی اصلیت انسانی تعلقات کے دائرے کے اندر جملہ اہم ترین حقائق میں پوشیدہ ہو۔

قوم، توطن اور تمدن کے لحاظ سے قبیلے سے مختلف ہوتی ہو۔ ایک خاص خطے کے توطن کے اعتبار سے وہ ذات یا جماعت سے حریف ہوتی ہو حالانکہ ایک ہی ملک میں بہت سی ذاتیں اور جماعتیں مل جمل کر رہ سکتی ہیں۔ اکثر صورتوں میں قوم ایک ایسی مملکت سے مختلف ہوتی ہو جو کئی قوموں پر مشتمل ہونے کے باوجود بلا تخصیص ایک ہی زبان بولنے پر مجبور ہوتی ہیں اور نسل پیدائش کی رو سے اپنے شہریوں کو علیحدہ سمجھتی ہو۔ قوم افراد کا ایک گروہ ہو جسے اپنی جدا گانہ حیات و بقا کے لیے کافی وسیع ہونا چاہیے۔ قوم کو اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ ہم نے جن امور پر ابھی غور کیا ہو، ان کی وہ پابند رہ سکے۔

تاریخ نے اس نئی چیز یعنی قومیت کی بے پناہ قوت کو ثابت کر دکھایا ہو۔ یہ قومیت وہ ہو جس کی پہلی مثال یہودیوں نے پیش کی تھی۔ تاریخ نے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ قومی احساس سے مراد وفاداری کی تحدید ہو جس کا دامن انسان کا وہ ہونا چاہیے کہ وہ تمام دنیا سے بغل گیر ہونے کے لیے آمادہ ہو سکے جیسا کہ ہم آگے

چل کر دیکھیں گے۔ اس طرح قومیت انسانیت کے لیے مہلک ترین خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔

یہودیوں کی قومی علیحدگی | جب ہم یہودیوں کی رفتار ترقی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس قبائلی حالت سے

قومیت میں تبدیل ہو گئے اس کے صرف دو سبب ہیں۔ پہلا سبب مضبوط مذہبی بندش تھی جس میں وہ متحد ہو گئے۔ اور دوسرا سبب تباہیاں تھیں جو ان پر آئیں۔ ان تباہیوں نے جوش اتحاد کو کم زور کرنے کی بجائے اسے اور مستحکم کر دیا۔ کیوں کہ اپنے خاص بندوں پر خدا کی ناراضگی کی علامت کے ظہور نے ان کی اعلا قوتوں کے ابھارنے کا کام کر دیا۔ یہی اعلا قوتیں یہودیوں کی قومی زندگی کو از سر نو بحال کرنے کا باعث ہوئیں۔ اپنے وقت کے پیغمبر صرف مذہبی معلم ہی نہیں تھے بلکہ اس سے زیادہ بہت کچھ تھے۔ ان میں سے بہت سیاسی قائد بھی تھے۔ عموماً ان کا پیغام خدا کی بندگی ہوتا تھا۔ اس میں اکثر غیر مذہب والوں اور غیر ملکیوں سے شدید ناروا داری بھی شامل ہوتی تھی۔ غیر ملکیوں نے یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے ان سے یہ ناروا داری اور بھی زیادہ زہر آلود ہو گئی۔ اس طرح ان میں نہ صرف جداگانہ قومیت کا قوی اور نمایاں احساس پیدا ہو چلا بلکہ انھیں دوسری قوموں سے نفرت بھی پیدا ہو گئی جس کی بنیاد اس تعین پر تھی کہ یہودیوں کے مذہبی اور سماجی ادارے دوسری تمام قوموں کے مذہبی اور سماجی اداروں پر قطعی برتری اور تفوق رکھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ جیسے زبردست پیغمبر نے اس متعصبانہ قومی تفاخر کے خلاف بے سود احتجاج کیا۔ انجیل کی کتاب یوحنا میں غیر قوموں کے ساتھ یہودیوں کی اس مخصوص روش کے متعلق بہت بڑی طرح تحقیق کا اظہار کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے تعلیم دی تھی کہ یہودیوں کو دوسری قوموں پر اپنے تفوق کی وجہ سے نازاں نہ

ہونا چاہیے بلکہ انھیں اس بات پر نازاں ہونا چاہیے کہ خدا نے خاص طور پر انھیں غیر قوموں کی ادنا خدمت اور ان کے لیے ایثارِ نفس کے لیے مقرر فرمایا ہو۔ مگر عام طور پر اس تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی، اور حضرت عیسیٰ کے زمانے میں یہودیوں کو رومی نسل انسانی کے دشمن تصور کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہودیوں کی تاریخ ایک پُر نخوت اور علیحدگی پسند قومیت کے خطرات اور اس کے آخری انجام کے متعلق ایک خوف ناک نتیجہ ہے۔

دوسری صدی قبل مسیح کے دوران میں یہودی قوم اگرچہ ایک چھوٹی اور کم زور قوم تھی مگر یونانی ظالموں کے خلاف سخت بغاوت کر کے کچھ عرصے کے لیے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ آخر کار رومیوں کی بڑھتی ہوئی منظم اور طاقت ور مملکت نے ان کو کچل کر تباہ کر دیا۔ سنہ ۷۰ء میں اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو پھر حاصل کرنے کے لیے یہودیوں کی شدت پسند سرشت نے ان کو ایک جان توڑ کوشش پر آمادہ کر دیا۔ مگر یہ بغاوت نہایت تیزی اور شدید بے رحمی کے ساتھ دبا دی گئی اور بیت المقدس برباد کر دیا گیا۔ اس وقت سے یہودی اپنے وطن سے نکال دیے گئے اور روز بروز منتشر ہوتے ہوئے مظلوم تاجروں کی جماعت بن کر رہ گئے۔ تاہم دو ہزار سال سے بغیر کسی ملک کے ایک قوم رہنے کے باوجود یہودی اپنے قومی جذبے کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ ایسی شدید مصیبتوں میں جن کی مثال کہیں نہیں ملتی، اس یہودی قومیت کے تحفظ میں سب سے اہم عامل یہودی مذہب رہا ہو۔ ہمارے زمانے میں اس بات کا امکان پیدا ہو چلا ہو کہ فلسطین یہودیوں کا قومی وطن بن جائے۔

قدیم یہودی مذہب سے سیاست و جود میں آئی۔ ہندستان عیسائیت میں گوتم بھدھ فارغ آریازوں کی نسل سے تھے فلسطین میں حضرت

عیسیٰؑ اس نسل کے ایک فرد تھے جو صدیوں سے آریا فالتوں (ایرانی، یونانی اور
 رومی کے بریگیں رہ چکی تھیں لیکن حضرت عیسیٰؑ جس نسل سے تعلق رکھتے تھے، اس نے انھی فالتوں
 کے تحت احساس قومیت کو خوب ترقی دی۔ یہ احساس قومیت اپنی گونفتہ تاریخ، اپنے مذہبی
 اور سماجی اداروں پر نازاں ہونے اور دوسری تمام غیر قوموں سے متعصبانہ علیحدگی
 کا جذبہ تھا۔ ایسے حالات میں توقع کی جاسکتی تھی کہ معلم اعظم ان کا قومی رہنما ہو گا۔
 ایک ہر دل عزیز ہمدرد ہو گا جو اپنے ہم وطنوں کو ان کے فالتوں کے تسلط سے
 نجات دلائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک ایسی توقع تھی جس کے
 خود بہت سے یہودی متوقع تھے۔ متعدد موقعوں پر حضرت عیسیٰؑ کو روم کے خلافت
 بغاوت کرنے کا مشورہ اور موقع دیا گیا۔ مگر انھوں نے نہایت استقلال کے
 ساتھ ان خواہشات عامہ کی تکمیل سے انکار کر دیا۔ اس باب میں ان کی ناکامی
 ان کے ہم وطنوں کے لیے ایک حد تک ان سے بیزارگی کا باعث ہوئی۔ اس
 بیزارگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں نے غداری سے انھیں رومیوں کے حوالے
 کر دیا اور رومیوں کے ہاتھوں پھانسی کے وحشیانہ فعل سے ان کی موت
 واقع ہوئی۔

حضرت عیسیٰؑ نے ایک قومی نجات دہندہ بننے کی
 خدائی بادشاہت بجائے اس عقیدے کی تبلیغ کی جسے انھوں نے
 ”خدائی بادشاہت“ کے نام سے موسوم کیا ہو۔ ان کی قوم کے بڑے بڑے
 پیغمبروں نے خدا کے اس تصور کی تبلیغ کی کہ وہ تمام بنی نوع انسان کا مالک ہو
 اور اپنی تمام مخلوق سے اعمال صالح اور اپنی مشیت کی تعلیم کا خواہاں ہو۔
 اس زبردست تصور پر حضرت عیسیٰؑ نے اپنی تعلیم میں اس قدر اور اضافہ فرمایا
 کہ خدا اپنے بندوں سے مساوی طور پر محبت کرتا ہو، خواہ اس کے بندوں کی

نسل یا ذات کچھ ہی ہو، چاہے ان کی حالت کتنی ہی فلاکت زدہ ہو، خواہ ان کے اخلاق کتنے ہی ذلیل اور مذموم ہوں۔ خود حضرت عیسیٰؑ نے اپنی زندگی فلاکت اور مصیبت میں بسر کی اور ایسے لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے کی عادت ڈالی جنہیں ان کے ہم وطنوں نے یا تو اپنے ملک کے غدار سمجھ کر نکال دیا تھا، یا بے دین، بدنام اور بے مایہ سمجھ کر ان سے نفرت کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ایسے ہی ساتھیوں کا انتخاب فرمایا اور مذہبی و معزز طبقے سے گریز کرنے لگے، کیوں کہ جیسا کہ خود انھوں نے فرمایا، ”طبییب کی ضرورت ایسے لوگوں کو نہیں جو تنہا دست ہیں، بلکہ ایسے لوگوں کو ہر جوبیمار ہیں۔“ وہ جانتے تھے کہ ایسے متردّد اور مردود لوگ ہی ان کی مدد کے سب سے زیادہ محتاج ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ نے تعلیم دی تھی کہ بنی نوع انسان کے تمام تعلقات اس حقیقت غلطی کے مطابق استوار کیے جائیں کہ خدا سب کو چاہتا ہے اور سب سے یکساں محبت کرتا ہے۔ چنانچہ انسانی جمعیت کے اس نئے قانون کی تشریح وہ عام طور پر واضح قصوں سے فرمایا کرتے تھے۔ اپنے نئے قانون کو وہ ”خدا کی بادشاہت“ کہا کرتے تھے۔ خدا کی بادشاہت میں تمام بنی نوع انسان کو اپنے آسمانی باپ کی مرضی کے مطابق بل جمل کر رہنا چاہیے۔ یعنی محبت، آزادی اور ایک دوسرے کی ہر طرح خدمت کرنا اور اپنی ذاتی خواہشوں اور مفادوں کو کل کی بہتری کے لیے کم سے کم کرنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں حضرت عیسیٰؑ نے وہی فرمایا جو ہم نے حقیقی تہذیب کی احساس کی تعریف میں کہا ہے۔ اس تصور کے تحت انھوں نے اپنی زندگی غریبوں اور بیماروں کی آن تحفہ خدمت گزاری میں بسر کی، اور اسی تصور کے حصول میں انھوں نے اپنی جان دی۔ اس طرح انھوں نے اپنے قول و فعل سے جمہوریت، آزادی اور تہذیب کی روحانی بنیادیں رکھیں۔ عیسائی

ہمیشہ اس بات پر ایمان رکھتے آئے ہیں کہ خود خُدا نے یسوع مسیح کی ذات میں جہنم لیا تھا اور یہ کہ مرنے کے بعد مسیح پھر زندہ ہوئے اور دُنیا کو مصیبت سے نجات دلانے کے لیے بیت المقدس میں مصلوب ہوئے۔ دُنیا کو مصیبت سے نجات دلانے سے مراد ایسے نفس کے ظلم سے بچانا ہے جو بے لگام جہالت سے پیدا ہوتا ہے اور جو خدمتِ خلق کے کام نہیں آتا۔

عیسائیت جہاں تک اپنے بانی کے خیالات کے سانچے میں ڈھالی گئی ہے، وہ آزادانہ اور رضامندانہ ایشا ریندر خدمت گزاری کے اصول کی زیادہ سے زیادہ وسعت پر مبنی ہے۔ عیسائیوں نے ایشا ر نفس پہلے تو اس لیے اختیار کیا کہ خود خُدا نے گزشتہ زمانے میں مسیح کے قالب میں انسانیت کے لیے مصیبتیں برداشت کیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰؑ ابھی زندہ ہیں اور انسانیت کی ترقی میں اپنے خادموں کی صورت میں حصہ لے رہے ہیں۔

عیسائیت کی تاریخ | ایک نقطہ نظر سے عیسائیت کی تاریخ ناکامی کی ایک طویل یادداشت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شروع میں عیسائی بُری طرح متاثر ہوئے لیکن حضرت عیسیٰؑ کے بعد تین ہی صدیوں میں یہ عظیم الشان رومی سلطنت کا سرکاری مذہب بن گئی۔ کچھ دنوں کے لیے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس وقت عیسائی کلیسا میں جو خرابیاں موجود تھیں ان کے باوجود حضرت عیسیٰؑ کا نصب العین خُدا کی سلطنت میں عالم گیر برادری کا حصول شاید حقیقت سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اس وقت آریا اور منگولی حملہ آوروں کا ایک تازہ سیلاب آیا اور دنیا پھر ایک بار بربریت اور وحشت کی دلدل میں پھنس گئی۔ ایک ہزار

سال سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد جب یورپ نے تہذیب کے اس
اعلا معیار کو حاصل کرنے کی پھر کوشش کی جو اس نے کبھی رومیوں کی حکومت
میں حاصل کیا تھا تو وہ مہلک طور پر معاہدہ نہ تویتوں میں بٹ گیا۔ یہ اختلافات
آج بھی ہمارے زمانے تک قائم اور برقرار ہیں بلکہ مسلسل خوں ریز جنگوں کی
وجہ سے یہ فیصلج اور زیادہ گہری ہوتی جا رہی ہو۔ عیسائیت ان جنگوں کو روکنے
یا ستھارے تو مومن کو متحد کرنے میں بے بس نظر آتی ہو۔ بربریت کے ہزار سالہ
اختلال کے دوران میں مستحکم و منظم رومی کلیسا نے ان روایات اتحاد کی بنا پر
جو اس نے فنا شدہ رومی سلطنت سے ورثے میں پائی تھیں اور اپنے فاضل
راہبوں کی موجودگی سے یہ بیش بہا خدمت انجام دی کہ علم اور تمدن کے بعض
آثار کو تباہی سے بچا لیا اور رفتہ رفتہ وحشیوں کو تعلیم و تربیت سے مانوس کیا
اور کم از کم سطحی طور پر ایک آعلا اخلاقی اور مذہبی اقتدار کی اطاعت پر آمادہ کیا۔
نیز عالم گیر فلفلی اور خوں ریزی کے طوفان میں ایسے لوگوں کے لیے جانے پناہ
جہتیا کی جو بہتر مستقبل کے لیے خاموشی سے کام کرتے رہیں لیکن گزشتہ پان سو
سال کی عیسائیت کی تاریخ ایک یاس انگیز داستان ہے جس میں وہ نہ صرف
کش مکش اقوام کو روکنے میں ناکام رہی بلکہ خود عیسائی کلیسا کے اندر اختلافات
کو نہ روک سکی اور اس دور کے ابتدائی ایام میں مذہبی خانہ جنگی اور بے رحمانہ
مظالم کا بھی تذکرہ نہ کر سکی۔ انفرادی طور پر ایسے بہت سے وسیع النظر اور
پرجوش عیسائی بھی گزرے ہیں جو ان قومی، نسلی اور جماعتی حدوں کو توڑ کر آگے
بڑھ گئے۔ مگر ایک منظم ادارے کی حیثیت سے کلیسا کا نظام پارہ پارہ ہو چکا تھا
اور اس میں سیکڑوں قومی اور فرقی جماعتیں بن گئی تھیں۔ بین الاقوامی ناانصافی
رقابت اور باہمی جھگڑوں کے روکنے میں اس کی عدم صلاحیت سے ظاہر

ہوتا ہے کہ وہ اپنے بانی کی بتائی ہوئی آزادی اور محبت کی عالم گیر ”خدائی بادشاہت“ کے نصب العین کو حاصل کرنے میں کس بڑی طرح ناکام رہے تھے۔

تاہم آج بھی تصور شاید ہمیشہ سے زیادہ انسانوں میں زندہ اور کارفرما ہو۔ کم زور اور تنزل یافتہ انسانوں کو ابھارنے میں، بیماروں کی خیر گیری اور علاج میں علم، مساوات اور آزادی کے خیالات پھیلانے میں، غلامی کے اسداد اور ادنا انسانی طبقوں کا معیار بلند کرنے میں، اور سب سے بڑھ کر تعیش و غلط کاری کو دعوتِ مقابلہ دینے میں، جسے ”رے عامہ“ کہا جاتا ہے، بہ خدائی بادشاہت جس کے لیے حضرت عیسیٰؑ نے اپنی جان دی، متعدد مختلف سمتوں میں ترقی کر رہی ہو اور انسانوں میں انسانیت کی بے غرض خدمت اور انسانی نفس کے تصورات پیدا کرنے میں سرگرم عمل ہے۔

اس کے علاوہ، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے موجودہ زمانے میں گزشتہ کئی صدیوں کی بہ نسبت اس کی زیادہ توقع ہے کہ خدائی بادشاہت کے تصورات متخارب نسلوں اور قوموں پر بھی موثر عمل کریں گے۔

یہودی سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو جنوبی تہقازی نسل کی **عرب** ایک خاص شاخ ہے۔ یہ دراصل قدیم آشوریوں اور فنیقیوں کی طرح عرب میں خانہ بدوش تھے۔ ایران، یونان، اور روم میں آریا سلطنتیں جن شمالی حملوں کے بعد قائم ہو گئیں، ان سے سینکڑوں سال بعد اور قدیم تہذیبوں کو غارت کر دینے والے آریا اور رنگولی حملے کے ابتدائی سیلاب سے بہت پہلے

لہ ”سامی“ کی اصطلاح ”آریا“ کی اصطلاح ایک نسل یا کئی نسلوں کے مجموعے کو ظاہر کرنے کے بارے میں بالکل صحیح نہیں کیوں کہ حقیقتاً اس کا تعلق زبان سے ہے۔

عرب سے سامی خانہ بدوشوں کا ایک دوسرا زبردست طوفان اٹھا۔ ساتویں صدی عیسوی کے یہ عرب حملہ آور نہ صرف مضبوط اور پرجوش قبائلی وفاداری کے حامل تھے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ وفاداری کے ساتھ ایک نئے مذہب سے وابستہ تھے۔ یہ نیا مذہب اسلام تھا۔ اس صدی کی ابتداء میں عرب میں اسلام کا ظہور ہو چکا تھا جو نتیجہ تھا پیغمبر اعظم حضرت محمدؐ کی تعلیم اور عملی زندگی کا۔ اتحاد اور جوش و خروش کی جو روح اس دین نے عرب فاتحوں میں پھونک دی اس کے اثر سے وہ سو سال کے اندر اہم در مشرق میں ہندستان اور مغرب میں اسپین تک پھیل گئے۔ تاریخ میں یہ لوگ ریگستان اور میدانوں میں بسنے والے وحشیوں کی طاقت کا نہایت ہی غیر معمولی حیرت انگیز نمونہ پیش کرتے ہیں۔ انہی لوگوں نے ثابت کر دکھایا کہ جب کبھی کسی زبردست مقصد سے متاثر ہو کر اٹھتے ہیں تو کوئی سلطنت یا کوئی ادارہ چاہے وہ کتنا ہی قدیم اور کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو ان کی راہ میں حائل ہو کر سرنگوں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حضرت محمدؐ | حضرت محمدؐ (ﷺ) کا نہایت ہی پختہ عقیدہ تھا کہ ایک اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ موجود اور لگا ہوں سے ستور ہو، جو تمام کائنات کا خالق اور تمام مخلوقات کا حاکم ہو۔ آپ نے بت پرستی کو ایک نہایت ہی شرمناک اور نفرت انگیز فعل قرار دیا کہ بندوں میں خدا کی روحانی عظمت کا جو اعلیٰ تصور ہونا چاہیے، بت پرستی اس تصور کی توہین اور تذلیل ہو۔ ابتدائی مسلمانوں کو ان کے ہادی کے اس واضح یقین نے جو انھیں خدا کی قدرت اور عظمت پر تھا، ایسی عسکری رفاقت

۱۔ ”سلم“ کی اصل ”سلا“ سے ہو، جس کے معنی سیر تسلیم خم کرنے کے ہیں۔ اس لیے

سلم وہ ہو جو اسلام لاتا ہو یعنی راضی بہ رضائے الہی ہوتا ہو۔

میں متحہ کر دیا کہ یونان، ایران اور روم جیسے ملکوں کی تہذیب کی فوسودہ خراب باقیات ان کے سیلاب میں خش و خاشاک کی طرح بہ گئیں۔ خدائے واحد کی اطاعت میں تمام مسلمان بالکل متحد اور بھائی بھائی تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لوگو! میرا کہنا سنو، اور غور کرو۔ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے تم سب آپس میں برابر برابر ہو۔ یہ اصول آج بھی بڑی جد تک کار فرما ہے، اور اسلام اپنی بقا کے لیے اسی کامنوں ہے۔

اسلام کا اثر | اس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مذہب نے جو عیقان پیدا کیا وہ ایک ٹھوس اور مسادات و اخوت کی عملی روح تھی۔ اسی نے ان تمام لوگوں کو جو ایک آن دیکھے خدائے قادر مطلق کو ماننے والے ہیں، باہم دگر مروط و متحد کر رکھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلامی اخوت نے بعض وقت دوسرے مذہبوں سے تعصب و تنگ دلی برتی، اور اپنے ہی مذہب کی اشاعت میں قوت سے کام لینے پر مائل رہی، لیکن مسلمانوں نے اسلام کے ماننے والوں کی صفوں کے اندر حقیقی اخوت و مساوات قائم کرنے میں عیسائیوں سے بہت زیادہ کام یابی حاصل کی ہے۔ چین سے لے کر امریکا تک، مسلمانوں کا برادرانہ احساس، خواہ ان کی نسل یا رنگ، زبان یا قومیت یا ذات یا پیشہ کچھ بھی ہو، انسانیت کے لیے ایک املا روحانی تصور پر مبنی عالم گیر برادری کے حصول کے لیے بہت ہی املا نمونہ ہے۔ اگر اسلام اخوت و مساوات کی راہ سے ایسی بہت سی رکاوٹوں کو دور کر دینے میں کام یاب ہوگا، جو دوسرے مذہب میں بہت ہلک ثابت ہو چکی ہیں، تو ایک روز ضرور تمام بنی نوع انسان کو متحد کرنے والی وسیع برادری کا قیام ممکن ہو جائے گا۔

عربوں کی فتوحات | اسلام دُنیا میں آگ کی طرح پھیلا۔ عام طور پر اس تحریک کی ابتدا ۶۲۸ء جون ۱۲ء تبلیغ کی گئی ہے۔ جب کہ حضرت محمد مصطفیٰ اور ان کے ایک وفادار رفیق حضرت ابو بکرؓ نے سے ہجرت فرمائی۔ مکے میں آپ کے خلاف قتل کی سازش کی گئی تھی جب مدینے پہنچے تو آپ کا پُر جوش استقبال کیا گیا۔ دشمنوں نے رستے میں آپ کا تعاقب کیا، اور قریب تھا کہ دونوں گرفتار ہو جاتے۔ اس وقت حضرت ابو بکرؓ نے پکار کر کہا ”ہمارے مقابل لڑنے والے بہت اور ہم صرف دو ہیں۔“ حضرت محمدؐ نے فرمایا ”نہیں، ایسا نہیں ہو اگرچہ ہم دو ہی ہیں، لیکن ہمارے درمیان تیسرا اللہ بھی ہے۔“ مدینے میں اس تحریک نے بہت جلد فروغ پایا۔ خانہ بدوش عرب قبیلے ایک زبردست اور ناقابل شکست قوت میں حیرت انگیز طور پر متحد کر دیے گئے۔ اپنی وفات سے پہلے حضرت محمد مصطفیٰ ایک فتح مندر سلطنت کے مالک ہو چکے تھے۔ اور آپ کی اس حیثیت کو پورے عرب نے تسلیم کر لیا تھا کہ آپ ایک ایسے مذہب کے پیشوا اور صاحب وحی ہیں جو سیدھا سادا تقوا آموز اور رہبانیت سے آزاد ہے۔ ابتدائے اسلام سے لے کر آج تک اسلام میں مذہب اور سیاسیات میں امتیاز نہیں کیا گیا۔ دین کا پیشوا (خلیفہ یا جانشین رسول اللہ) اسلامی مملکت یا سب سے طاقتور اسلامی مملکت کا فرماں روا بھی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید یعنی وہ متبرک کتاب جس کا ایک ایک حرف منزل من اللہ سمجھا جاتا ہے جو اس کا مذہبی قانون اور اس کے ساتھ احادیث اور تفسیروں کا مجموعہ ہے۔ صرف انفرادی اور جماعتی فرائض کا رہنما ہی نہیں بلکہ روزمرہ زندگی اور اسلامی ملکوں کا مجموعہ قوانین نظم و نسق بھی ہے۔ اس طرح اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں اسلامی اخوت نے ایک واحد مذہبی سیاسی اور عسکری اقتدار

اعلا کے تحت فتوحات و حکمرانی کا راستہ دکھایا۔ کوئی تعجب نہیں اگر ایک ایسی قوت جسے اس طرح متحد کیا گیا، اور جس کی ایک مرکز واعد سے اس طرح رہبری کی گئی۔ اکثر ویش تر ناقابلِ مقاومت ثابت ہوئی ہو۔

حضرت محمد صلعم کی وفات کے دو سال بعد خلیفہ اعظم حضرت عمرؓ کے عہد میں عربوں نے یرموک کے مقام پر یونانیوں کو شکست دی۔ تین سال بعد قادیسیہ کی سہ روزہ معرکہ میں انھوں نے سلطنتِ ایران کو زیر و زبر کر دیا۔ ساتویں صدی کے وسط میں وہ مصر و شام، ارمینہ اور ایران کے مالک تھے۔ اس کے بعد پورا جنوبی افریقہ زیر کیا گیا۔ اندلس فتح ہوا، یہاں تک کہ فرانس پر بھی حملہ کیا گیا۔ قسطنطنیہ اس وقت دنیا میں تہذیب کا سب سے بڑا مرکز اور مشرقی رومی سلطنت کا مرکز تھا، یہ بھی ساتویں صدی کے وسط میں تقریباً فتح ہو گیا تھا۔ اگر یہ پوری طرح فتح ہوجاتا تو تمام یورپ کا فتح ہو جانا نہایت قرین قیاس تھا۔ اسی دوران میں یہ فتح مند مذہب اور اقتدار مشرق اور شمال مشرق میں ہندستان اور وسط ایشیا کے راستے چین کی حدوں تک پھیل گیا۔ ۱۷۰۰ء میں خلیفہ ولید کی مملکت کی حدیں کوہِ پری و نیز سے لے کر چین تک وسیع ہو چکی تھیں، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت جلد ساری دنیا دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے والی ہو۔

لیکن چند سال بعد قسطنطنیہ کے شہنشاہ نے اپنے دار السلطنت کے قریب ایک بڑی جنگ میں مسلمانوں کو شکست دی۔ ۶۲۲ء میں چارلس مارٹل نے جو فرانکون کا سردار تھا (فرانک آریا حملہ آور تھے جنھوں نے فرانس میں آباد ہو کر عیسائیت قبول کر لی تھی) انھوں نے تور کے مقام پر عربوں کو شکست دی، اور عیسائی جو ابلی پیش قدمی کا آغاز کیا۔

اس دوران میں اس وسیع اسلامی مملکت کے ٹکڑے ہوئے شروع ہوئے
 رسل و رسائل کے بہترین ذرائع کے فقدان کا یہ قدرتی نتیجہ تھا۔ دُور دست
 علاقے کم و بیش خود مختار ہونے لگے۔ اگرچہ عباسی خلفاء کے عہد میں بغداد میں
 ایک درخشاں تمدن نے نشوونما پایا تھا، لیکن انحطاط کے میلان کو تعیش اور
 اخلاقی تنہزل نے اور ترقی دی جو صدیوں تک سُلطہ رہا۔ آخر کار گیارھویں
 صدی عیسوی میں عربی سلطنت وسط ایشیا اور اس سے آگے کے منگولی
 خانہ بدوش سلجوقی ترکوں کے قبضے میں چلی گئی۔ ان کے بعد ان کے رشتے دار
 ترکی عثمانی قبیلے نے ان کی جگہ لی۔ اس سے بہت پہلے ہی ترکوں نے اسلام
 قبول کر لیا تھا، اور پہلی مرتبہ بغداد فتح کرنے کے بعد سے لے کر وہ حضرت محمد
 صلعم کے دین کے سب سے زیادہ طاقت ور فرد آزا بنے رہے۔

صلیبی محاربات | بیت المقدس کے عیسائی زائروں کے ساتھ عرب ہمیشہ
 رواداری کا سلوک کیا کرتے تھے، اور انھوں نے یورپ
 اور مشرق کے درمیان تجارتی تعلقات کو استوار کیا تھا۔ مگر تندرست سلجوقیوں نے
 بیت المقدس کے زائروں کے ساتھ برابر تاؤ کیا، تاجروں کو لوٹ لیا، اور پھر
 ایک مرتبہ قسطنطنیہ کی یونانی سلطنت کو فتح کر لینے کی دھمکی دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا
 کہ یورپی عیسائی جو پیش تر آریا تھے، منگولی اور سامی مسلمانوں کے خلاف متحد
 ہو گئے۔ چنانچہ جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ جنگیں محاربات
 صلیبی کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ ان جنگوں کو یورپی تمدن کے ارتقا میں
 بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شمال مغربی یورپ کے تندرست امیروں اور وحشی کانوں
 کو اپنے سے کہیں زیادہ مہذب جنوبی قوموں سے سابقہ پڑا۔ بڑا عظم یورپ
 وقتی طور پر ایک بڑے مقصد کے تحت متحد کر لیا گیا تھا کہ مسلمان فاتحوں کو

ہٹا کر انجیل کی ارض مقدس کو پھر ایک بار فتح کر لیا جائے۔ رومی کلیسا کی آواز پر صلیبی ستارہ میں جمع ہونے تھے، اس لیے رومی کلیسا کا اثر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

مہاربات صلیبی وقفے وقفے سے تقریباً دو سو سال تک جاری رہے۔ کئی محاذ سے یہ جنگیں قدیم خانہ بدوشوں کی ہجرت سے ملنے لگی تھیں۔ بلاشبہ اس خانہ بدوشانہ جذبے کا تقدیر اتنے وسیع طور پر تمام جماعتوں اور زمانوں میں پھیلتا گیا کہ ”قوموں کی صلیبی جنگ“ اور ”بچوں کی صلیبی جنگ“ تک کی نوبت آئی۔ اگرچہ ان دونوں کا خاتمہ ایک ہولناک المیہ پر ہوا۔ صلیبی مہاجرین اپنے اصلی مقصد میں خاص طور پر اس لیے ناکام رہے کہ مسلمانوں کے شہنشاہ اعظم سلطان صلاح الدین نے تمام نسلوں کے مسلمانوں کو ان حملہ آوروں کے خلاف متحد کر کے عزم میم کے ساتھ ان کے حملوں کی مقابلت کی، اور سلاطین میں ان سے دوبارہ بیت المقدس فتح کر کے لے لیا۔

پندرھویں صدی عیسوی میں مغرب کی جانب مسلمانوں کی دوسری عظیم لہر شروع ہوئی۔ آخر کار ۱۲۹۱ء میں قسطنطنیہ فتح ہو گیا اور قاتح ترک تمام جنوب مشرقی یورپ میں پھیل گئے۔ سولھویں صدی کی ابتدا اور پندرھویں صدی کے آخر میں ترک وائسا پر بھی حملہ آور ہوئے جو جرمنی کی جنوبی سرحدی چوکی تھا۔ یورپی قوموں میں نا اتفاقی اور رقابت سے یہ ظاہر اس کو ممکن کر دیا تھا کہ مسلمان سائے بڑے عظیم یورپ کو فتح کر لیں۔ لیکن تعیش اور اخلاقی تنزل کے آغاز نے پھر ایک بار اس رباؤ کو ہلکا کر دیا، اور ترکی فتوحات کی موج پھر پیچھے کی طرف لوٹ گئی، یہاں تک کہ خود حالے زمانے میں ترکوں کے قبضے میں صرف قسطنطنیہ اور قبرص کا مشرقی حصہ رہ گیا ہے۔

عربی تہذیب

مختلف نسلوں کے مسلمان چھ صدیوں سے زیادہ عرصے تک ہندوستان کی حکومت پر قابض رہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہاں منگولی مسلمانوں نے ایک نہایت عظیم الشان مغل سلطنت قائم کی تھی۔ انھوں نے دنیا کے آگے ایک مکمل ترین طرزِ تعمیر پیش کیا۔ لیکن اسلامی تہذیب عربوں کے ابتدائی زمانے ہی میں اپنے انتہائی کمال کو پہنچ چکی تھی۔ فلسفہ، تاریخ، علم ہندسہ، سائنس، شاعری اور سب سے بڑھ کر طب کے لیے دنیا عربوں کے احسانِ عظیم سے گراں بار ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ یورپ اپنے پھیلے تہذیب و تمدن کو بھٹلا کر وحشت و بربریت کی ظلمت میں پڑا ہوا تھا، عربوں کا اثر اور تعلیم ان کا بے تعصب حصولِ علم، یہ چیزیں وہ تھیں جو آخر کار یورپ کی عملی نشاۃ ثانیہ کی ابتدا کرنے میں سب اہم عناصر ثابت ہوئیں۔ بصرہ، کوفہ، بغداد، قاہرہ اور قرطبہ اندلس کی جامعہ میں شمالی یورپ سے عیسائی طالب علم آ کر تعلیم پاتے اور استاد بن کر اپنے ملکوں کو واپس جاتے تھے۔

متعدد مشہور عرب عالموں اور حکیموں میں غالباً بخارا (ترکستان) کا ابن سینا (۹۸۰ء - ۱۰۳۷ء) جس نے علمِ طب کو درجہ کمال پر پہنچایا، اور قرطبہ کا ابن رشد (۱۱۲۶ء - ۱۱۹۸ء) جو سب سے زیادہ قابلِ عرب فلسفی تھا، سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ ابن رشد ہی وہ شخص ہے جس نے یورپ کو صحیح تفکر کے تصور سے روشناس کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اس تصور کا اظہار سب سے پہلے یونان نے کیا تھا۔

عرب عالموں نے متعدد علمی جواہر پاروں کو یورپ منتقل کیا ہے۔ یہ جواہر پارے انھیں ہندوستانی ذرائع سے حاصل ہوئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم جبر و مقابلہ اور عوامی اعداد ہیں۔ آخر الذکر ایک بیش قیمت عطیہ ہے۔

کیوں کہ اس وقت تک کے بے تکے رؤمی اعداد کے استعمال سے ریاضی کی رفتار ترقی نہایت مایوس کن تھی۔ عربوں نے کاغذ سازی بھی کی، اور اس طرح آئندہ طباعت اور تعلیم کی اشاعت کے لیے راستہ تیار کر دیا۔

ہمارے زمانے میں اسلام بڑی تیزی سے افریقہ میں پھیل رہا ہے۔ اسلام جہاں کہیں جاتا ہوا اپنے ساتھ تمام مسلمانوں کی عالم گیر برادری کا عقیدہ لے کر جاتا ہے۔ وہ خداے وحدہ لا شریک لہ پر مضبوطی سے ایمان رکھتا ہے۔ وہ تمام ذاتوں، پیشوں، رنگ و نسل اور قومیت کی برباد کن بندشوں کے توڑنے میں نہایت مضبوط ہے اور ان ہی چیزوں نے دوسری قوموں اور مذہبوں میں ہلکے افتراق ڈال رکھا ہے۔ دنیا پر یہی اس کا سب سے بڑا احسان ہے۔

پو تھا باب

یونان

یونان کے آریا حملہ آور | اب ہمیں بہت دُور اُن تاریک دنوں کی طرف لوٹ جانا چاہیے جب کہ پہلے پہل آریا جنوب اور مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ غالباً حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے پندرہ سو سال پہلے یہ آریا شمالی یونان میں داخل ہوئے شروع ہوئے۔ یہ حملہ آور قبیلے اپنے آپ کو ”ہلینی“ کہتے تھے اور ان کی بولی ایک زبان کی مختلف شاخیں تھیں۔ یہ لوگ خوش رنگ تھے اور دوسرے آریاؤں کی طرح اپنے مُردوں

کو جلا یا کرتے تھے۔ چند صدیاں گزرنے کے بعد اہلینیوں نے کریٹ اور بحر اے جین کی عظیم الشان مٹی آن سلطنت اور اس کے ساتھ وہاں کے اعلیٰ ترقی یافتہ تمدن اور بحری قوت کو بھی تباہ کر دیا۔ یہ خود بھی بہت تیزی کے ساتھ مشاق ملاح بن گئے۔ سمندر پار نوآبادیاں قائم کرنے کے جذبہ شوق نے ان میں بڑی ترقی کی۔ انھوں نے بحیرہ اے جین کے تمام جزیروں اور اس کے اطراف کے ساحلوں پر اپنی نوآبادیاں قائم کرنی شروع کر دیں۔ اس کے بعد وہ شمال مشرق میں بحر اسود تک، مغرب میں اطالیہ، سسلی، تنک، اور شمال مغرب میں فرانس، مارسیلز تک آگے بڑھ آئے۔ بحیرہ اسود میں انھوں نے کوسٹیا تک اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ اس طرح بحر روم کے ساحلوں پر ہلینی یعنی یونانی نوآبادیاں پھیل گئیں۔ ہلینیوں کی فتوحات کی پہلی موج کے بعد مقدونیوں اور فریجیوں کی ایک دوسری موج آئی۔ اول الذکر تو یونان کے شمالی اضلاع میں آباد ہو گئے اور آخر الذکر ایشیائے کوچک میں پھیل گئے۔

ہمیں آریاؤں کی ابتدائی زندگی کی ایک روشن تصویر **عہد ہومر کا یونان** ایڈ نامی زبردست نظم میں ملتی ہے۔ اس نظم کو ہومر نامی ایک اندھے شاعر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ نظم ایسے وقت لکھی گئی ہے جب کہ ہلینی فاتحوں نے ابھی ابھی یونان میں آباد ہو کر سمندر پر قبضہ کیا تھا۔ یہ ان قبیلوں کی باہمی جنگ کا حال بیان کرتی ہے جو پہلی حملہ آور فوج اور دوسری فوج کے فریجیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ان میں بعض قبیلوں نے تجارت یا زہرنی یا دونوں اغراض کے لیے اس مقام پر جہاں مشرق سے مغرب کا بڑی راستہ ایشیا سے یورپ میں گزرتے ہوئے بحیرہ روم اور بحر

۱ اسود کے درمیانی بحری راستے کو قطع کرتا ہو، وہاں ٹرائے نامی ایک سخت شہر آباد کر لیا تھا۔ الیڈ کے ساتھ کی نظم اوڈے سی میں غالباً اس وقت کی کہانیاں ہمارے ہاتھ لگتی ہیں جب کہ بحر اسود کی دریافت اور کھوج میں یونانی اپنے ابتدائی بحری سفر کر رہے تھے۔

ان عظیم الشان زمینیہ نظموں میں ہم ابتدائی آریائی معاشرت کا حال دیکھتے ہیں۔ ان میں تین طبقے ہوتے تھے، یعنی امر، عوام اور غلام۔ ہندستان کے برہمنوں کی طرح ان میں حقیقی مذہبی پیشواؤں کا کوئی طبقہ نہ تھا۔ بادشاہ سب سے بڑا امیر ہوتا تھا۔ شاہی حقوق کو سنوارنے کے لیے وہ اپنے ساتھیوں یعنی نقیہ امیروں کا محتاج ہوتا تھا۔ نازک موقعوں پر بادشاہ ان کی رہنمائی اور مشورہ حاصل کرتا تھا۔ اگر وہ نالائق ثابت ہوتا تو معزول کر دیا جاتا تھا۔ اپنے مرتبے کے لحاظ سے وہ امیر عدل اور مذہبی پیشواؤں کا صدر ہوتا تھا۔ عام مجلسوں میں عوام جمع ہو کر بادشاہ کے فیصلوں کی سماعت کرتے تھے۔ ان فیصلوں کو وہ اپنے امیروں کے مشورے سے صادر کرتا تھا۔ اگرچہ ایسی عام مجلس میں ان کے آگے پیش کردہ امور کے متعلق رضامندی یا نارضا مندی کا اظہار کرنے کے سوا وہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے، تاہم ان کی رائے بہت وزنی ہوتی تھی۔ کیوں کہ لڑنے والی جماعت کی بڑی تعداد انھی پر مشتمل ہوتی تھی۔ امیروں اور عوام کے بعد غلاموں کا درجہ تھا۔ یہ غلام یا تولڑائیوں کے قیدی یا ان کی اولاد ہوتے تھے۔ غالباً ان غلاموں کا بڑا حصہ جنوبی تھقازی نسل سے تعلق رکھتا تھا جو مغربی ہندوستان میں ان

۱ یونان میں مذہبی پیشواؤں کا کوئی اصلی طبقہ کبھی نہیں رہا۔ بادشاہ اور امرا ایسے مذہبی فرائض کو زیادہ تر اپنے ہی ہاتھ میں رکھتے تھے۔ جن کو اور مقاموں پر اس قسم کا طبقہ انجام دیتا تھا۔ دور پر بھی یہی صادق آتا ہو۔

کے بانی تھے۔ یونانی امیروں اور ہندوستانی چھتریوں، یونانی عوام اور ہندوستانی ویشیوں اور یونانی غلام طبقہ اور ہندوستانی شودر طبقے میں ہم مماثلت کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

پہلے پہل یونان کے وحشی آریا فاتح کھلے قصبوں میں رہا کرتے تھے۔ ہر ایک قصب چند خاندان پر مشتمل ہوا کرتا تھا، لیکن زیادہ دن گزرے نہیں پائے تھے کہ ان نوواردوں نے اپنے منی آں پیشہ دلوں کی تقلید میں شہروں کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ یہ شہر یونانی تمدن کے گہوارے بن گئے۔ بعض لحاظ سے یہ تمدن دنیا کے موجودہ طرز تمدن سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔

یونانی شہر چھوٹے چھوٹے مقامات تھے۔ ان میں سب سے بڑا اور مشہور ترین شہر ایتھنز تھا۔ ایتھنز اپنی نسلوں یا قبیلوں میں ایک یعنی ایونی یونانیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا لیکن خود ایتھنز کی آبادی اس وقت بھی ڈھائی لاکھ سے آگے نہ بڑھ سکی جب کہ اس کی طاقت انتہائی عروج پر تھی اور اس کی تہذیب کا اقتاب نصف النہار پر تھا۔ اس آبادی میں آدھے کے قریب تو یقیناً غلام ہوں گے۔ دوسرے یونانی شہر بہت چھوٹے تھے۔ یہ ایک دوسرے کی آزادی پر بے انتہا رشک کرتے اور اکثر باہم جنگ و جدل میں مصروف رہتے تھے۔ اگر کسی مصیبت کے وقت جماعتوں یا اتحادیوں کی حیثیت سے متحد بھی ہو جاتے تو عام طور پر ایسے اتحاد ناقابل اعتماد اور عارضی ہوا کرتے تھے۔ علیحدگی پسندی کی روح جس نے بالآخر یونانی آزادی کا خاتمہ کر دیا، زیادہ تر اس حقیقت پر مبنی تھی کہ یونان بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور خطوں میں بٹا ہوا ملک ہو۔ ان اقطاعات کو بلند کوہستانی یا وسیع سمندری گھاٹیوں سے ایک دوسرے سے اس طرح علیحدہ کر دیا

ہو کہ ان میں باہم تعلقات پیدا کرنا بہت مشکل ہو۔
 ان اختلافوں سے پیدا ہونے والے جھگڑوں کے باوجود، بنی نوع انسان کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ یونانیوں کو نشان دار قوائے دماغی کے ساتھ ایسی سرزمین میں بسنے کا اتفاق ہوا جہاں ترقی کے قدرتی اسباب چھوٹی چھوٹی غمختار شہری ریاستوں کی پیدائش کے باعث ہوئے کیوں کہ ایسے میں حقیقی تہذیب یعنی حریت اور خدمت کی روح نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہوتی اور پرورش پاتی ہو۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان چیزوں کے کامل ارتقا کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع دائرہ عمل لازمی طور پر درکار ہوتا ہو۔ شہری ریاست میں لوگ متحدہ مدافعت، تجارت اور دوسرے مقاصد کے لیے باہم مل جل کر پوری جماعت کی بھلائی کی خاطر سرگرمی سے کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تاہم کوئی فرد ناواجبی طور پر مجبور نہیں کیا جاتا، جیسا کہ بڑی ریاستوں میں عموماً ہوتا ہو۔ ایسی صورت میں حقیقی آزادی کے متحدہ تصور کو جڑ پکڑنے اور پھلنے پھولنے کا اتنا موقع ملتا ہو کہ وہ آئندہ پوری دنیا کے لیے قابل تقلید بن کر دُور دُور تک ایک اعلیٰ تہذیب کی تعمیر میں مدد دے سکے۔

غالباً ہندستان کے وسیع میدانوں میں بھی ابتدائی زمانے میں آریائی شہری ریاستیں وجود میں آئی تھیں اور غالباً تمدن و حریت میں کافی بلند رتبے تک پہنچی تھیں۔ لیکن کھلی اور غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے یہ لڑائیوں میں تباہ ہو گئیں، یا ابتدا ہی میں بڑی بڑی سلطنتوں میں جذب ہو گئیں۔ ایسی سلطنتوں کے شدید مرکزی دباؤ نے فرد کے اندر آزادی اور خدمت گزاری کی روح کے نشوونما پانے کو دشوار کر دیا۔

یونانی شہری ریاست کے باشندے اپنے آپ کو ایک مشترک مؤثر

اور بانی کی اولاد اور آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رشتے دار تصور کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنے شہر کے حسن و جمال، شہر کی عبادت گاہوں اور نفیس عمارتوں، اس کے اداروں، اس کی آزادی، اس کے قدیم مشاہیر، اس کے محافظ و پوکی دیوتاؤں اور اس کے گزشتہ مشہور کارناموں پر بڑا فخر کرتے تھے۔ اپنے شہر کے لیے لڑائی میں وہ اپنی جانیں خوشی سے نثار کر دیتے تھے۔ اس کے لیے وہ جیتے، اسی کے لیے کام کرتے اور اسی کے لیے اپنے خاندانوں کی پرورش کرتے تھے۔ اسی طرح ہر ایک یونانی کے تمام محرکات اور اس کی سرگرمیاں نہایت وفاداری کے ساتھ شہر کی خدمت کے لیے وقف رہتی تھیں۔ وہ اپنے جان و دل کے ساتھ شہر کی خدمت کرتا تھا۔ ایٹھنز اور جہوڑی نظام حکومت رکھنے والے دوسرے شہروں میں شہریوں نے اسی جذبہ آزادی کے ساتھ ان کی خدمت کی۔ یہ جذبہ آزادی کئی لحاظ سے آزادی کے اس جذبے سے کہیں تو بڑا تھا جو دورِ حاضرہ کے وسیع ترین دستوروں کے تحت حاصل کیا گیا ہے۔ اس طرح یونانی شہری ریاست اگرچہ چھوٹی ہوتی تھی اور اس کے اغراض و مقاصد اکثر نہایت محدود ہوتے تھے، تاہم وہ حقیقی تہذیب کا گہوارا تھے۔ یہ ریاست ساری دنیا کے لیے اس بات کی مثال تھی کہ کس طرح عملی اداروں اور نہایت اچھی طرح وضع کیے ہوئے قانون کے ذریعے ایسی تہذیب کی نشوونما اور تکمیل ہو سکتی ہے۔

شہری ریاست کی حکومت | شہری ریاستوں کے ارتقا کے ساتھ ہی قدیم بادشاہتیں بیش تر فنا ہو گئیں۔

۱۔ یہ بات یاد رہے کہ ایٹھنز کے باشندوں کا ایک مختصر سا حصہ ہی "شہری" ہوتا تھا اور اسی کو سیاسی حقوق حاصل تھے۔ باقی عورتیں، غیر ملکی، غلام وغیرہ تھے۔

سلطنت کے امیروں کی قوت بادشاہوں سے زیادہ بڑھ گئی اور انھوں نے ایک بیک یا رفتہ رفتہ حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس طرح تقریباً تمام شہروں کو اشرفانی دور حکومت سے گزرنا پڑا۔ ان میں صرف امیر ہی حکومت میں کوئی عہدہ پانے کے مستحق ہوتے تھے۔ لیکن امرا اپنے اقتدار کو خود غرضاً مقاصد میں استعمال کرنے لگے۔ یہ لوگ اپنے نسب، اپنی دولت اور اپنے مرتبے پر حد سے زیادہ مغرور تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ سست کاہل اور عیاش بھی ہوتے گئے۔ انھوں نے ظالمانہ قوانین اور خاص کر ظالمانہ قرضوں کے بوجھ سے غریب شہریوں پر بہت مظالم ڈھائے۔

”غریب طلبہ قوں کے مردانہ نہیں اور بیٹے امیروں کی پوری غلامی میں تھے۔“
..... پیداوار کے چھٹے حصے کے معاوضے میں یہ لوگ امیروں کی زمین کی کاشت کیا کرتے تھے۔ تمام ملک صرف چند لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ اگر کاشت کار زرنگ کی ادائی سے قاصر رہتے تو اپنی اولاد کے ساتھ غلامی کے لیے پکڑ لیے جاتے تھے۔ ان کی ذات قرض دینے والوں کے پاس رہن ہوتی تھی..... لیکن عوام کی حالت کا بدترین اور تلخ ترین جز یہ حقیقت تھی کہ ان عہدوں میں جو دستور کے تحت قائم کیے گئے تھے، ان میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔..... بحیثیت مجموعی کہا جاتا ہے کہ کسی چیز میں بھی ان کا کوئی حصہ یا کوئی دخل نہ تھا۔“

اس طرح اکثر یونانی شہروں میں رفتہ رفتہ ایک دوسرا تیسرا پیدا ہوا۔ امیر خاندانوں کو جبراً یا تدریجی قانون سازی کے ذریعے اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ یہ امیر خاندان وہ تھے جو اکثر صورتوں میں پہلے ہی عیاش پسندی کی بدولت نہایت

درجے کم زور ہو چکے تھے۔ بعض وقت عوام کی بے اطمینانی سے فائدہ اٹھا کر کوئی شخص اٹھ کھڑا ہوتا تھا، اور عوام کی مدد یا کبھی ایسے دولت مندوں کی اعانت سے جن کا تعلق امیر طبقے سے ہوتا تھا، اشرافیہ کو نکال باہر کرتا تھا۔ ایسا شخص جب کام یاب ہو جاتا تو خود اشرافیہ کی جگہ حکومت کرنے لگتا تھا۔ ایسے انفرادی حاکم "مطلق العنان" کہلاتے تھے۔ ان کے دربار اکثر شان دار ہوا کرتے تھے اور یہ فنون لطیفہ، شاعری اور سائنس کے سرپرست ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہو کہ یورپی تمدن بہت کچھ یونانی مطلق العنانوں کا زیر بار منت ہو۔ لیکن ان کی حکومت استبدادی اور خود غرضانہ ہوتی تھی۔ عموماً یہ دوسری ریاستوں کو فتح کر کے بڑی سلطنتیں قائم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اس طرح کے حلوں سے انھوں نے یونانی ذہنیت کو ناخوش کر دیا۔ یونانی ذہنیت تو خود مختار شہری ریاست کی پرورش حامی تھی۔ اس طرح جلد یا بدیر اکثر یونانی ریاستوں میں ایک عام بے اطمینانی نے ایک دوسرا تغیر پیدا کیا۔ عوام اٹھ کھڑے ہوئے، انھوں نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح جمہوریت قائم کر دی۔

ایٹھنز کی جمہوریت | یونانی جمہوریت میں عوام کی حکومت خود عوام ہی کے ذریعے "راست" ہو ا کرتی تھی یعنی شہری عام اسمبلی کے لیے اپنے نمائندوں کا انتخاب نہیں کرتے تھے، جیسا کہ وزیرِ داخلہ کی جمہوریتوں میں ہوا کرتا ہے، بلکہ ہر شہری یہ حق رکھتا تھا کہ خود اسمبلی میں شریک ہو کر اس کے کام میں حصہ لے۔ اس طرح یہ لوگ قوانین بناتے، عہدہ داروں اور مجسٹریٹوں کا انتخاب کرنے اور خارجی تعلقات کا تصفیہ کرنے میں مدد دیا

کہتے تھے۔ ایٹھنر میں ہر شہری کو ریاست کی مجلسِ عاملہ کی رکنیت اور تمام اعلیٰ منکلی اور فوجی عہدوں کا حق حاصل تھا۔ شہریوں کو ایٹھنر کی اسمبلی اور قانونی عدالتوں میں شرکت کا معاوضہ بھی دیا جاتا تھا۔ قانونی عدالتوں میں ان کی نشست ججوں کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایٹھنر اور دوسرے مقاموں میں کچھ عرصہ کے بعد راست جمہوریت پر زوال آتے لگا۔ اس کی جگہ ایسی حکومت لینے لگی جس میں شہریوں کے کابل اور فلاحیت زدہ عناصر حصہ لینے لگے۔ ایسے لوگوں کے پاس کوئی کام نہ ہوتا تھا، اور یہ اسمبلی یا کونسل کی رکنیت یا قانونی عدالتوں کی ججی کے خواہاں ہوتے تھے کیوں کہ ان کا معاوضہ آسانی سے مل جاتا تھا۔ لیکن یہ بعد کا تنزل اور انحطاط تھا کیوں کہ ایٹھنر کی جمہوریت ڈیڑھ سو سال کے دوران میں نہایت طاقت ور اور شان دار رہی۔ اسمبلی میں قومی کام کرنے اور پبلک عہدوں پر فائز ہونے کو ریاست کے بہترین افراد انتہائی اعزاز سمجھتے تھے۔ اس عہد کے دوران میں ایٹھنر نے بحیرت انگریز فضل و کمال کا مظاہرہ کیا۔ ڈرامے میں، مجسمہ سازی میں، فنِ تعمیر میں، فلسفے میں، تاریخ میں، خطابت میں، سیاست میں، یہ عہد آج تک روشنی کے مینار کی طرح درخشاں ہو اور اعلیٰ و مکمل تہذیب کے دشوار گزار راستے میں انسانیت کی رہ نمائی کرتا ہو۔ ایٹھنر نے وقتی طور پر اس مسئلے کو حل کر دیا تھا کہ کس طرح ہر انفرادی شہری کو ایسی صحیح تربیت اور موقع دیا جائے کہ اسے ہر طرف سے اپنی فطرت کو ترقی دینے کا موقع ملے، اور وہ پوری آزادی اور پوری تنہائی کے ساتھ ریاست کی خدمت انجام دے سکے۔ قانون کے آگے ہر ایک شہری مساوی حیثیت رکھتا تھا۔ حکومت کے کاموں میں یہ پوری ذمہ داری قبول کرتا تھا اور ان متحد و شان دار تہواروں اور ڈرامائی تماشوں میں شریک ہو سکتا تھا جبر

کے لیے نادار شہریوں کو مفت اجازت نامے دیے جاتے تھے۔ یہ سب چیزیں پوری جماعت کے لیے تعصبِ تعلیم کا کام دیتی تھیں۔ اس کے علاوہ نہ صرف ایٹھنز کے ہر شہری کو اپنی عمر میں کسی نہ کسی وقت قومی کاموں میں حصہ لینے اور پبلک عہدوں پر فائز ہونے کا موقع ملتا تھا، بلکہ اس کے شہر کی روح اور ادارے اس کو ہمیشہ اکساتے رہتے تھے کہ وہ اپنے اعلیٰ جوہر کو پوری طرح ترقی دے تاکہ وہ اپنی پوری قابلیت اور اہلیت کے ساتھ ایٹھنز کی خدمت انجام دے سکے۔

ایٹھنز کے انتہائی عروج اور شان و شکوہ کے زمانے میں جماعتی فلاح دہیوں کے لیے ذمہ دار، ترقی اور تکمیل ذات کی روایت ایک ایسی چیز کے ساتھ متحد ہو گئی، جس کی یونانی بدرجہ اتم ستائش کرتے تھے۔ یہ پاکیزگی، معقولیت اور خردمندی کی روح تھی جو ایک جماعت کے دوسری جماعت پر ظلم و زیادتی یا جبر میں مانع اور فرقہ وارانہ تلخی میں مزاحم ہوتی تھی۔ پرک لیڑجیسے سیاست کے الفاظ میں جس نے ایٹھنز کی تیس سالہ انتہائی عظمت کے زمانے میں اس کی رہبری کی تھی:

”یہ صحیح ہے کہ ہم ایک جمہوریت کہلاتے ہیں، کیوں کہ ہمارا انتظام حکومت صرف چند کے نہیں بلکہ بہت سوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن جہاں قانون خانگی جھگڑوں میں مساوی اور ایک انصاف کا ضامن ہے، اس کے ساتھ ہی وہاں اس کی خوبی کا دعوا بھی مسلم ہو جاتا ہے۔ جہاں ایک شہری کسی حیثیت سے امتیاز حاصل کر لیتا ہے تو اس کو کسی پبلک خدمت پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ یہ خدمت استحقاق کے طور پر نہیں بلکہ قابلیت کے انعام کے طور پر عطا کی جاتی ہے۔ افلاس بھی کوئی سبب راہ نہیں، ایک شخص خواہ وہ کیسی ہی کم نامی کی حالت میں کیوں نہ ہو، اپنے ملک کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ ہماری پبلک زندگی میں کوئی افتراق نہیں..... ہمارے پبلک کاموں کے ساتھ احترام کی ایک روح وابستہ ہے۔ قانون

اور اقتدار کے احترام نے ہم کو گم راہ ہونے سے بچالیا ہے۔ ہم ان قوانین کا بھی خاص لحاظ رکھتے ہیں، جو اس غرض سے بنائے گئے ہیں کہ ان سے ہم رسیدوں کی حفاظت کی جائے۔ ہم ایسے غیر ملکتوی قوانین کا بھی احترام کرتے ہیں جس کی خلاف ورزی کرنے والا عام طور پر ہدف ملامت بنتا ہے۔“

یہ مہتمم بالشان الفاظ ہم کو ایک اور امر کی طرف متوجہ کرتے ہیں، **قوانین** جس کی وجہ سے تہذیب کے ارتقا میں یونانی اثر سب سے زیادہ اہم رہا ہے۔ ایٹنز کا ہر باشندہ اپنے شہری قوانین کا گہرا احترام کرتا تھا۔ ان قوانین کو وہ ہیئتِ مجموعی نہ صرف دولتِ عامہ کے لیے بلکہ خود اپنی ذاتی آزادی اور آسودگی کے لیے تقریباً مقدس محافظ سمجھتا تھا۔

ایٹنز میں پہلا ملکتوی مجموعہ قانون ساتویں صدی قبل مسیح میں ڈراکو نامی امیر نے مرتب کیا تھا۔ اس مجموعہ قانون کے متعلق مشہور ہے کہ یہ نہایت سخت اور جابرانہ تھا۔ مگر اس کی تفصیلات ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی کی ابتدا میں ایک دوسرا بہت زیادہ اہم مجموعہ قانون، مقننِ اعظم سولن نے مرتب کیا۔ غریب طبقے جس کچل ڈالنے والے قرض کے بوجھ سے عرصہ دراز سے نالہ و فریاد کر رہے تھے، یہ بوجھ ان کے دوش سے ہٹا کیا گیا۔ مدبرانہ معاشی اور سماجی اصلاحات کی گئیں، تاکہ اس بات کا یقین ہو جائے کہ یہ بوجھ ان پر پھر کبھی نہیں ڈالا جائے گا۔ پھر ایک وسیع پیمانے پر اور زیادہ جمہوری طریق حکومت کی طرف قدم اٹھایا گیا۔ عہدے کے لیے نسب کو نہیں بلکہ دولت کو معیار قرار دیا گیا۔ ان سب باتوں سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ تمام شہری ایک اسمبلی کے رکن بنادیے گئے۔ اس اسمبلی کے آگے عہدہ داروں

کو عہدے کی مدت ختم ہونے پر اپنے طرزِ عمل کی جواب دہی کرنی ہوتی تھی اس مجلس میں دوسرے اہم معاملے بھی فیصلے کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔

چھٹی صدی کے آخر میں ایٹھنر کے دستور کو ایک تیسری اہم ترقی دی گئی، یعنی کلمے از تھینر قانون مدون کیا گیا۔ اس ضابطہ قانون نے مکمل اور راست اور جمہوری طرزِ حکومت کو مستحکم کر دیا۔ اس قسم کی حکومت کی پہلے سے داغِ بیل پڑ چکی تھی۔ اس مجموعہ قانون سے اس بات کی ضمانت ہو گئی کہ آئندہ سے ایٹھنر میں کوئی انبیازی ذات یا کوئی جماعت نہ ہوگی، دفتری قسم کا کاروبار نہ ہوگا، پیشہ ور یا سوں کا گروہ نہ ہوگا، بلکہ تمام لوگ مساوی طور پر مملکت کے محذوم اور خادم ہوں گے حقیقی جمہوری حکومت کے لیے احتیاط سے مرتب کیے ہوئے قواعد اور اس کے طریقِ عمل کے تحت ایٹھنر اپنی آزادی اور عظمت کی انتہائی بلندی پر پہنچ گیا۔ اس لیے اہل ایٹھنر کے دلوں کا اس دستور کے احترام سے معمور ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ اسی دستور کے وہ بہت زیادہ مہمنون تھے اور ”قوانین اور اقتدار کے احترام کی بہ دولت غلط کاری سے باز رہتے تھے“۔ پبلک کاموں اور نظم و نسق میں غیر دستوری طرزِ عمل کے روکنے کے مکمل تحفظات مہیا کر دیے گئے تھے۔ قانونِ ایکا اور عدل گسٹری کے مسلسل ذاتی تجربے نے ایٹھنر کے ہر معمولی سمجھ رکھنے والے باشندے کو اپنے محبوب دستور کی حرمت کا تیز نظر اور ہوشیار محافظ بنادیا تھا۔

اس طرح دنیا میں دستوری قانون کا خیال پیدا ہوا۔ ایٹھنر ہی میں لوگوں نے یہ بات سیکھی کہ قانون نہ کوئی شاہی فرمان ہے، نہ کسی امیر یا کسی عہدے دار کا حکم ہے اور نہ کسی بڑے اور روایتی مقنن کی تالیف ہے۔ اس کو پوری جماعت کا ایسا منظرِ تسلیم کرنا چاہیے جو اس جماعت کی آزادی اور مساوات

کے کامل تحفظ کا یقین دلاتا ہو۔ ایجنٹوں میں قانون کا احترام اس لیے کیا جاتا تھا کہ وہ سیاست اور افراد دونوں کی آزادی کی حفاظت کرتا تھا۔ ہر آدمی کو بحیثیت مجموعی پورے شہر کو باغ و فراخ زندہ رہنے اور ایک روشن خیال زندگی بسر کرنے کا موقع عطا کرتا تھا۔

ایرانی حملے | دارالویشل اول (۸۲۱ء - ۹۶۷ء ق۔ م) کے عہد میں ایران کی عظیم الشان مملکت یونان اور یونانی سمندروں کے مشرق سے لے کر دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر خود یونانیوں کے دور کے رشتے دار آریا حکومت کیا کرتے تھے۔ لیکن اس کی غیر معمولی وسعت، اس کا استبدادی طرز حکومت، اور اس کی حاصل کردہ ادنا درجے کی تہذیب غرض ان سب چیزوں نے اسے اور اس کے اداروں کو یونانی کیفیات سے بالکل اجنبی رکھا۔ ایرانی حکومت نے اپنی بڑی بڑی فوجیں اور زبردست بحری بیڑوں پر بھروسہ کیا کہ مغربی سمت سے یونان پر بڑے بڑے حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یونان جیسے غریب چھوٹے اور منقسم ملک کی کامل تباہی مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔ یہ ایرانی پیش قدمی ان ناقابلِ مقاومت نقل و وطن کی مہموں کی ایک کڑی تھی، جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

سب سے پہلے لائی ڈیاں نامی سلطنت فتح کر کے برباد کر دی گئی۔ اس سلطنت پر ایک غیر آریائی جماعت حکومت کرتی تھی۔ اس کا دار الحکومت سارڈس تھا۔ یہ ریاست یونان اور ایران کے درمیان ایک سدا رہ کی طرح حائل تھی۔ اس کے بعد ایشیائے کوچک میں ملی ٹیس جیسے عظیم الشان شہر کی سخت مزاحمت کے باوجود یونانی مطیع کر لیے گئے۔ آخر کار ۹۴۷ء ق۔ م میں دارا کے عہد میں ایرانی فوج چھ سو جہازوں میں سوار ہو کر خاص یونان کی طرف روانہ ہوئی۔

ایتھنز اور اسپارٹا یونان کے اہم ترین شہر تھے۔ ان شہروں کو سفیروں کے ذریعے اطاعت قبول کر لینے کی دعوت دی گئی لیکن انھوں نے سفیروں کو قتل کر کے اس دعوت کا جواب دے دیا۔ اس توہین کا غنی بدلہ لینے کے لیے ایرانی براتھان نامی مقام پر اتر پڑے۔ یہ مقام ایتھنز سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں ایرانیوں نے اپنے آپ کو ایتھنز کی ایک چھوٹی سی فوج کے مقابل پایا۔ اس فوج میں نو ہزار اہل ایتھنز شریک تھے۔ اس غظیم اور یادگار لڑائی میں ایرانیوں کے انہوہ کثیر کو یونانیوں کی شجاعت اور تنظیم نے شکستِ فاش دے دی۔ اس فتح کے نتائج بہت وسیع اور دور رس نکلے۔ ایک چھوٹی سی شہری ریاست کی آزاد جمہوریت نے ایک استبدادی وسیع سلطنت سے مقابلہ کر کے اس پر مکمل فتح پائی تھی۔ اس فتح نے یہ اصول ثابت کر کے دکھایا کہ جس طرح شہری کو اپنے ہی طریقے پر ریاست کی خدمت کے لیے آزاد رہنا چاہیے، اسی طرح پوری ریاست کو بیرونی اقتدار سے آزاد رہنا چاہیے۔ خود مختاری یعنی حکومتِ خود اختیاری کو شہنشاہت کے مقابلے میں پوری پوری فتح حاصل ہوئی۔ دس سال بعد کسری (خشار یا شا) کے عہد میں ایرانیوں نے پھر یونان پر حملہ کیا۔ اب کی بار خشکی اور تیزی دونوں طرف سے حملہ کیا گیا تھا۔ ایک زبردست فوج نے دژدانیال کو عبور کیا۔ ”اس فوج میں بالائی مصر کے حبشی شیر کے چمڑوں میں ملبوس، جنگی رنگ لگائے، کمان، لٹھ، اور تبر سے مسلح شریک تھے۔ آشوری پورے زور سے بکتر سے آرات، ہندستانی تیر انداز روٹی کے لباس میں ملبوس، اہل یبیا چمڑے لپیٹے آگ پر سخت کی ہوئی لکڑی کے واحد ہتھیار کے ساتھ شہنشاہت کی مختصر تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ کسی ریاستوں پر ایک ریاست کی حکومت ہے اور اس کا مقصد ذاتی مفاد اور نام آوری ہے۔“

ساتھ، تھریسی ہرن کے جوتے پہنے اور لوطی کا چڑا سر پر ڈالے، سی تھین جنگی تبر لگائے اور بلوچی گھوڑوں کے سروں پر بنائی ہوئی خود جن پر یاں لہرائی تھی، پہنے ہوئے اس فوج میں شامل تھے۔ ایرانی سپہ سالاروں کے تحت پیتالیس مختلف قوموں پر مشتمل پیدل فوج تھی۔ ان سب کے علاوہ استی ہزار کی ایک طاقت ور سوارہ فوج، اونٹوں کا دستہ اور زخمیں بھی تھیں۔ اگرچہ یہ گمان غالب ہو کہ یونانیوں نے دشمن کی تعداد میں بہت مبالغے سے کام لیا ہوگا، پھر بھی صرف پیدل فوج کی جملہ تعداد میں لاکھ بیان کی گئی ہے۔ ان حملہ آوروں کے انبوہ کثیر کی کمک پر بارہ سوڑے اور تین ہزار چھوٹے جہازوں کا بحری بیڑہ تھا۔ اس بیڑے کے ہر جہاز پر دو، دو سو سے زیادہ آدمی سوار تھے۔

یونانیوں نے سات ہزار آدمیوں کے ساتھ دیر پائانی لی کے تنگ درے پر اس زبردست اور بوقلموں لشکر کا جم کر مقابلہ کیا۔ یہ درہ سمندر اور پہاڑ کے درمیان بین یونان خاص کے مقام داخلہ پر واقع ہے۔ یہاں ایک دوسری دائمی یادگار لڑائی لڑی گئی۔ اس لڑائی میں لے دینڈاس اور اس کی چھوٹی سی فوج نے ایرانیوں کو ایک ہفتے تک روکے رکھا، یہاں تک کہ اس کے پیچھے یونانیوں نے منظم طور پر مدافعت کا انتظام کر لیا۔ ایرانیوں نے جب پہاڑ کے اطراف درے کے عقب میں راستہ نکال لیا تو تین سو سپاری بعض حلیوں کے ساتھ ان کے مقابلے پر ڈٹ گئے اور سپاہیوں سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ لڑتے لڑتے ان کا آخری آدمی تک مارا گیا۔ اس طرح ان لوگوں نے غیر فانی شہرت حاصل کر لی۔ ان کا یہ ایشار اکارت نہ گیا۔ یقیناً ایرانی یونان میں آگے بڑھ آئے تھے، مگر ان کی ہمت پست ہو چکی تھی۔ اس دور ان میں یونانی فوجیں

جمع ہو گئیں، اور تین سو اہل اسپارٹا کی بہادرانہ مثال سے ان کے دل بڑھ گئے تھے۔ یونانیوں نے جن میں بیش تر اہل ایٹھنز شامل تھے، ایرانی بیڑے کا مقابلہ کیا اور خود کسریٰ کی آنکھوں کے سامنے سلاس کے مقام پر اسے شکست دے دی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی بحری لڑائی تھی جو تنظیم اور ملاحی میں تفوق کے ذریعے جیتی گئی۔ خود ایٹھنز کو پہلے ہی سے جلادیا گیا تھا، لیکن ایرانیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کیا گیا، اور آخر کار ان کی فوج پلیٹیا کے مقام پر تباہ کر دی گئی۔

اس کے بعد یونان پر کسی ایرانی حملے کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔ چھوٹی، مفلس اور منقسم ہونے کے باوجود آزاد یونانی ریاستوں نے ایک زبردست اور ظالم حریف کی گرفت سے اپنی گلوغلصاں کر لی۔ یہ دشمن وہ تھا جس کے پاس ان گنت فوجیں اور وسیع ذرائع موجود تھے۔ ایسا کر کے انھوں نے اجنبی شہنشاہ کے مقابلے میں خود مختاری کی مثال قائم کر دی۔

غالباً سب سے بڑا آدمی جو یونان — یعنی وہ ملک جس کی تہذیب بعض سقراط لحاظ سے دنیا کی اعلیٰ ترین تہذیب تھی — کے بے بڑے شہر ایٹھنز میں پیدا ہوا۔ وہ سقراط (۴۷۰ ق م تا ۳۹۹ ق م) نامی ایک غریب اور بد قطع بت تراش تھا۔ تقریباً اپنے تمام ہم شہریوں کی طرح وہ بھی پبلک عہدوں پر فائز نہ رہا، اور غیر معمولی طور پر کردار کی مضبوطی اور آزاد روی دکھلائی۔ ان سے ہٹ کر اس نے اپنی زندگی حقیقی صداقت اور خیر کی جستجو کے لیے وقف کر دی۔ مقبول عام مشاہیر اور عام متبادل آرا پر کھلی تنقید کر کے اس نے بہتوں کو اپنا دشمن بنالیا۔ اس نے اپنے شاگردوں کی ایک جماعت بھی تیار کی تھی۔ اس جماعت میں سقراط کے قابل ذکر مفکر اعظم افلاطون بھی تھا۔

بنی نوع انسان کو جس شخص نے پہلی مرتبہ واضح اور باقاعدہ طور پر فکر کرنا سکھایا، وہ استاد یا شاگرد دونوں میں کوئی ایک ہے۔

لیکن سقراط کی انتہائی عظمت کا راز اس کی موت میں پوشیدہ ہے۔ اس کے بعض دشمنوں نے اس پر بد اخلاقی اور بے دینی کی تعلیم دینے کا الزام لگا کر اسے سزا دلائی۔ اس کی بے گناہی بالکل واضح تھی، اور ممکن تھا کہ وہ ان متعدد ناجائز طریقوں میں سے کسی ایک کو کام میں لاتا جو اس زمانے میں بالکل عام تھے، تو سزا سے بچ جاتا۔ مثلاً ججوں کی خوشامد یا قید خانے کے محافظ کو رشوت دینا۔ لیکن اس نے اپنی خودداری اور اخلاقی استواری کی بنا پر ایسی کسی حرکت کے ارتکاب سے قطعی انکار کر دیا۔ اپنے مقدمے کے سلسلے میں اس نے صرف اپنی بے گناہی کا اظہار کیا، اور اس بات پر اصرار کیا کہ جس بات کو وہ حق سمجھتا تھا، اس کے اعلان اور اس کی تلقین کا اسے حق حاصل ہونا چاہیے۔ اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ انسانی احکام کی اطاعت کے بجائے خدائی آواز پر لبیک کہنا چاہیے، چاہے یہ احکام خود ان کے محبوب شہر ایٹھنز کے شہری قانون سازوں ہی کے نافذ کردہ کیوں نہ ہوں۔ ایٹھنز کے پان سو ایک ججوں کے سامنے اس نے جو سیدھا سادا اور پُر مغز جواب دیا وہ یہ تھا:

"اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہر شخص کو خواہ وہ کسی درجے کا ہو، موت و حیات کے موقعوں کو پیش نظر رکھ کر کام کرنا چاہیے، یا کسی کام کو کرتے وقت صحت یا غلطی کے امکان، یا ایک بھلے یا بُرے آدمی کی طرح کام کرنے کے سوا کسی اور بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے، تو آپ نے بڑی غلطی کی..... ۱۰۔ اہل ایٹھنز! مجھ کو تمھارا بے حد پاس و لحاظ ہو، اور مجھے تم سے بے حد محبت ہو۔ لیکن میں خدا کی اطاعت کو تمھاری اطاعت پر ترجیح دیتا ہوں۔ اور جب

تک میرے دم میں دم اور میرے جسم میں قوت ہو، میں تلاشِ حق سے اور حق کو تم پر واضح کرنے سے کبھی باز نہیں رہوں گا۔ تم میں سے جس کسی سے بھی ملوں گا، اپنی عادت کے مطابق اس سے کہوں گا، "میرے محترم دوست! تم ایٹھنٹر کے شہری ہو، جو ایک بہت ہی عظیم الشان شہر ہو، اور اپنی دانائی اور قوت ذہنی کے لیے مشہور ہو۔ کیا تمہیں دولت جمع کرنے اور شہرت و اعزاز حاصل کرنے کی اس درجہ فکر سے شرم نہیں آتی؟ کیا تم کو دانائی، صداقت، اور تہذیبِ نفس کا کچھ بھی خیال اور فکر نہیں؟..... دنیا میں ایسا کوئی آدمی نہیں جو مجھ کو موت کے ڈر سے بُرائی کرنے پر آمادہ کر سکے، مگر میں بُرائی پر آمادہ ہونے سے پہلے فوراً مرجانا بہتر سمجھتا ہوں۔"

موت کا فیصلہ سنایا گیا تو سقراط نے کہا:

"نیک آدمی کا کچھ بگڑ نہیں سکتا، نہ زندگی میں نہ مرنے کے بعد۔"

ضمیر کی آزادی | سقراط نے اہل ایٹھنٹر کے ہاتھوں اس شان سے اپنی جان دی کیوں کہ ایٹھنٹر کی انتہائی عظمت کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اس طرح سقراط نے دنیا کے آگے اپنے ملک کی کم و بیش اسی قسم کی مثالوں سے کہیں زیادہ قابلِ قدر مثال پیش کی۔ سقراط نے فکر کی آزادی، تقریر اور عمل کی آزادی پر اپنی جان قربان کر دی۔ اپنے ضمیر کے مطابق سوچنے، بولنے اور عمل کرنے کا ہر شخص کا حق عین حق اور اس کا فرض ہو۔ اس نے آزادیِ ضمیر کے لیے جان دی۔ جس صداقت کے لیے اپنی جان دی، اسے اس بنیاد پر قائم کیا کہ ہر شخص پر خدا کی آواز کی اطاعت فرض ہو۔ یہ وہ آواز ہو جو خدا کی طرف سے اس کے دل میں پیدا ہوتی ہو۔ اس عین تر آزادی کے بغیر ہر قسم کی دوسری

لے افلاطون کی کتاب "سقراط کی تائید میں" کا ترجمہ منجانبِ کلیسا۔

آزادیاں، حتیٰ کہ جمہوریت، قانون مساوات اور ریاستی خود مختاری محض ایک ڈھکوسلا ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ گنتی کے چند قائدوں اور پیغمبروں پر ایک بصیرت اکثریت کا کورانہ ظلم ہو گا۔ یہ قائد اور پیغمبر لوگ ہیں جو اپنے اتباع کرنے والوں کو انسانی ترقی اور کمال کے ایک بہترین دور کی طرف رہبری کرتے ہیں۔

ایتھنز کے باشندوں کی ایک مہلک کم زوری کا ہم جائزہ یونان کا زوال لے چکے ہیں۔ اس کی راست جمہوریت حکومت کے

لیے بے کار مفلسوں کا ایک گروہ تیار کرنے سے زیادہ اور کچھ نہ تھی۔ دوسری کم زوری کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تہذیب و تمدن کی بنیاد غلامی پر رکھی گئی تھی۔ ایتھنز کے شہری کی آسائش اور آزادی اس کے غلاموں کی مشقت اور فرماں برداری کی رہیں منت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ایتھنز بہت جلد ایک ہوس کا شکار ہو گیا، اور اس ہوس نے جب کبھی سراٹھایا ہو دنیا کی تقریباً ہر ایک قوم کو تباہ و برباد کیا ہے۔ یہ ہوس تھی اپنی مرضی کو دوسروں سے منوانے کی، اور دوسروں کی آزادی کو محدود و پابند بنانے کی۔ ایک ایسی ایتھنز سلطنت قائم کی گئی جس کے اقتدار کے تحت بہت سی دوسری یونانی ریاستوں پر محصول عائد کیے گئے۔ ان ریاستوں کو لوٹا گیا تاکہ ایتھنز کی عمارتیں اور کھیل تماشے شہر کی شان و شوکت کو چار چاند لگائیں اور محصولوں اور لوٹ سے ایتھنز کے شہری ڈرامائی کھیلوں میں مفت داخل ہو سکیں۔ اسمبلی اور عدالتوں میں شرکت کا معاوضہ انھی سے ادا کیا جائے، بلکہ شہریوں کے لیے انھی سے کھانے پینے کا مفت انتظام کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایتھنز شہنشاہت کو عرف راج ہوا اور ایرانی شہنشاہت کی طرح اس نے ماتحت ریاستوں کی آزادی چھین لی۔ اس کی وجہ سے ایتھنز سے عام نفرت پھیل گئی۔ اور آخر کار اس کو ایک

طویل جنگ میں شکست اٹھانی پڑی۔ اس جنگ کی بہترین یادداشت ہمیں زبردست یونانی مورخ تھے۔ سیٹوی ڈس کی تاریخ کے اوراق میں ملتی ہے۔

یونانی شہری ریاستوں میں ایک دوسرے سے شدید رشک و حسد کی بنا پر ایسا افتراق پیدا ہو گیا تھا کہ یہ اس قابل ہی نہیں رہے تھے کہ ان کو آپس میں متحد کر کے ایک مستحکم مرکزی وفاقی حکومت بنائی جاسکتی۔ مختلف جماعتوں اور پارٹیوں کے آپس کے اندرونی جھگڑوں سے بڑی ابتری پیدا ہو گئی تھی۔ اگر ایسے وقت میں قریب کی کوئی منتظم اور طاقت و قوت اٹھ کھڑی ہوتی تو یکے بعد دیگرے ان سب کو فتح کر لینے سے کوئی چیز اسے روک نہ سکتی تھی۔

۳۳۸ ق۔ م کے قریب شاہ فلپ کے عہد میں مقدونیہ کی سکندر شہنشاہی قوت کو جنگ چھیرونیہ کے بعد سے عروج حاصل ہونے لگا۔ اس نے آخر کار تمام آزاد یونانی ریاستوں کو ہضم کر لیا۔ ڈیموسیتھس نے زبردست خطیب اور ”بعض لحاظ سے یونانی تحریک آزادی کا آخری اور سب سے الوالعزم حامی“ اپنے ہم شہریوں کو ان کی قسمت منتظرہ پر عبث متنبہ کرتا رہا، اور یونانیوں کو متحد کر کے ایک منظم مقابلہ کرنے کی بے سود لیکن جان توڑ کوشش کرتا رہا۔

اس کے بعد سکندر مقدونی کے درخشاں شہابی دور کا آغاز ہوا۔ سکندر نے ایران کی وسیع سلطنت کو بالکل تباہ و برباد کر دیا، اور اس کی انتہائی حدیں پار کر کے ہندستان تک جا پہنچا۔ اس نے ایرانی سلطنت کی جگہ ایک عظیم الشان یونانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ سکندر اگر اور دس سال زندہ رہتا تو

قانون اور حکومت کا وہ طرز ایجاد کرتا جو آزاد تہذیب کے یونانی تصورات کے سانچے میں ڈھلا ہوتا، اور ایک عظیم الشان عالم گیر سلطنت کے انتظام کے لیے موزوں ثابت ہوتا۔ چنانچہ اس نے ایشیا میں دور دور تک یونانی نوآبادیاں قائم کیں۔ یہ نوآبادیاں یونانی تمدن کا مرکز اور تجارتی منڈیاں بن گئیں۔ ان سب چیزوں سے بڑھ کر اس نے اپنے بعد انسانی دلوں پر عالم گیر سلطنت یعنی عالمی ریاست کا گہرا نقش چھوڑا۔ سکندر کی عالمی مملکت اگر وجود میں آتی تو یہ ظالمانہ شہنشاہی نہ ہوتی۔ یونانی شہروں کے ساتھ اس کا یہ سلوک کہ وہ پوری طرح خود مختار چھوڑ دیے گئے تھے، ثابت کرتا ہے کہ اس کی ذات میں کتنی زبردست صلاحیت تھی۔ ان قوموں اور ریاستوں پر جو اس کی سلطنت میں شامل تھے، مرکزی حکومت قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ انھیں انتہائی امکانی حد تک حکومت خود اختیاری دینا چاہتا تھا۔ ۳۳۶ ق۔ م میں ۳۲ سال کی عمر میں اس کی جواں مرگی نے اس کی وسیع سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ یہ دنیا کا ایک زبردست المیہ ہے۔

سکندر کے کام کے جس حقے کو سب سے زیادہ بقا نصیب ہوئی وہ غالباً سکندر کے عظیم الشان شہر کا بسا نا ہے۔ یہ وہ شہر ہے جو ایک ہزار سال تک یونانی علم اور تہذیب کا گہوارا، اس کی جامعہ اور سائنس و ایجادات کا ایک عظیم الشان محل اور کارخانہ بنا رہا۔

یونانی سائنس | اقلادون (۳۲۹-۳۳۶ ق۔ م) سقراط کا نامور شاگرد تھا۔ یہ خود نہ صرف ایک زبردست مفکر گذرا ہے بلکہ ایک زبردست مصلح بھی ہوا ہے۔ اس نے انسانی زندگی کے لیے ایک نئی تجویز پیش کی اور ایک تصویر ریاست یا "الوپیا" کا خاکہ پیش کیا۔ ایسی ریاست کا انتظام اور حکومت

عقل صحیح اور حقیقی انصاف کے مطابق رکھی گئی ہو۔ اگرچہ افلاطون کی یہ تصویر
جمہوریت یونانی شہری مملکت کے تنگ دائرے میں محدود تھی، تاہم اس وقت
سے لے کر اب تک انسانیت کے تخیل پر اس کا گہرا اثر باقی ہے۔

افلاطون کو خود اسی کی طرح ایک زبردست شاگرد ملا۔ یہ سکندر کا استاد
ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ ق۔ م) تھا۔ ارسطو نے بڑی محنت اور جفاکشی سے
بے شمار حقائق اور تفصیلات جمع کیں اور ان کا امتحان و مقابلہ کیا۔ ان کے
مطالعے سے ارسطو نے بعض ایسے اہم قوانین دریافت کیے جو فطرت اور انسانی
زندگی دونوں پر عمل کرتے ہیں۔ غالباً ارسطو ہی پہلا سائنس دان تھا۔ اس کے
طریقہ تحقیق کو اسکندر نے کی عظیم الشان جامعہ کے محققوں اور طالب علموں نے
اختیار کیا۔ ان لوگوں نے اپنی تحقیقات کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز
ترقی کی، اور کہا جاسکتا ہو کہ موجودہ سائنس کے لیے وسیع اور مضبوط بنیادیں رکھیں۔
اسکندر نے اسی عالموں میں ریاضیات کا سب سے بڑا ماہر اقلیدس تھا جس
نے علم ہندسہ کو مدون کیا ہے۔ ایک دوسرے ریاضی داں ایراٹوس نے قمر
ارض کی پیمائش کی، اور صرف پچاس میل کی کمی سے صحیح عدد تک پہنچ گیا تھا۔
اسکندر نے ہی میں ہرآن نے پہلا دھانی انجن ایجاد کیا۔ ارشمیدس نے سائنس
کی دنیا میں بہت سی تحقیقاتیں کیں۔ ان کی مدد سے بعد میں اس نے سیج اور
بیرم ایجاد کیے، اور دنیا کا سب سے پہلا میکانی انجن بن گیا۔ اسکندر نے
طب میں بھی بہت سی ترقیاں کیں۔ مثلاً اہل اسکندر نے انسانی جسم کی حقیقی
فطرت اور اس کی ساخت کا علم حاصل کرنے کے لیے سائنٹی فک طریقے پر عمل
جراحی کو رواج دیا۔ ان کی جامعہ کے عظیم الشان کتب خانے میں بے شمار کتابیں
جمع کی گئی تھیں۔ لیکن یہ کتابیں اس وقت تک بڑی صبر آزما محنت کے ساتھ ہاتھ

ہی سے نقل ہوتی تھیں، اور ان میں غلطیوں کا بہت اندیشہ رہتا تھا۔
 اس طرح ایٹھنز اور اسکندریہ کے یونانیوں نے دنیا میں علم و حکمت کی
 روح پھونک دی۔ انھوں نے تجربوں، مشاہدوں اور جزئیات کے جمع
 کرنے میں انتہائی محنت اٹھائی تاکہ دنیا اور دنیا کے اندر جو کچھ ہے اس کو صحیح طور
 پر سمجھ سکیں اور ہر واقعے کے اسباب و علل کا ٹھیک ٹھیک پتا چلا سکیں۔
 اگرچہ یونانی اور بھی مختلف طریقوں سے دنیا کی تاریخ
 یونان کا اثر دنیا پر | پر اثر انداز ہوئے مگر خاص طور پر انھوں نے فکر و فلسفہ
 اور فنون لطیفہ کی دنیا پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ چند مشہور ترین مثالوں کو لیجیے۔
 فن تعمیر میں اگر کوپوس پر پائنتہاں کے عظیم الشان معبد مجسمہ سازی میں نے ڈیا کے مجسمے
 خصوصاً پائنتہاں کے دیواری نقش جواب تک برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ ڈراموں میں
 ایسی چائی لس، سوفوکلس، ایوریپیڈس اور ارسطو کے ڈرامے، عشقیہ شاعری
 میں پنڈار کی شاعری۔ ان مثالوں پر غور کیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونان نے مختلف
 فنون میں جن و غوغا کے ایسے معیار بنائے ہیں جن کو دنیا نے اس سے پہلے کبھی
 نہیں دیکھا تھا، اور شاید اب تک بھی کوئی ان پر سبقت نہ لے جاسکا۔ یہ بھی
 فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ یونان ہی نے ہم کو ہیرودوٹس اور تھیوسیڈس جیسے
 عالم دیے ہیں۔ اول الذکر تاریخ کا باوا آدم اور ثانی الذکر فلسفہ تاریخ کا بانی ہے۔
 کہا جاتا ہے کہ عصر حاضر کی ہر وہ چیز جو راہ ترقی پر گام زن ہے، دراصل یونانی ہے۔
 اس میں شک نہیں کہ یہ ایک چھوٹی سی قوم تھی اور اس کی عظمت بھی چند روزہ
 رہی، لیکن انسانیت اس کی کمال دانائی اور جدت طبع کا ہمیشہ ہمیشہ احترام
 کرتی رہے گی۔ اسی نے دنیا کی جمہوریت، دستوری قانون، خود مختاری، آزادی
 ضمیر کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اسی جدت طبع نے پہلی بار ہمیں یہ بتایا کہ انسان
 جس دنیا میں بستا ہے، اس پر سائنس کے ذریعے وہ کس طرح کار فرما کر سکتا ہے۔

کس طرح عالمی ریاست وجود میں لائی جاسکتی ہو اور کس طرح ایسی ریاست میں تمام قومیں متحدہ رہ کر اپنی کامل آزادی کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔

مشرق کی عظیم الشان قوموں نے انسانیت کے لیے تہذیب کے روحانی اساس، نفس پر فح، اخوت، مساوات، خدمت اور خدائی بادشاہت کا انکشاف کیا۔ یونان کا عطیہ علی ذرائع کا انکشاف ہے۔ یعنی حکومت کے طریقوں، اداروں اور استحقاق اور رتبہ عمل لانے کے قابل حقوق کی دریافت ہے۔ انہی چیزوں سے کسی دن روحانی تصورات کی بنیاد پر ایک دائمی اور قابل عمل نظام تہذیب ساری دنیا میں قائم ہو سکے گا۔

پانچواں باب

رؤمہ

رؤمیوں کی اصل تقریباً اسی زمانے میں جب کہ ہلینی آریا یونان میں داخل ہوئے ہیں، ان کے رشتے دار آریا قبیلوں نے اطالیہ پر یورش کی۔ اطالیہ میں ان کو جنوبی تفتازی نسل کی شاخ اٹری کنس سے دو چار ہونا پڑا۔ اٹری کنوں کا تمدن منی آں تمدن سے کسی قدر ملتا جلتا تھا اور غالباً یہ لوگ ابتدا میں مشرق سے سمندر کے راستے اطالیہ پہنچے تھے جس طرح ہلینیوں نے منی آنیوں کے ساتھ کیا تھا، ویسے اطالیہ کے آریا فاتحوں نے آتے ہی فوراً اٹری کنوں کو زیر نہیں کر لیا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ

اٹری کنوں نے ایک زمانہ دراز تک آریاؤں پر حکومت کی ہوگی۔ آریا قبائلی جماعتوں میں سے ایک جماعت اطالیہ میں اٹری کنوں کے ملک کے جنوب اور جزیرہ منی کے جنوبی حصے کی نوآبادیوں کے شمال میں آباد ہو گئی۔ یہ زراعت پیشہ اجڈ لوگ تھے اور ایک مقدس پہاڑی کے مرکزی معبد کے اطراف بارہ قصبوں میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ "لاطینی" کہلاتے تھے۔ ان کے ملک اور اٹری کنوں کے ملک کے درمیان ٹائبر کا دریا سرحد کا کام دیتا تھا۔ اس دریا کے ایک پایاب مقام سے قریب ڈھلوان پہاڑیاں واقع تھیں، جو زیادہ بلند تو نہ تھیں، لیکن مداخلت کے لیے موزوں تھیں۔ یہیں لاطینی نوآبادیوں کے ایک مجموعے نے نشوونما پایا، ان نوآبادیوں کو پہلے پہل تاجروں اور پناہ گزینوں نے آباد کیا تھا۔ بعد میں یہی نوآبادیاں مل کر شہر روما بن گئیں۔

رومی بادشاہ | ابتدائی آریا قوموں کی طرح یہاں سرداروں کی حکومت تھی۔ رومی بادشاہ کو امن اور جنگ دونوں زمانوں میں بڑا اقتدار حاصل تھا۔ رومیوں نے جنھیں قانونی تعریف میں بڑا ملکہ حاصل تھا، اس اقتدار کا نام "امپیریم" رکھا تھا۔ بادشاہ سب سے بڑا مذہبی پیشوا اور صدر عدلیہ بھی ہوتا تھا۔ اس سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ امیروں کو طلب کر کے ان سے مشورہ کیا کرے گا۔ ان امیروں کی ایک جماعت تھی جو سینٹ کہلاتی تھی۔ اگر بادشاہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتا اور خصوصاً موت و حیات کے معاملے میں جو اختیار اسے حاصل تھا، اسے شہریوں پر بے جا استعمال کرتا تو امیر طبقہ اس کی مزاحمت کرتا تھا۔ ان امیروں کے نیچے عوام تھے۔ ایک داستان کی رو سے سروی ایس نامی ایک بڑے بادشاہ نے فوجی اور

مالی اغراض کے لیے ان عوام کی تنظیم کی تھی، اور شہر روم کو قلعہ بند کیا تھا۔ اس طرح منظم ہو جانے اور اپنی قوت کو محسوس کرنے کے بعد انھوں نے حکومت میں زیادہ حصے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس کا زیادہ فریضہ ہی کہ سردی ایس سے مرنے کے بعد کسی اٹری کن نے روم کو فتح کر لیا، اور اٹری کن بادشاہ ظلم و زیادتی سے حکومت کرنے لگے۔

کونسلیں | چھٹی صدی قبل مسیح کے آخر میں اس غیر ملکی استبداد کے خلاف امر اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک سخت کش مکش کے بعد اپنے شہر کی آزادی واپس لے لینے میں کامیاب ہو گئے۔ بادشاہت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ مگر رومیوں نے اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے شاہی اقتدار اعلیٰ یعنی "امپیریم" کو باقی رکھا اور اسے بادشاہ استعمال کیا کرتے تھے۔ آئندہ اس کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے "امپیریم" کی تقسیم کر دی گئی۔ بادشاہ کا فوجی اقتدار دو جوں کو عطا کیا گیا جو "کونسل" کہلاتے تھے۔ مذہبی پیشوائی کے عہدے جو بادشاہ کا حصہ تھے ایک دوسرے عہدے دار کو دیے گئے یہ عہدے دار "قربانیوں کا بادشاہ" کہلاتا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ کے عدالتی اختیارات "پریٹروں" کو دیے گئے۔ ریاست کے ان تمام عہدوں میں سب سے زیادہ اہم کونسل کا عہدہ تھا، کونسل صرف ایک ہی سال تک عہدے پر رہتے تھے۔ ان کا تقرر پوری قوم کی اسمبلی کیا کرتی تھی اس طرح رومیوں نے جمہوریت کی طرف ایک بڑا قدم اٹھایا تھا۔ یہ کونسل اپنی میقات کے ختم پر اسمبلی کے آگے ذمے دار ہوا کرتے تھے۔

ابتداء میں امیر بھی ہمیشہ کونسل ہوا کرتے تھے۔ کونسل اپنی خدمت اور اپنے محدود اختیارات کی وجہ سے امیروں کی مجلس یعنی سینٹ کے

مشورے پر کار بند رہنے پر ہمیشہ مجبور رہتے تھے۔ اس طرح روہی کی حکومت میں سینٹ بہت جلد سب سے زیادہ با اختیار بن گئی۔

پھر امیروں اور عوام میں نزاع عوام اقتدار حاصل کرتے ہیں | کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

یکش کش اس لیے بھی تیز ہو گئی کہ درحقیقت ایقنن کی طرح یہاں بھی بہت سارے عوام امیر قرض دہندوں کے بہت بُری طرح مفروض ہو گئے تھے۔ متعدد مواقع پر ایسا بھی ہوا کہ عوام کی جماعت کی جماعت نے اپنے واجبی حقوق کے کسی طرح بھی نہ ملنے سے بدل ہو کر روہ کو خیر باد کہہ دیا۔ اور اس ارادے سے نکل کھڑی ہوئی کہ وہ خود اپنا ایک نیا شہر بسائیں گے۔ غمی ذریعوں سے سینٹ کو ہمیشہ مقتول کہا گیا۔ چنانچہ قرضے منسوخ کر دیے گئے، نئے قانون بنائے گئے یہاں تک کہ عوام نے رفتہ رفتہ بغیر کسی خوں ریزی کے حکومتی اقتدار پر پورا پورا قبضہ کر لیا۔

پانچویں صدی کی ابتدا میں عوام نے ”ٹریبیون“ کے تقرر کی اجازت حاصل کر لی۔ ان عہدے داروں کا انتخاب وہ خود اپنے ہی لوگوں میں سے کیا کرتے تھے۔ ان کا فرض منصبی یہ تھا کہ امیروں کے ظلم سے انھیں محفوظ رکھیں۔ آخر کار ان عہدے داروں کو اتنے وسیع اختیارات دیے گئے کہ کسی قانون یا کسی مجسٹریٹ کی تجویز، جس سے عوام کی سلامتی کو خطرہ ہو، اس کے خلاف یہ اپنا امتناعی حکم جاری کر سکتے تھے۔ کچھ عرصے بعد عوام نے اس قسم کے قوانین کی تدوین و اشاعت کا مطالبہ کیا اور اپنے مطالبے کو آخر کار منوا بھی لیا، جن کی رو سے قانون کے آگے ہر شہری مساوی تھا۔ امرا اور عوام کے درمیان شادی بیاہ کا حق دیا گیا (اس سے روہ میں ذات پات کی تفریق کا

خطہ جاتا رہا، اسمبلی کو مقتدر اعلیٰ تقسیم کر لیا گیا اور آخر کار رلی سی نین قوانین ۱۹۷۱ء ق۔م کی رو سے، عالمہ کو اس طرح قابو میں رکھا گیا کہ دو کونسلوں میں سے ایک لازماً اور ممکن ہو تو دونوں کونسل عوام میں سے ہو سکیں گے۔ ان کی سی نین قوانین نے قرضہ اور ایک دولت مند طبقے کے پاس بہت زیادہ رپڑ جمع ہو جانے کے خلاف خاص احتیاطی تدبیریں اختیار کیں۔ اس امر اور عوام کی باہمی کش کش کا نتیجہ آزاد شخص کی ذات اور جاہد کی حفاظت کا عظیم الشان اصول قائم کرنا تھا، خواہ ایسا آزاد شخص کسی طبقے کا ہو۔ یہ اصول انسان انسان کے درمیان عدالتی انتظام پر قابو رکھنے والے قطعی قوانین کی صورت میں محکم کر دیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے رؤیوں کے تصور قانون کو یونانیوں کے اس دستور قائمہ کے تصور سے ممیز کرنا چاہیے کہ ریاستی اختیارات شہریوں کی خاص جماعتوں کے تفویض کیے گئے ہیں۔ اسی قانون کے لیے دنیا یونان کی رہن منت ہو۔ اس لحاظ سے رؤیے انسانیت کی زندگی کی کوئی خدمت بھی کی ہو تو وہ یونان کے مقابلے میں بہت کم مایہ ہو، کیوں کہ ریاست اور اس کے شہری افراد کے درمیان حقیقی آزادی کے حصول کے لیے تعلقات کا انتہائی قابل تحریف الضباط اس وقت تک بے کار ہو جب تک خود شہری افراد کے درمیان باقاعدہ اور پرامن تعلقات قائم رکھنے اور ان تمام بے شمار لڑائی جھگڑوں سے بچانے کے لیے معقول انتظام نہ کیا گیا ہو، جو ایک گنجان آبادی کی زندگی میں روزمرہ پیش آتے ہیں۔ دور حاضرہ کے وسیع تجربے نے ثابت کر دیا ہو کہ صرف عمومی دستور ہی کافی نہیں ہیں۔ یہ ضروری ہو کہ ان دستوروں کو مضبوط اور قابل احترام فوج داری اور دیوانی قوانین سے تقویت دی جائے۔ ایسے قوانین کو غارت گر جماعتوں یا مجلسوں یا افراد کے حوالے

سے شہری کی آزادی کو بچانے کے لیے مدون کیا جانا چاہیے۔

اس دوران میں رومہ کی فوجی قوت یہ تدریج ترقی کرتی جا رہی تھی
لڑائیاں | رومہ کی رعایا ابھی تک جفاکش، معنتی اور آزاد کاشت کار آبائی
 تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ لوگ اپنے شہر کی خدمت کے لیے سخت ترین
 فوجی نظم و ضبط کے لیے بھی مستعد تھے۔ انھوں نے گات قوم کے حملوں کے
 دوران میں سخت مصیبتیں برداشت کی تھیں۔ ان حملوں میں خود رومہ کو لوٹ
 لیا گیا تھا (۳۹ ق۔ م) انھوں نے ایٹری کن اور دوسری ہمایہ قوموں پر
 فتح پائی اور تیسری صدی قبل مسیح کی ابتدا میں رومہ وسطی اطالیہ کا بے حجت
 مالک بن بیٹھا۔ اس کے بعد یونان میں سکندر کے ایک جانشین فیرس کے ساتھ
 ایک بڑی جنگ ہوئی، اس جنگ کے نتیجے کے طور پر رومی اقتدار جنوبی اطالیہ
 پر بھی چھا گیا (۱۸۱ ق۔ م)۔ (۲۴۵ ق۔ م)

اس کے بعد (۱۴۶ ق۔ م) رومہ دولت مند نیقی تجارتی شہر قرطاجنہ
 کے ساتھ ایک طویل اور خوف ناک جنگ میں مبتلا ہو گیا۔ قرطاجنہ کا ذکر
 اس سے پہلے بھی اس حیثیت سے آچکا ہے کہ یہ شہر اپنے مرکز سے ایک عظیم الشان
 تجارتی سلطنت کی تعمیر کر رہا تھا۔ یہ مرکز بحر روم کے جنوبی ساحل پر واقع تھا
 اور اس کی عظیم الشان سلطنت کی بیرونی چوکیاں انگلستان تک پہنچ گئی تھیں۔
 قرطاجنہ نے ہنی یاں جیسا پہ سالار پیدا کیا جو تاریخ عالم کے عظیم ترین پہ سالاروں
 میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہنی بال ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ کوہ آپس کے راستے
 اسپین سے روانہ ہو کر اطالیہ میں داخل ہو گیا، اور پندرہ سال تک تقریباً بغیر
 کسی کمک کے یکے بعد دیگرے ان فوجوں کو برباد کرتا رہا جو رومہ سے اس کے
 مقابلے کے لیے روانہ کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ رومی علاقے میں جو جی چاہا،

کرتا گیا۔ صرف تازہ ملک نہ ملنے اور ایک بڑے میں محاصرے کو جاری رکھنے کے لیے ضروری آلات کی کمی نے ہنی بال کو خود رؤسہ کی فتح اور بربادی سے باز رکھا۔

آخر کار مسیحی - م قرطاجنہ کے ساتھ اس ہول ناک کش کش میں رؤسہ کو ہمیشہ کے لیے فتح حاصل ہوئی۔ اس ہول ناک کش کش پر اس وقت تک ایک سو بیس سال گزر چکے تھے۔ اس سال قرطاجنہ بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ اسی دوران میں رؤسہ اسپین سے لے کر یونان کی بحیرہ روم کی دنیا کا مالک بن گیا۔ قرطاجنہ جیسے زبردست حریف کی تباہی کے چند سال بعد ایشیائے کوچک کے ایک بڑے حصے کو بھی اب اس ملک میں داخل کر لیا گیا جو رومن امپائر یا سلطنت رؤسہ بن گیا تھا۔

سینٹ کی حکومت لیکن مسلسل لڑائیوں نے رومی سلطنت کی ہیئت کو بالکل بدل دیا تھا۔ ہنی بال نے اطالیہ پر تاخت کے دوران میں قدیم محنتی کاشت کار طبقہ کو تباہ کر دیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کھیتوں کی جگہ اب وہاں بڑی بڑی زمین داریاں تھیں۔ ان کے مالک دولت مند سرمایہ دار تھے اور ان میں غلاموں کی ٹولیاں کام کرتی تھیں۔ جو لوگ پہلے کاشت کار تھے اب پیشہ ور سپاہی بن گئے یا روم میں آئے تھے۔ یہاں انھوں نے بے کار اپنا انہو بنا رکھا تھا۔ بے کاروں کا یہ انہو ہمیشہ شرف و ساد پر آمادہ رہتا تھا۔ ایجنٹ کی طرح اسے ریاست کی طرف سے سنے داموں کھانا ملا کرتا تھا۔ یہ اسمبلی پر اپنا نام ادا جی اثر ڈال کر دیتے تھے کیوں کہ ایجنٹ کی طرح رؤسہ میں راست جمہوریت کا مفہوم یہ تھا کہ اسمبلی میں ہر شہری ایک ووٹ دینے کا حق رکھتا ہے۔ مگر یہ حق شہر میں رہنے والے ان ہی لوگوں کے کام آتا تھا جو اس کے

استعمال کرنے کی فرصت رکھتے تھے۔ اس دوران میں اگرچہ رومی شہریت کو رفتہ رفتہ اطالیہ کے دوسرے باشندوں تک وسعت دے دی گئی تھی، تاہم علماً اس عظیم المشان سلطنت پر ایک شہری ریاست کے ذریعے حکومت کی جاتی تھی۔ یہ شہری ریاست اپنے اصلی خط و خال میں ان شہری ریاستوں کے مماثل تھی جن کی کامیابی اور ناکامی کا ہم یونان کے سلسلے میں مطالعہ کر چکے ہیں۔ رومی حکومت کو مسلسل نہایت اہم فیصلے کرنے پڑتے تھے۔ ان فیصلوں کا اثر لاکھوں افراد پر پڑتا تھا۔ ان کے لیے صحیح معلومات یا کامل رازداری کی ضرورت تھی۔ رومی حکومت کو دُور دراز مقامات کی پیچیدہ فوجی ہموں کی رہنمائی اور فکر کرنی پڑتی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں میں ایک نئی طرز حکومت کو عروج حاصل ہوا جو ”عدیدہ“ کے نام سے مشہور ہو۔ عدیدہ سے عام طور پر چند تجربے کار اور دولت مند لوگوں کی حکومت مراد ہے۔ سینٹ کو غیر معمولی اقتدار حاصل ہو گیا۔ اس میں وہ تمام لوگ شریک تھے جو ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے ایسے لوگ بھی تھے جن کو پہلے ”کونسلوں“ نے اور بعد میں سنسروں نے نام زد کیا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں۔ ریاست کے عہدے دار امر کی طرح عوام بھی ہو سکتے تھے، اور ان سب کا انتخاب عام اسمبلی کیا کرتی تھی۔ رومی ذہنیت کی انتہائی قدامت پسندی اور تجربے کا رقیادت کی ضرورت نے قاعدے کے طور پر عہدے داروں کے انتخاب کو بڑے

سلہ ”عدیدہ“ کی اصطلاح ایسی حکومت کے لیے استعمال ہو چکی ہے جیسی کہ یونانی شہری ریاستوں میں تھی۔ لیکن یونان کی عدیدہ ایک قسم کی خود غرضانہ جماعتی حکومت تھی اسے رومیوں کے بہترین زمانے کی عدیدہ سے بالکل مختلف سمجھنا چاہیے۔

خاندانوں کے تنگ دائرے میں محدود کر دیا۔ ان خاندانوں کو حکومت اور اقتدار کی روایتوں نے خاص امتیازات اور مرتبہ دے رکھا تھا۔ اس کے باوجود ایک نئی اشرافیہ پیدا ہو گئی۔ یہ اشرافیہ عہدوں کی اشرافیہ تھی۔ اس کے اقتدار کے دعوے کی بنیاد یہ نہیں تھی کہ وہ قدیم امیروں کی نسل سے تھی کیوں کہ اس کے دائرے میں امرا اور عوام دونوں شامل تھے۔ اس کی بنیاد ان خدمتوں پر تھی جو اس نے گزشتہ دنوں میں سلطنت کے لیے انجام دی تھیں۔

اس کے علاوہ کونسلوں کی عہدہ داری کی مختصر سی میقات اور یہ امر کہ جو کچھ بھی کریں گے بعد میں اس کے ذمے دار ہوں گے، انہیں قدرتِ سائنٹ یعنی ”بادشاہوں کی اسمبلی“ کا مطیع کر دیا تھا۔ عام اسمبلی بھی مسلسل فتوحات حاصل کرنے میں ایسی ہی جماعت کی ہدایت سے رہ نمائی قبول کرنے پر آمادہ و راضی تھی۔ کیوں کہ جنگوں کے لیے بھرتی انہی کی رائے کے تابع تھی اور فتوحات سے حاصل شدہ مالِ غنیمت میں یہ اسمبلی حصے دار ہوتی تھی۔ اس طرح رفتہ رفتہ رؤسہ کی سنیٹ بحیرہ روم کی دنیا پر مطلق العنان حکم ران بن گئی۔

لیکن اب رومی کردار پر سلطنت کی حرص و ہوا نے قبضہ کر لیا۔ اقتدار اور مالِ غنیمت نے بہت سے سنیٹیروں

کو بے انتہا مال دار بنا دیا تھا۔ دولت اور وہ چیزیں جنہیں دولت خرید سکتی ہے، لوگوں کی ذہنیاتوں پر بڑھتی ہوئی کشش اور اثر سے کام لینے لگے۔ قدیم زمانے میں رومی خاندان میں نظم و ضبط پر بہت زور دیا جاتا تھا کیوں کہ

لہ روم کے اولین بیکے، جن کا ہمیں علم ہے۔ سنہ ۱۰۰ ق۔ م کے قریب لیڈیا میں ڈھالے گئے۔ اس زمانے سے ”بارٹر“ کے طریقے کی بجائے سکہ کا استعمال تیزی سے بڑھنے لگا۔

رومی جانتے تھے کہ کوئی قوم حکومت نہیں کر سکتی تاوقتیکہ خود اسے اطاعت کرتی نہ آئے۔ مگر آگے چل کر بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام زیادہ تر غلاموں پر چھوڑ دیا گیا۔ یہ غلام عموماً بد اخلاق اور آوارہ ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ رومی تعلیم ایک انحطاط یافتہ یونانی تعلیم بن گئی۔ خصوصاً فن خطابت میں یہ بات بالکل صادق آتی تھی۔ فن خطابت عوام کو بہکاتے اور سیاہ کو سفید ثابت کرنے کا فن تھا اور اسے راست جمہوریت کے ذریعے حکومت کی جلنے والی قدیم شہری ریاست میں انتہائی اہمیت حاصل تھی۔

شہری انبوه نے مفت کھلانے اور غیر محدود شمشیر زنی کے تماشوں کے لیے روزانہ شوروں شروع کر دیا۔ ان تماشوں میں دزدوں اور انسانوں کی غوں ریزی صرف اس لیے کی جاتی تھی کہ خون کی پیاسی شہری آبادی کو محفوظ کیا جائے۔ سنیٹ کے اراکین جو باہر صوبوں کے گورنر بنا کر بھیجے جاتے تھے ان کو اپنی سبقت ملازمت میں کال "اسپریم" حاصل رہتا تھا۔ اس اسپریم کو وہ اپنی رعایا کو لوٹنے، جبراً رشوت حاصل کرنے اور ہزاروں طریقوں سے ظلم ڈھانے میں استعمال کیا کرتے تھے۔

اس اثنا میں جنگوں، عوام کی شورشوں اور بڑھتی ہوئی عیش پسندی اور بدکاری کے باوجود ہر صورت رومیوں کی دانائی نے انسان انسان کے درمیان باہمی تعلقات کی توفیق کے کام کو استقلال کے ساتھ جاری رکھا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے ایک عظیم مجموعہ قانون مدقن ہو گیا۔ یہ مجموعہ نہ صرف شہریوں کے کام آتا تھا بلکہ رومیوں اور غیر ملکیوں کے باہمی معاملات میں بھی کار آمد تھا۔

جیسے جیسے قدیم رومی عادات و اطوار میں انحطاط آئے لگا، اقتدار کی جوس

بھی زیادہ خطرناک ہوتی گئی۔ سنیٹ کی روایتی عزت اور دیانت داری کا فور ہوئے لگی۔ امیر و غریب میں پھر ایک بار سخت کش مکش شروع ہو گئی کیوں کہ اطالیہ کے طویل و عرض میں بڑی بڑی زمین داریوں کے قیام کے یہ معنی تھے کہ رومن میں ایسے بے زمین، غیر مطلق اور مقروض لوگوں کے انہوہ کو جمع کیا جائے جو کسی زمانے میں چھوٹے چھوٹے کسان اور آزاد مزدور تھے۔ اس طرح جتنے بندی کے تلخ احساسات پیدا ہوئے اور وحشیانہ شروفساد کا بازار گرم ہو گیا۔

یونانی شہری ریاست کے انحطاط کے اسباب میں سب سے بڑا سبب نفاق تھا اور سب سے بڑے یونانی مورخ نے کہا تھا:

”ان تمام خرابیوں کا سبب اقتدار کی خواہش تھی جو حرص و طمع سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خواہش جتنے بندی کی وہ روح تھی جو انسانوں میں اس وقت پیدا ہو جاتی ہے، جب کبھی وہ علانیہ فساد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چوں کہ دونوں طرف سے قائم دل خوش کن وعدے کرتے ہیں، اس لیے ایک پارٹی بہتوں کے لیے دستوری مسادات کا اعتراف کرتی ہے، اور دوسری پارٹی اشرافیہ کی دانائی کا اقرار کرتی ہے۔ بہر حال ان لوگوں نے مفاد عامہ کو جس کے وہ برائے نام حامی تھے، اپنی جاگیر سمجھ لیا تھا۔ ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کی جان توڑ کوشش میں انھوں نے خوف ناک جرائم کا ارتکاب کیا۔..... اور شہری، جو کسی بھی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے تھے، دونوں کا شکار ہوئے“۔

یہ نقشہ نہایت خوبی سے اس انتہائی جذبے پر چسپاں ہوتا ہے، جس نے

رومی جمہوریت کے آخری سو سالوں میں مسلسل خوں ریز خانہ جنگیوں، ظلم، انقلاب اور قتل عام کے ذریعے سلطنت کی چوڑی پھول ہلا دی۔ ایک طرف جتنے بندی کا عام جذبہ تھا جو عام طور پر تشدد کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرتا تھا کیوں کہ انقلاب سے انھیں ریاست کی دولت، اقتدار اور مالی غنیمت میں ایک بڑا حصہ مل جاتا تھا۔ دوسری طرف سنیٹ کی پارٹی تھی، یہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اس سونے کی چڑیا کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی تھی، جو بحیرہ روم کی دنیا پر تسلط رکھنے سے اس کے ہاتھ آئی تھی۔

اس کے علاوہ خود رؤسہ کے باہر اطالیہ کا وہ حقہ ملک جسے ابھی روم نے دہی کا حق نہیں ملا تھا، رومی شہریت، اور رومی شہریت کے تمام منافع یعنی مستأغلہ اور دنیا کی لوٹ میں حصہ حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔

اس دوران میں رؤسہ کی عظیم اور فتح مند فوج خود غرضی اور نفاق کے تلاطم میں بھی بڑی حد تک ہمیشہ ایک زبردست قوت بنی رہی۔ دوسری صدی قبل مسیح کے اختتام تک یہ فوج ایک مستقل پیشہ ور فوج بن گئی تھی، جس میں خانہ بدوش، ظلم و زیادتی میں تربیت یافتہ اور حکومت سے زیادہ اپنے فوجی افسروں کی تابع داری کرنے والے لوگ شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت جماعت بندیوں سے پارہ پارہ ہو چکی تھی اور ایک سیدھے سادے سپاہی کے لیے یہ تحقیق کرنا ناممکن نہ تھا کہ حکومت کیا چیز ہے جس کا اسے وفادار رہنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے حربے اور طامع سپہ سالاروں کی بن آئی جو وطن یا وطن سے باہر لڑائیوں میں کام یاب رہے تھے۔ ان لوگوں نے رؤسہ میں اپنے ذاتی اثر و مرتبہ اور اپنی منظم و تربیت یافتہ فوج کو علامتی طور پر کسی ایک برسرِ پیکار

جماعت کی حمایت میں استعمال کرنا شروع کر دیا، مگر دراصل ان کوششوں سے ان کا مقصد خود اپنے لیے اقتدارِ اعلا حاصل کرنا ہوتا تھا۔

شہنشاہی حکومت کی ابتدا | ان فوجی لیڈروں میں پہلا لیڈر مارسیس تھا۔ اس نے شمالی افریقہ کے ایک حصے

کو فتح کر لے اور جرمن حملہ آوروں کے ایک خطرناک حملے (سلسلہ ق۔ یم) کو پیا کرنے کے بعد، رؤسہ کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ اس پس و پیش کی وجہ سے کہ کس جماعت کا ساتھ دے، اپنے مقصد میں ناکام رہ گیا۔

اس کے بعد سلا، ایشیائے کوچک میں ایک زبردست بغاوت، اور اطالیہ میں دوسری بغاوت فرو کرنے کے بعد نہایت شرمزہ ہو کر رؤسہ واپس آیا۔ اس نے سنیٹ کی جماعت کا ساتھ دیا اور عام جماعت کے پانچ ہزار آدمیوں کو قتل کرا دیا (سلسلہ ق۔ یم)

اس کے بعد آپسی نے تین مہینے ایک شان دار ہم جاری رکھ کر بحیرہ روم کو بحری ڈاکوؤں سے پاک کیا، اور شام فتح کرنے کے بعد رؤسہ کی کشمکش اقتدار میں اور آگ بھڑکانے کے لیے واپس ہوا (سلسلہ ق۔ یم) یہاں اگر اس نے جولیس سیزر سے شکست کھاٹی اور نکال دیا گیا۔ جولیس سیزر اپنے پیش روؤں سے بہت زیادہ بڑا آدمی تھا۔ اس نے فرانس اور برطانیہ سے نوسار خوفناک جنگ میں ایک بہترین فوج کی تربیت کی تھی، اور اب عام جماعت کے ایک زبردست حامی کی حیثیت سے رؤسہ واپس ہوا تھا۔ اپنے تمام منصوبوں اور مقصدوں کے حصول میں جولیس سیزر پوری رومی دنیا کا مطلق العنان آمر بن گیا۔ حتیٰ کہ اس کا مجسمہ رؤسہ کے مندر میں بھی نصب کیا گیا تھا اس پر

کندہ تھا؟ ناقابلِ تسخیر خدا کے لیے۔“ لیکن اس سے پہلے کہ اسے اپنے کام کے آغاز سے کچھ آگے بڑھنے کا موقع ملتا، سینٹ کی پارٹی اس کے قتل میں کامیاب ہو گئی (سلسلہ ق۔م) جو کام وہ کرنا چاہتا تھا، یہ تھا کہ دنیا کو ایک ایسی بڑی مشین کی صورت میں ڈھال دے جسے ایک آدمی کا ہاتھ چلا سکے۔

جولیس سینرز کے مرتے ہی تازہ خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

آخر کار آگے بڑھنے، یا آگٹس نے جیسا کہ بعد میں اس نے اپنا لقب اختیار کر لیا تھا، پوری طرح فتح مند ہو کر قابلِ تعریف فرزانگی، نرمی اور عملی قابلیت کے ساتھ جولیس سینرز کے کام کو مکمل کرنا شروع کیا (سلسلہ ق۔م) جہاں تک ممکن تھا سینٹ کے اقتدار اور مرتبے کا تحفظ کیا گیا۔ مگر آگٹس نے فوج اور حکومت کے تمام اہم شعبوں کو اپنے ہی ہاتھ میں رکھا۔ ”امپائر“ یا سلطنت کا لفظ اسی کے وقت سے وجود میں آیا کیوں کہ آگٹس اور اس کے جانشینوں نے پوری رومی دنیا کے طول و عرض میں ”ایمپیریم“ یعنی اقتدارِ اعلیٰ کو استعمال کیا تھا۔ اس نے ”عوام کے عدالتی حاکم اعلیٰ“ کا منصب بھی خود ہی اختیار کر لیا۔ اس طرح آگٹس نے قدیم شاہی اور اشرافی اقتدار کو عوام کے ہتھیارِ مجسٹریٹ کے اقتدار کے ساتھ متحد کر دیا۔

آگٹس نے دوبارہ نظم قائم کرنے کے کام کو اتنی دانتائی اور دقتِ نظر کے ساتھ انجام دیا کہ اس کی وفات کے بعد سلطنت کو اور چار سو سال تک بقا نصیب ہوئی۔ اگرچہ پہلی صدی عیسوی میں اکثر شہنشاہ بدچلن گزرے ہیں، پھر بھی وہ حکومت کے اچھی طرح قابل تھے۔ اس دوران میں شہنشاہ ادراس کی فوج کے مقابلے میں سینٹ کا اقتدار بہت درج گھٹتا گیا۔ دینیوی اقتدار اور عیاشی کی وجہ سے رومی کردار بھی تیزی کے ساتھ بگڑنے لگا۔

دوسری صدی عیسوی انٹونیوں کا عہد تھا۔ اس عہد میں جفاکش، سمجھ دار اور قابل شہنشاہ یکے بعد دیگرے جانشین ہوتے رہے۔ ان کے زمانے میں داخلی طور پر امن و امان تھا اور بڑی حد تک آسودگی و شادمانی حاصل رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطنت کی حدیں بھی اسکاٹ لینڈ سے خلیج فارس تک وسیع ہو گئی تھیں۔

اس کے بعد کی دو صدیوں کا زمانہ زوال و انحطاط کا زمانہ ہے۔ ان صدیوں کے دوران میں آریا قبیلوں کے مسلسل حملوں سے سرحدیں پارہ پارہ ہو کر اندر کی طرف ہٹ آئیں۔ یہ آریا قبیلے وہ تھے جو منگولی قبیلوں کی مغربی جانب پیش قدمی کے دباؤ سے آگے کی طرف ڈھکیل دیے گئے تھے۔

اگرچہ رومی سلطنت اتنی طویل مدت تک باقی رہی لیکن **فوجی استبداد** و حقیقت وہ ظلم و زیادتی کا ایک وسیع نظام بن گئی۔ تھی۔ شہنشاہ کا مرکزی اقتدار صرف قوت اور تنہا فوجی حمایت پر قائم تھا جب ایک طاقت ور شہنشاہ مرجاتا، یا کوئی کم زور شہنشاہ تخت پر آتا تو پھولوں کے جانشینی کا کوئی قاعدہ ہی نہیں تھا، اس لیے عام طور پر خانہ جنگی کا دور شروع ہو جاتا اور اس وقت تک باقی رہتا تھا جب تک کہ ان میں سے کوئی ایک کام یاب ہو کر اپنے حریفوں کو نکال نہ دیتا۔ ایک موقع پر ایسا بھی ہوا کہ فوجوں نے شہنشاہ کے رتبے کو نیلام پر چڑھا دیا اور سب سے بڑی، بولی دینے والے کے نام ختم کر دیا۔ اس کے لیے جو قیمت ادا کی گئی تھی، اسے فوجوں نے آپس میں بانٹ لیا۔

سلطنت کی سیرت کا اندازہ کچھ اس سے اچھی طرح لگایا جاسکتا ہے کہ سلطنت کے حکمران ظالم اور ان کے دامن خوں ریزیوں سے داغ دار ہوئے

کے باوجود اپنی سلطنت کے پورے طول و عرض میں دیوتا کی طرح پوجے جاتے تھے۔ عیسائیوں کی طرح وہ لوگ جو اس پرستش میں شامل نہیں ہوتے تھے، قتل کر دیے جاتے تھے۔ شہنشاہ کی پرستش حقیقت میں سرکاری مذہب بن گیا تھا، اور اس میں شرکت سے انکار ریاست کے خلاف جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح ضمیر کی آزادی کو وحشیانہ طور پر کچل دیا گیا تھا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا مرکزی حکومت کا دباؤ اتنا سخت اور شدید ہوتا گیا کہ اس نے ہر قسم کی آزادی پر اپنی مہر لگا دی۔ سماج کی بنیاد غلامی پر رکھی گئی۔ یہ استبداد بغیر کسی رکاوٹ کے بڑھتا ہی رہا، یہاں تک کہ آزاد کاشت کار قرضوں میں بڑی طرح دسب کر دولت مند زمین داروں کے غلام یا کم سے کم ان کے زرعی غلام بن گئے۔ ان زرعی غلاموں پر لازم تھا کہ وہ ان کی زمین داریوں میں بے اجرت کام کیا کریں۔ کسی اور جگہ ترک وطن کر جانے کی انھیں ممانعت تھی۔ ان خدمتوں کے صلے میں انھیں زمین کا صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں خود ہی اس پر کھیتی باڑی کریں۔ دوسری طرف ان دولت مند لوگوں کو شہنشاہ کے راشی عہدے دار دل کھول کر لٹوٹے تھے۔

سلطنت کی پہلی دو صدیوں میں بلدیوں کے اندر یقیناً بہت بڑی حد تک آزادی اور آسودگی حاصل تھی۔ یہ بلدیہ صوبوں میں کثرت سے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کو حکومت خود اختیاری کے بعض اختیارات دیے گئے تھے، اور اس کے مال دار طبقے تمدن کے ایک کافی آعلامیہ کو برقرار رکھنے کے قابل تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ مرکزی حکومت کی تباہ کن سفاکی نے ان بلدیوں کی آزادی اور خوش حالی کو بھی کچل ڈالا۔ دوسری صدی عیسوی کے ختم

پر مال دار لوگوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ بلدیہ کے کونسلر بنے رہیں جو لوگ اس خدمت پر مامور ہوتے تھے ان پر سخت تکلیف دہ بوجھ لاد دیے جاتے تھے۔ اس کے بعد تو کسی کو بلدیہ کے کونسلروں میں شامل کرنا گویا سزا کے مترادف ہو گیا تھا۔ حکومت جن لوگوں سے ناخوش ہوتی، ان کو سزا دینے یا عتاب نازل کرنے کے لیے اسے سزا کا ایک نظر فرسب طریقہ بنا لیا گیا۔ رفتہ رفتہ بہت زیادہ مال دار زمین داروں اور مفلس ترین غریبوں اور زرعی غلاموں کے علاوہ سماج کے اوسط طبقے ناپید ہو گئے۔

اس دوران میں بڑے بڑے شہروں کے اندر مزدوروں کی تنظیم کا آغاز ہو رہا تھا۔ یہ تنظیم اس قدر سخت تھی کہ ذات بندی کے قریب قریب پہنچ گئی تھی۔ سینیٹ کی رکنیت سے لے کر نان بائی تک اکثر پیشے کم و بیش موروثی ہو گئے تھے۔ تیسری صدی کے اختتام پر تمام اہل حرفہ اور کاریگر حکومت کے زیر اثر تجارتی اداروں میں شرکت پر مجبور کر دیے گئے۔ قانوناً لوگوں کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ ان اداروں سے کبھی علیحدہ نہ ہوں، کیوں کہ رومی ذات پات کے ضابطوں کو ریاست کے قانون کے ذریعے نافذ کیا گیا تھا۔ "چوتھی صدی میں ہر رکن ادارہ اس کے تمام بیٹے اور اس کی جا پیدا (نخواہ کسی ذریعے سے حاصل کی گئی ہو) تجارتی ادارے کی ناقابل انتقال ملکیت سمجھی جاتی تھی..... اگر کوئی شخص کسی رکن ادارے کی بیٹی سے شادی کر لے تو اس پر لازم تھا کہ وہ اپنے خسر کے کام میں شریک ہو جائے (بعد میں اپنے ادارے سے باہر شادی کرنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی) اس طرح سلطنت ایک بڑا خاندان بن گئی جہاں تمام آدمی اپنے مذاق کے مطابق نہیں بلکہ جبراً کام کیا کرتے تھے" بعد کی

سلاہ جانشان باطنی لائف، مصنفہ فلنڈرس پائٹری منقول، از سلطنتوں کا انجام ۱۲۹
مصنفہ ہیوبارٹ۔

رومی سلطنت میں لوگوں کو باپ دادا کے پیشے اختیار کرنے پر مجبور کر کے اور مختلف طبعی میلانات اور مدارجِ زندگی میں ان پیشوں کی آزادانہ گردش کو روک کر سماج کو غیر متحرک اور لکیر کا فقیر بنادینے کا میلان پیدا ہو گیا تھا۔ وہ شخص جو آسٹیل کے عام ذخیروں کے لیے افریقہ سے اناج لاتا، نان بائی، جو تقسیم کے لیے روٹیاں تیار کرتا، تصاب، شراب ساز اور عام حماموں کو گرم رکھنے والے یہ سب سب نسلاً بعد نسل یہی غد متیں انجام دینے پر مجبور تھے۔ وہی زرعی غلامی کا اصول سماجی زندگی کے کاموں میں استعمال کیا گیا۔ راہ فرار ہر طرف بند تھی۔ ایک شخص نہ صرف اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور تھا، بلکہ اسے اپنی ماں کے لحاظ سے بھی مجبور ہونا پڑتا تھا۔ لوگوں کو اپنی جماعت کے باہر شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

نسلی خودکشی | رومی عیش و نشاط کا سامان اور عجیب و غریب جانوروں کو ہنسا کرنے کے لیے ساری دنیا چھان ڈال گئی۔ بڑے بڑے عام تماشوں میں ایسے جانوروں کی خوب مانگ تھی۔ شمشیر زنی کی بے رحمانہ نمائشوں کے لیے قربانیوں کی کثیر تعداد درکار تھی اور ایسی نمائشیں بہت مقبول اور عام ہو گئی تھیں۔ ان کھیل تماشوں کے لیے سالانہ جو تعطیلات دی جاتی تھیں، ان کی تعداد آگسٹس کے عہد میں ۶۶ سے ترقی کر کے ۷۵، ایاچو تھی صدی میں اس سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ سستی غذا کی رسد کے لیے جو تیس علیحدہ کی جاتی تھیں، ان میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ غرض اس طرح رومی قوم کے اخلاقی تنزل کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔

اخلاقی تنزل کی سب سے زیادہ خطرناک علامت یہ تھی کہ شادی

ایک بے حقیقت تسمخہ بنتی جا رہی تھی۔ معمولی سی معمولی بات پر طلاق دی جاتی لگی۔ لوگوں کی بڑی اکثریت غالباً کبھی شادی کرتی ہی نہ تھی۔ نوزائیدہ بچوں کو مار ڈالنا یا انھیں پھینک دینا بہت عام تھا۔ اس زمانے کا ایک مصنف پڑوس کہتا تھا: ”کوئی شخص صاحبِ اولاد ہونے کا اقرار نہیں کرتا تھا کیوں کہ جس شخص کے وارث ہوں، اسے کسی تہوار کے اجتماع میں کبھی دعوت نہیں دی جاتی، بلکہ اسے سماج کے ادنا ترین طبقوں میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس بے اولاد لوگوں پر اعزاز کی بارش کی جاتی ہو اور وہ تمام فضائل کا مجموعہ بن جاتا ہو۔“ اولاد نہ ہونے کے فائدے اتنے کثیر تھے کہ سنیکا ایک زبردست فلسفی اور مدبر، ایک ماں کو جس کا اکلوتا بیٹا حال ہی میں مر گیا تھا، یہ یاد دلا کر اسے تسلی دیتا ہو کہ اب اس کی اس سے بھی زیادہ قدر و منزلت ہو گئی (یعنی ان لوگوں کی طرف سے جو اس کے وارث بننے کی تمنا رکھتے تھے) جو شخص شادی کر لیتا اس کی عقل اور حواس پر شبہ کیا جاتا ہے۔

اس جہلک نسلی خود کشی کے عمل کو روکنے کی قانونی ذرائع سے انتہائی جتدو جہد کی گئی۔ صاحبِ اولاد لوگوں کے محصول معاف کر دیے گئے۔ تمام ملازمتوں میں ترقی دینے کے لیے خاص طور پر ان ہی لوگوں منتخب کیا گیا۔ نرکہ پالنے کے لیے انھیں خاص حقوق دیے گئے۔ شادیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے عام طور پر سختی سے قانون نافذ کیے گئے۔ لیکن یہ سب اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ سب سے بڑا رومی مورخ ٹیاسی ٹس کہتا ہو کہ پہلی صدی عیسوی میں شادی بیاہ اور پرورشِ اولاد بالکل فیشن کے خلاف سمجھی جاتی تھی۔ ”اپنے بعد وارث لے“ ان جے کی کتاب ”سینزروں کے عہد میں رومی سماج“ صفحہ ۳۱ ملاحظہ ہو۔

”سلطنتوں کا انجام“ صفحہ ۱۴۱ مصنفہ ہیو بارڈ۔

ہونے کے لیے نیچے نہ رکھنے کا فائدہ نافرمانی کی سزا سے زیادہ سمجھا جاتا تھا۔
ان حالات کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ رومی نسل بہت بڑی حد تک ناپید
ہو گئی۔ ان کی جگہ ان غلاموں کی نسل چلی جنھوں نے قیمت دے کر آزادی
حاصل کی تھی یا سلطنت کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے تارک الوطنوں کی یا بعد میں
سرحد پار کے وحشیوں کی۔

آخر کار رومی سلطنت ایک بے تہذیب تمدن کی ہیبت ناک تقدیر
بن کر رہ گئی۔ ایسا تمدن جو محض ظاہر اشراف و شوکت اور عیش و نشاط کی
کھوکھلی نمائش تھی جس کے اندر بے اندازہ خود غرضی اور بداخلاقی چھپی ہوئی
تھی۔ روم نے دنیا کی لوٹ کا مال نہ صرف اپنی آبادی پر صرف کیا بلکہ آئے والی
نسلوں کو بھی غنیمت کے حصے سے محروم کر کے موجودہ نسل ہی کو نہال کیا۔ خاندان
کے متعلق اور مستقبل کے حال پر حقوق کے متعلق روم اور چین ایک دوسرے
کی ضد ہیں، چنانچہ روم فنا ہو گیا لیکن چین ابھی تک زندہ ہے۔

اسی عرصے میں جب کہ رومی نسل کا چراغ سحری بجھا چاہتا تھا
سرحدیں رومی فوج سرحدوں کی مدافعت کے لیے روز بہ روز ناموزوں
ہوتی گئی۔ یہ فوجیں بہت ہی کم زور اور چھوٹی ہوتی گئیں۔ رومی فوج کا زیادہ
سے زیادہ حصہ، سلطنت کے دوز دراز حصوں کے رہنے والے یا سلطنت سے
باہر کے وحشیوں پر مشتمل تھا۔ چونکہ وحشیوں کی یہ فوج غیر ملکی کرے کی فوج تھی
اس لیے جب کبھی اس کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس سے زیادہ تنخواہ یا اور زیادہ
لوٹ کا موقع ہو تو وہ ہمیشہ بغاوت یا خانہ جنگی پر آمادہ ہو جاتی تھی۔ رومیوں
نے ان وحشیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر کے ناقابلِ تلافی حمایت کی۔
”ان لوگوں کو فنونِ جنگ سکھائے، انھیں سلطنت میں ادھر ادھر خوب

گھمایا اور ان لوگوں کو اچھی طرح سکھا پڑھا کر واپس بھیج دیا۔ اس طرح سلطنت نے اپنے پیڑ پر آپ ہی کلہاڑی ماری۔ ایک نازک موقع پر تو فوجوں میں غلام تک بھرتی کیے گئے تھے۔

اس کے علاوہ رومی سلطنت کی بری سرحدیں مدافعت کے لیے بے حد غیر موافق تھیں۔ یہ غیر معمولی طور پر طویل تھیں، اور قدرتاً مضبوط نہیں تھیں۔ شمال مشرقی سرحد کے وسط اور جنوب میں پھیلا ہوا خود اطلالیہ سے خوف ناک حد تک قریب جرمنی کا ملک واقع تھا اس وحشی ملک میں خوف ناک قبیلے آباد تھے۔ یہ قبیلے مطیع نہیں ہو سکتے تھے بلکہ ہمیشہ منتظر رہتے تھے کہ جیسے ہی رومی حکومت کا ہاتھ کم زور پڑے اور مشرقی دباؤ بہت شدید ہو جائے، تینزی سے خود سلطنت کے قلب پر ضرب لگائیں۔

اچھی سڑکوں کے سوا رومیوں نے نہ اپنی مدافعت اور رسل و رسائل کے انتظامات میں یونانیوں کی سائنٹی فلک ایجادوں کو استعمال کیا اور نہ ان کو آگے بڑھایا۔ تجارت اور فوری نقل و حمل کے لیے انھوں نے بحرہ روم کو بھی صحیح طور پر استعمال نہیں کیا۔ حالانکہ یہ ان کی سلطنت کی بنیاد اور مرکز تھا۔ ان کی فوجیں خشکی سے گزرتی تھیں۔ ان کے جہاز بھدے اور ناکارہ ہوتے تھے۔ بحری قزاقی کو یا ایک مستقل طاعون بن گیا تھا۔ وحشیوں کو بغیر کسی بحری لڑائی کے بحیرہ روم کے مغربی حصے کا مالک بننے دیا گیا۔ فوجی مظالم، عیاشی اور نسلی خود کشی نے لوگوں کے دماغوں کو بالکل بے حس کر رکھا تھا۔

اپنے اصلی مفہوم میں حسب وطن وہاں ناپید ہو گئی تھی کیوں کہ لوگوں کی بڑی تعداد کے خیال میں سلطنت اس قابل نہیں رہی تھی کہ اس کے لیے جنگ کی جائے، بلکہ ان کے نزدیک یہ ایک نہایت نفرت انگیز حریف تھی۔

جو انسانیت کو کچلے ڈال رہی تھی۔ یونانیوں نے آزاد شہریت کا جو مفہوم سمجھایا تھا، مدت ہوئی اسے بھلایا جا چکا تھا۔ سیاحت ممنوع قرار دی گئی۔ کوئی شخص اس دور سے اپنا مکان بھی نہیں بدلتا تھا کہ وہ سرکاری معمول وصول کرنے والوں سے روپوشی کا لازم قرار دیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کے دل حقیر مقامی اغراض و مقاصد میں پھنسے ہوئے تھے، ملک ان کے لیے صرف ایک بے رحم ظالم بن گئی تھی، یہ انھیں لوٹتی اور ان کے گلے کاٹتی تھی اور وحشیوں کے حلوں کی مدافعت سے عاجز تھی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ عوام کے لیے وحشی نجات دہندہ بن کر آئے تھے۔

آخر کار وحشی حملہ آوروں کی فوجوں نے رومی سلطنت کو رؤسہ کا زوال بالکل غرق کر دیا۔ رومیوں کے زنگ خوردہ تمدن کی باقیات کو برباد کر کے صاف کر دینے میں وحشیوں نے انسانیت کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔

یہ حملہ آور پہلی مرتبہ خطرناک طور پر ۲۴۰ء میں نمودار ہوئے۔ اس وقت گاتھ نامی ایک جرمن قبیلے نے شمال سے آکر دریائے ڈینیوب کو پار کیا، ڈے سیاکے رومی صوبے (موجودہ رومانیہ اور ٹرانس لونیہ) کو تباہ کر ڈالا۔ اور خود شہنشاہ ڈے سیاکے کو شکست دے کر اسے قتل کر دیا۔

اس کے بعد سے سلطنت کو بہت کم چین نصیب ہوا۔ قبیلے کے بعد قبیلے اور حملے کے بعد حملے کا سلسلہ بند نہ گیا۔ بعض وقت پہلے حملہ آوروں نے

۱۰ "یورپ قرون وسطیٰ میں" صفحہ ۱۹ مصنفہ ڈے دس۔

۱۱ اس صفحہ میں ویلڈ کی کتاب "اوپٹیمین آف ہسٹری" سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

جو اب سلطنت میں آباد ہو گئے تھے، رومہ کی طرف سے نئے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ بعض وقت انھوں نے بغاوت کی اور اپنی فوجوں کے ساتھ نئے دشمن سے جا ملے۔ لیکن سرحدیں مستقل طور پر اندر کی طرف ہلتی جا رہی تھیں، یہاں تک کہ ۱۳۳۷ء میں الارک نامی گاتھ اطالیہ میں در آیا اور خود شہر رومہ کا محاصرہ کر لیا۔

اس کے بعد منگولی بھی جو اس عرصے میں آریاؤں کو مغربی جانب ڈھکیل رہے تھے، آئی لانا نامی ایک خوف ناک سردار کی قیادت میں سلطنت کے حدود میں داخل ہو گئے۔ ان کو گاتھوں اور رومیوں کی متحدہ فوجوں نے چالانس کی عظیم شان جنگ میں مار بھگایا (۱۳۵۶ء)۔ اس جنگ میں ایک لاکھ پچاس ہزار آدمی مارے گئے۔ مگر یہ شکست آئی لا کو دوسرے سال اطالیہ کو برباد کرنے سے نہ روک سکی۔

اس اثنا میں وحشی قبیلے اسپین، افریقہ، فرانس اور برطانیہ میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے ۱۳۵۵ء میں رومہ کو پھر تاخت و تاراج کیا، ۱۳۵۷ء میں آخری رومی شہنشاہ اپنے تخت سے دست بردار ہو گیا اور اس کے چند ہی سال بعد تھیوڈرک نامی ایک گاتھ سردار اطالیہ کے بادشاہ کی حیثیت سے اس کا جانشین ہو گیا۔

(۱) عالمی ریاست کا تصور جن برائیوں اور بد اعمالیوں
رومہ کا اثر دنیا پر
 نے آہستہ آہستہ رومی سلطنت کو موت کے گھاٹ
 اتار دیا۔ ان کی وجہ سے ہمیں اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر لینی
 چاہئیں کہ رومہ نے کم سے کم تین اعتبار سے تمدن کی ایک بہت بڑی خدمت
 انجام دی ہے۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ لوگوں کے دماغ عالمی ریاست کے تصور سے روشناس ہو گئے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہ تصور پہلی مرتبہ سکندر کی مختصر اور شاندار زندگی میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن روم کے کم و بیش پان سو سال تک بحیرہ روم کے ملکوں اور شمال مغربی یورپ کا ستر جگہ بنے رہنے کے دوران میں عالمی ریاست کا تصور انسانیت کے تصورات کا ایک نہایت معمولی تصویر بن گیا تھا۔ شہنشاہوں کی عالمی حکومت میں سیکڑوں بڑائیاں تھیں جن سے تہذیب کو سخت نقصان پہنچا اور آزادی مفقود ہو گئی۔ لیکن عالمی حکومت نے لوگوں کے دل میں یہ عظیم تصور عمیق طور پر بٹھادیا کہ حقیقت میں انسانیت ایک ہی ہے اور یہ کہ اسی طرح لوگ ایک ہی سیاسی نظام کے تحت امن و چین اور باہمی اتحاد کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ابھی تک انسانیت بے تابی کے ساتھ کوشش کر رہی ہے کہ اس تصور کو پھر حاصل کر لے اور اسے عملی جامہ پہنائے۔ اگرچہ اس میں بہت کم کام یا باقی ہوئی ہے۔

بعد کی رومی سلطنت میں لوگوں کی جبلتوں اور سرگرمیوں کو دنیا کی خدمت کے لیے آزادانہ طور پر بھیلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا گیا کیوں کہ وہاں آزادی یا تو سرے سے تھی ہی نہیں، اور اگر تھی بھی تو بہت ہی محدود تھی۔ جبلتیں وقتی فائدے اور لذت کے حصول کی کینہ اور خود غرضانہ کشمکش میں مبتلا تھیں۔ یہی کشمکش رومی نسل پر تباہی لانے کا باعث ہوئی اور اسی نے رومی نسل کو نیست و نابود کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود مغربی دنیا کی نسلوں تک ایک ہی بنی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اب تک رومی سلطنت کو اس بات کی ایک مادی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ اتحاد ایک ناممکن تصور نہیں ہے۔

(۲۱) کلیسا: دوسری چیز یہ تھی کہ عالمی سلطنت، عالمی کلیسا کا گہوارہ رہی تھی۔ عیسائیوں سے نفرت اور ان کے قتل عام کے باوجود عیسائی جماعت دؤر دؤر تک پھیل گئی تھی۔ اس جماعت نے اپنے آپ کو ایک مضبوط مرکز اقتدار کے تحت منظم کر لیا تھا۔ ان کا قسطنطین اعظم (۳۲۴ء) اور اس کے جانشین کے عہد حکومت میں عیسائیت ساری مملکت کا سرکاری مذہب بن گئی۔ دہشیوں کے حملوں نے جب انسانیت کے ظاہری اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تو مغربی عیسائیت کا روحانی اتحاد گیارہ صدیوں سے زیادہ عرصے تک باقی رہا۔ یہ مدت تمدن کے احیا میں دہشی یورپ کی تربیت کرنے کے لیے کافی طویل مدت تھی۔

اس کے علاوہ اگرچہ عام زندگی میں سلطنت کا اتحاد متقل طور پر بدستور ہوتا جا رہا تھا، لیکن عیسائیت دہشیوں کی فتح سے پہلے ہی نمایاں طور پر اندرونی اخلاق کی اصلاح کر رہی تھی۔ عیسائیت روحی قوم کو اپنی آپ لائی ہوئی تباہی سے بچانے کے لیے بہت دیر میں پہنچی۔ مگر اس قوم کے زوال کے بعد کلیسا کی تعلیم اور اس کے ولیوں کی مثال روپیوں کے جانشینوں کے لیے بہت ہی فائدے مند ثابت ہوئی۔

(۲۲) قانون: جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، دنیا کو روم کا تیسرا عطیہ قانون

۱۔ عیسائیت کی رائے عام نے شمشیر زنی کے مقابلوں کو بند کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ ٹلی ماچیس نامی ایک سامی راہب کی ہمت اور قربانی نے اس کو ممکن کر دیا۔ یہ راہب شمشیر زنیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لیے دنگل میں کود پڑتا تھا۔ اگرچہ وہ خود مارا گیا، مگر اس کی موت نے ایسا اثر کیا کہ یہ ”کھیل“ ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے۔

ہے۔ یہ دستوری قانون نہیں۔ اس قسم کے قانون کے لیے جو یہ واضح کرتا ہے کہ ایک خود مختار جمہوریت کے تمام شہریوں کے لیے کس طرح بہترین طریقے پر آزادی کا تحفظ کیا جاسکتا ہے، ہم یونانیوں کے ممنون ہیں۔ رؤسہ کا قانون دیون اور فوج داری قانون ہے۔ یہ قانون واضح کرتا ہے کہ کس طرح ذات اور جایاد کے حقوق کا بطریق احسن تحفظ ممکن ہے۔ رومی ہمیشہ سے قاعدے اور ضابطوں کا گہرا احترام کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے نہایت قابل تعریف صحت کے ساتھ انسان انسان کے درمیان انصاف کے بہترین طریقوں کو دریافت کیا، انھیں محفوظ رکھا، انھیں ترقی دی اور ان کو مستحکم کر دیا۔ رومی شہریت کو وسعت دی گئی۔ پہلے پہل یہ حقوق تمام اطالیوں کو دیے گئے اور پھر تیسری صدی عیسوی کی ابتدا میں سلطنت کے تمام آزاد باشندوں کو بھی یہ حقوق عطا کیے گئے۔ اس طرح دریائے کلائیڈ سے لے کر دریائے فرات تک رؤسہ کا ایک ہی ہم آہنگ قانونی نظام عالم گیر طور پر نافذ کیا گیا۔ یکے بعد دیگرے متعدد ماہر قانون دانوں نے اسے تکمیل کو پہنچایا اور آخر کار شہنشاہ جولیئین (۳۶۴ء) نے اس کو منضبط کر دیا۔ اگرچہ بربریت اور وحشت کے زمانوں میں اسے بہت بڑی حد تک جھٹایا گیا تھا، پھر بھی یہ فرانس اور اطالیہ میں کم از کم ایک بگڑی ہوئی اور ناقص حالت میں باقی ضرور رہا۔ آخر کار قرون وسطیٰ اور ازمنہ حاضرہ میں اسے پھر سے دریافت کیا گیا اور پھر ایک بار نافذ کیا گیا۔

انگلستان کے سوا آج بھی یہ تمام بڑی بڑی یورپی ریاستوں کا اساس قانون ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ رومی سرحدیں بہت وسیع تھیں اور ان کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ شہنشاہوں نے اپنے اقتدار کو بہت دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ رومیوں

مشرقی سلطنت

کی بنائی ہوئی بڑی بڑی سڑکوں کے ہوتے ہوئے بھی فوجوں کی کافی تعداد کو تیزی کے ساتھ ان طویل سرحدوں میں کسی مقام پر جمع کرنا ممکن نہ تھا، جہاں دشمنوں کے اچانک جمع ہونے کا خوف رہتا تھا۔ اس کے علاوہ خطرہ نہ صرف شمال (یعنی شمالی انگلستان کے اطراف رومی دیوار یا دریائے رائیں اور ڈینوں پر) اور شمال مشرقی سرحدوں پر تھا، بلکہ انتہائی مشرقی سرحدوں پر بھی موجود تھا۔ یہاں ایک نئی اور مضبوط ایرانی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔

شہنشاہ ڈی اک لی ٹین اعظم نے تیسری عیسوی صدی کے اختتام پر اس خیال سے کہ ان دونوں خطرناک حلقوں میں سے کسی ایک سے بھی غفلت نہ برتی جائے، شاہی اختیارات میں سے پورا پورا حصہ دے کر ایک شریک کار کو مقرر کر کے انکی تجویز پر عمل کیا۔ شہنشاہ نے مغرب کی حفاظت کا کام اس شریک کار کے سپرد کیا اور مشرقی کا انتظام خود اپنے ہی ماتحت رہنے دیا۔

ایک نسل کے بعد پہلا عیسائی شہنشاہ قسطنطین "بائی زن ٹیم" رسل باسفورس پر بحیرہ روم اور بحر اسود کے درمیان کے عمدہ محل وقوع سے بے حد متاثر ہوا اور یہ بحری اور بری رسل و وسائل کا مقام اتصال اور ایک ایسا نقطہ ہی جہاں سے مساوی طور پر ان سرحدوں کی مدافعت کا انتظام کیا جاسکتا ہے جو خطرے میں ہوں۔ چنانچہ اس نے دارالسلطنت کو اس شہر میں منتقل کر دیا اور اسے نئے سرے سے تعمیر کر کے اس کا نام قسطنطنیہ رکھا۔ اس کی اس دلیل نہ سیاسی نہ دیرینہ کئی لحاظ سے ہر طرح حق بہ جانب ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ خود رؤسہ کے زوال کے بعد قسطنطنیہ کی مشرقی سلطنت ایک ہزار سال تک حملہ آوروں کے مقابلے میں سینہ سپر رہی۔ قسطنطین کے بعد ہی رومی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک مغربی سلطنت

کہلاتی تھی اور دوسری مشرقی۔ پہلی سلطنت رومہ کے زیرِ اقتدار تھی اور دوسری قسطنطنیہ کے۔

سلطنت کی یہ تقسیم خود بھی زوالِ رومہ کا ایک دوسرا سبب بنی۔ کیوں کہ ڈیونوب کا پورا سرحدی خط مشرقی اور مغربی حکمرانوں کے حصے میں تھا۔ لیکن جب کبھی کوئی حملہ ہوتا تو دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی پوری طرح مدد نہیں کرتا تھا۔ اس طرح جہاں سلطنت کی تقسیم نے رومہ کی تباہی کی رفتار کو تیز کر دیا۔ وہاں قسطنطنیہ کی بقا کا بہت کچھ سامان بھی کر دیا اور قسطنطنیہ کی بقا مستقبل کے لیے انتہائی اہمیت رکھتی تھی۔

مشرقی سلطنت صرف جزوی طور پر رومی سلطنت تھی۔ اس کی زبان اور اس کا تمدن دونوں یونانی تھے، اور بحجز اپنے نظامِ قانون کے یہ بہر صورت بجائے آگسٹس کی سلطنت کے سکندر کی سلطنت کی جانشین تھی۔ اس نے بڑے بڑے فرماں روا پیدا کیے۔ ان میں حکمیں کا ذکر ہم رومی قانون کے آخری ترتیب دہندہ کی حیثیت سے پہلے کر چکے ہیں۔ اس کے عہدِ حکومت میں وہ ملک جو قسطنطنیہ کے ماتحت تھے، بہت وسیع ہو گئے، اور اطالیہ و افریقہ و حبشوں سے واپس لے لیے گئے۔

عربوں کے عروج کے بعد قسطنطنیہ کئی صدیوں تک عربوں کے حوالے اور ان کے بعد سلجوقی و عثمانی ترکوں کے مقلدے میں یورپ کی مشرقی پہاڑ گاہ بنا رہا۔ اس سلطنت کی درباری زندگی بے شمار لغو اور بے معنی رسوں سے بھری ہوئی تھی۔ دربار میں سازشوں اور فریب کاریوں سے ہمزی پھیلی ہوئی تھی۔ آبادی میں قدیم یونانی فرقے وارانہ منافرت کی لعنت موجود تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود مشرقی سلطنت نے یونانی علم و تمدن کے چراغ کو دس تاریک صدیوں

تک دھندلا سا روشن رکھا اور اس روایت کو کہ دنیا میں کبھی آزادی موجود تھی، زندہ رکھا۔ وہ شہنشاہی شہر جو ہر پورش کے مقابلے میں اتنے عرصہ دراز تک ناقابل فتح بنا رہا، اسے آخر کار عثمانی ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں فتح کر لیا۔ قسطنطنیہ کی فتح سے پہلے ہی یونانی مخطوطے اور یونانی علما مغرب میں اٹالیہ پہنچ رہے تھے۔ یہاں شاعری، بت تراشی، مصوری، زیبائی و رعنائی کے ایک نئے نقطہ عروج کی طرف گام زن تھی۔ قسطنطنیہ کے زوال کے بعد یہ تحریک بہت وسیع ہو گئی اور یونانی صداقت اور یونانی آزادی کا چرچا تیزی سے پھیلنے لگا۔ بادشاہ اور پاپا قدیم مخطوطے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت کرتے تھے۔ ”تعلیم جدیدہ“ نے جو دراصل تو دریافت یونانی تعلیم تھی، یورپ کی سیاسی اور ادبی جدوجہد میں ایک نئی روح پھونک دی۔ قسطنطنیہ نے ایک مستحکم دارالسلطنت کے انتخاب میں جو دانش مندی کی تھی اس کی وجہ سے اور اس کے بعد مشرقی سلطنت نے وحشت اور بربریت کے زمانوں میں تہذیب کے یونانی تصورات کو محفوظ رکھا۔

جٹینن نے اٹالیہ کو وحشیوں کے ہاتھ سے نکال لیا اور اٹالیہ کی تقسیم | اس کو مشرقی سلطنت کا ایک صوبہ بنا دیا۔ مگر اس کے صرف پندرہ سال بعد ہی آریاحملہ آوروں یعنی مبارڈوں کا ایک زبردست سیلاب آیا۔ ان وحشیوں نے شمالی اٹالیہ میں ایک وحشی سلطنت اور جنوب میں مزید دو وحشی ریاستیں قائم کیں۔ اس طرح ان وحشیوں نے جٹینن جیسے زبردست شہنشاہ کے بہت سے کارناموں پر پانی پھیر دیا۔ چوں کہ مرکز ابھی تک مشرقی سلطنت کے علاقے میں تھا، اس لیے اٹالیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ ٹکڑے ۱۸۰۷ء تک پھر باہم جوڑے نہ جاسکے۔

پچھٹا باب

قرون وسطیٰ

وحشی فاشیوں کی پہلی موجیں رومی تمدن سے جو ان کے جاگیرى نظام | زمانے تک کارفرما چلا آتا تھا، گہرے طور پر متاثر ہوئیں۔

انھوں نے رومی قانون کو اختیار کر لیا اور اس میں توسیع بھی کی۔ بعض وقت یہ لوگ قسطنطنیہ کے حلیف ہونے کا دعوا کرتے تھے اور اپنی ریاستوں کے انتظامات کو اپنے پیش رو شہنشاہوں کے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھالتے تھے، اور ان شہنشاہوں کی اکثر انتہائی ستائش کرتے تھے۔ اس طرح ابتدائی فاتح سرداروں میں سے ایک ابتدائی سردار نے کہا تھا:

”جب میں جو ان تھا تو میری تمنا تھی کہ رومی نام و نشان بٹا

وؤں اور ان تمام چیزوں کو جو کبھی رومیوں کے قبضے تھیں،

گاتھ کے زبردست کر دوں۔ مگر تجربے نے مجھے اس سے بہتر سبق

سکھایا، وحشی اور بے لگام گاتھ کسی قانون کو مانستے نہ تھے اور

اگر دولت عاتق کو قانون سے محروم کر دیا جاتا تو یہ ایک مجرم ہوتا۔

اس لیے رومی نام و نشان اور روم کے قدیم دستور بحال کرنے

کے کام کو میں نے نہایت ہی خوشی سے اختیار کیا“۔

۱۱۵ (بقیہ نوٹ ص ۱۱۵ پر)

لیکن یہ ابتدائی حملہ آور خود بھی دوسرے قبیلوں سے مغلوب ہو گئے۔
 ابتدائی حملہ آور قبیلوں میں سے بعض نے واقعی قدیم سلطنت کی فوجوں میں
 تربیت پائی تھی، لیکن بعد کے دوسرے قبیلے پہلے پہل رومہ کے نام اور
 رومہ کی تہذیب سے بہت کم آشنا تھے اور اس کی کچھ پروانہ کرتے تھے۔
 اس طرح مسئلہ میں فرانس پر فرانک، اطالیہ کے میث تر علاقے پر لمبارڈ
 انگلستان پر ٹیوٹانی قبیلے اور اسپین پر مغربی گاتھ قابض تھے۔ ان نسلوں
 نے ایک نئی طرح حکومت اور ایک نئے سماجی نظام کی عمارت اٹھانی شروع
 کر دی، جس کی بنیاد قبیلے کے سردار اور امرا (جنگ میں اس کے ساتھی
 اور قبائلی خاندان کے صدر) قبیلے کے عام لوگوں اور مفتوحہ آبادی کے
 درمیان خانہ بدوشانہ تعلقات پر تھی۔ اس نئی تنظیم کا ماخذ تقریباً فریسا
 ہی تھا جیسا ہندوستانی ذات بندی کے نظام کا، جس نے کچھ ایسے ہی حالات
 میں نشوونما پایا تھا۔ یعنی فاتح حملہ آور مگر تہذیب سے دُور آریاؤں کو ایک
 ایسے طریقہ کار کی ضرورت تھی جس کے ذریعے وہ مستقل اقامت کو پیش نظر
 رکھ کر اپنے مفتوحہ علاقوں کا انتظام کر سکیں۔ چوں کہ حملہ آوروں نے عیسائی
 مذہب قبول کر لیا تھا، اس لیے جاگیر نظام میں رنگ کی رُکاوٹ کے
 باعث کسی طرح کوئی الجھن پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ جاگیر نظام
 نے اپنے ترقی پذیر نظام کو تقویت دینے کے لیے اپنے مذہبی عقیدوں
 (صفحہ ۱۱۴ کا بقیہ نوٹ)۔ کتاب "تقدیر وسطیٰ میں یورپ" میں نقل کیے گئے ہیں۔
 یہ مغربی گاتھ حملہ آوروں کی پہلی بڑی حوج سے تعلق رکھتے تھے۔ چوں کہ یہ عیسائیت
 کے ایک فرقے سے مجنونانہ عقیدت رکھتے تھے اور اس فرقے سے بقیہ رومی دنیا کو
 نفرت تھی، اس لیے یہ رومی تمدن میں حتمہ لینے سے باز رہے۔

اور اپنے مذہبی پیشواؤں کے طبقے کو ترقی نہیں دی۔ یہ حقیقت بھی نظام جاگیر پر سلسلہ اثر کرتی رہی کہ اس نے ایک قدیم عظیم الشان تمدن کی باقیات میں پرورش پائی ہر اور عیسائیت کی تعلیم میں انعت، مساوات اور دُنیا کی خدمت گزاری شامل ہر لیے

اس کے علاوہ جاگیر نظام کی تعمیر سلسلہ لڑائیوں کے دوران میں ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک فوجی نظام تھا، اور یہ نظام مداخلت میں آسانی اور ایسی فوجوں کی فراہمی میں سہولت پیدا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا جو ہمیشہ تازہ فتوحات کی بھوکے رہتی تھیں۔ حالات کا تقاضا تھا کہ صنعت و حرنت کو ترقی دی جائے اور پُرا سن طریقے سے بدیسی قبیلوں کو نئی نئی ذاتوں میں جذب کر دیا جائے۔ یہی وہ عوامل تھے جنہوں نے ہندستان میں ذات بندی کو اس قدر موثر اور قومی بنا دیا، اور لوگوں کی معاشی زندگی کو اس کے ساتھ اس قدر مضبوطی سے مربوط کر دیا۔

ان تمام حالات کے باوجود جاگیر نظام میں اس کے متعدد مخصوص نقائص کے علاوہ نظام ذات بندی کی تمام تباہ کن بُرائیاں موجود تھیں۔ ایسی حد بندیوں کے ذریعے جو صدیوں تک حملے برداشت کرتی اور ایک مضبوط قومی زندگی کی تعمیر میں بے دردی سے حائل رہیں، انسان کو انسان سے اور جماعت کو جماعت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ قدیم تعصب کے خطرناک بوجھ نے تمدنی ترقیوں کو محدود کر دیا۔ صنعت و حرنت کی ابتدائی منزلوں میں اگرچہ گروہ بندی کے نظام نے اس کے اراکین کے مفاد کی حفاظت کے لیے محصول اراضی اور زرعی غلامی کا دستور زیادہ تر بعد کی رومی سلطنت سے جاگیر نظام کے ریاستی انتظام کو ورثے میں ملے تھے۔

کی، مگر خود یہی صنعت و حرفت کے طریقوں کی اصلاح میں مانع رہی۔ نسب کے غرور نے لوگوں سے اس حقیقت کو پوشیدہ کر دیا تھا کہ امیر و غریب، اعلیٰ و ادنا سب مساوی طور پر باعزت خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

نظام جاگیر کے بنیادی تصورات | آٹھویں صدی کے وسط میں جب کہ عرب فتوحات کا خطر

ٹل گیا، اس وقت یورپ اور خاص کر فرانس جاگیر کے نظام سے مضبوطی کے ساتھ منسلک تھا۔ اس کی بنیاد دو اساسی تصورات پر رکھی گئی تھی: پہلا یہ کہ ہر شخص کا ایک "لارڈ" یا آقا ہونا چاہیے۔ ایسا لارڈ اس کی نگہداشت کرے اور اس کے بدلے میں وہ شخص لارڈ کی خدمت بجالائے گا۔ دوسرا یہ کہ زمین کی ملکیت ہی تمام سیاسی اور سماجی تعلقات کی بنیاد ہو۔

جماعت کے لوگوں کی تمام مقبوضہ زمین کا اصلی مالک بادشاہ ہوتا تھا۔ خدا کے بعد وہی سب سے بڑا آقا اور مالک سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ اپنے جنگی سرداروں اور بڑے بڑے خاندانوں کے سرگروہوں یعنی بیروں کو اپنی بعض زمینوں میں سے حصہ دیتا تھا۔ امیروں کو عطا کی ہوئی زمینوں کے معاوضے میں ان پر لازم تھا کہ وہ "ہوٹیج" پیش کریں۔ یہ بادشاہ کے احترام، اس سے وفاداری اور مطلوبہ خدمت کے اقرار کی علامت تھی۔ ایسی خدمت عام طور پر جنگ کے وقت فوجوں کی فراہمی کی صورت میں پیش کی جاتی تھی۔ بادشاہ کو اپنے امیروں سے مجموعی طور پر تمام اہم معاملوں میں مشورہ کرنا لازمی تھا۔

لے "ہوٹیج" پیش کر لے کی صورت یہ تھی کہ "لگان دار" اپنے لارڈ کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر گھٹنوں کے بل جھک جاتا تھا اور اس کے بعد وفاداری و خدمت گزاری کا عہد کرتا تھا۔

قدیم آریا قبیلوں کی طرح امیر اپنے لیے یہ کر سکتے کہ ان کو عطا کی ہوئی زمینوں کو لگان پر اٹھا دیتے تھے۔ اس زمین کے معاوضے میں لگان داروں پر لازم تھا کہ وہ اپنے لارڈ کو "ہومیج" ادا کریں، یہ خدمت اس طرح ادا کی جاتی تھی کہ لارڈ کو بادشاہ کے لیے جو فوج فراہم کرنی پڑتی تھی، اسے یہ لگان دار بھرتی کیا کرتے۔ ان لگان داروں کے نیچے مفتوحہ آبادی تھی۔ یہ لوگ وہ تھے جن کی جاگیری نظام میں کوئی حقیقی جگہ نہیں تھی، کیوں کہ ان کے پاس کوئی زمین ہی نہیں تھی۔ چنانچہ یہ لوگ زرعی غلام بن گئے۔ یہ زرعی غلام ایک ہی زمین داری میں زندگی بسر کر سکتے اور اس کے مالک کی بلا اجرت خدمت کر سکتے پر مجبور تھے۔ اس کے معاوضے میں انھیں کھیتی باڑی کرانے کے لیے زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیا جاتا تھا۔

بعض ملکوں میں فاتح قبیلوں کے عوام قصبوں میں بس گئے۔ ایسے قصبوں میں زمین مشترکہ طور پر معافی دار لگان داروں کے قبضے میں رہتی تھی اور یہ لوگ اس میں کام کیا کرتے تھے۔ عام طور پر ہر ایک خاندان کو زمین کی سالانہ نئی تقسیم سے اسی قدر زمین ملتی تھی کہ وہ اس کی گزر بسر کے لیے کافی ہوتی۔ ان قصبوں میں خاندانوں کے پاس زمین منتشر قطعوں کی صورت میں ہوا کرتی تھیں۔ کوئی زمین کسی مقصد کے لیے کارآمد نہ ہوتی اور کوئی کسی اور مقصد کے لیے اس طرح سب یکساں طور پر ان مشترکہ زمینوں میں حصہ لے سکتے تھے۔

لے ولیم اول شاہ انگلستان جیسے زبردست بادشاہ مجبور کرتے تھے کہ لگان دار بھی راست انھیں ہومیج کو پیش کریں۔ اس طرح ایسے بادشاہوں نے امیروں کے طبقے کو بہت بڑی حد تک کم زور بنا دیا تھا۔

نہ صرف زرعی غلام ہی بلکہ قصبائی باشندے بھی درحقیقت جاگیرى نظام سے باہر تھے کیوں کہ آخر الذکر کی گزر تجارت پر تھی نہ کہ زمینوں کی کاشت پر۔ لیکن چون کہ جاگیرى نظام کا مطالبہ تھا کہ ہر شخص کا ایک "لارڈ" ہونا چاہیے اس لیے جس لارڈ کی زمین پر گائے آباد ہوتا، وہ لارڈ اس کے باشندوں سے درحقیقت زرعی غلاموں جیسا ہی برتاؤ کیا کرتا تھا۔

جاگیرى نظام میں یہ ضروری تھا کہ مرتبہ اعزاز اور زمین باپ سے بیٹے پر منتقل ہو کرے۔ جرمنی اور فرانس کی طرح بعض ملکوں میں امیروں کی جائیداد مساوی طور پر بیٹوں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ ان سب بیٹوں کو بھی امارت کا درجہ حاصل رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیاداد کی تقسیم در تقسیم ہونے لگی اور امیروں کا ایک حد درجہ فلاکت زدہ طبقہ پیدا ہو گیا۔ اس کے برخلاف انگلستان میں صرف بڑا بیٹا ہی امیر سمجھا جاتا تھا اور وہی پوری جائیداد کا تہاوارث ہوتا تھا۔ جاگیرى نظام کے امیر خود اپنے موروثی حقوق اور مرتبے کے بارے میں جیسے سخت تھے، ویسے ہی موقع ملنے پر اپنے اقتدار کو بڑھالے اور بادشاہ کو اس حق سے کہ وہ اپنے بعد اپنے بڑے بیٹے کو اپنا وارث بنائے، محروم کر دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ یعنی وہ بادشاہت کو موروثی بننے سے روکنا چاہتے تھے۔ امیروں نے اس قدیم اصول کو مستقل اور موثر بنانے کی کوشش کی جس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ اس کی رو سے امیر بادشاہ کو منتخب کیا کرتے اور وہی اس کو معزول بھی کر سکتے تھے۔

جاگیرى نظام کی خوبی اس کی سادگی تھی۔

جاگیرى نظام کی خرابیاں | اس نے وحشت و بربریت کے زمانے میں ریاستی انتظام، مداخلت اور عدالت کے لیے ایک سرسری اور خودی

طریقہ کار مہیا کیا۔ ہر لارڈ کا نہ صرف یہ فرض تھا کہ وہ بیرونی دست درازوں سے اپنی رعایا کی حفاظت کرے، بلکہ اپنے ملک کے رواج کے مطابق ان میں انصاف بھی کیا کرے۔ جاگیرِ نظام نے اپنے ایک مخصوص بھدے سے اصولِ اخلاق کی تعلیم بھی دی۔ یعنی خیال یہ تھا کہ جس طرح ایک شخص کو کچھ فرائض اور خدمت انجام دینے ہیں، ویسے ہی اسے کچھ حقوق طلب کر لے گا بھی حق ہو۔ اور طاقت ور کا فرض ہو کہ اپنے کم زور متعلقین کی حفاظت کرے۔ لیکن خدمت گزاری کا یہ مفہوم جو اس طرح سکھایا گیا، خطرناک طور پر تنگ اور محدود تھا۔ اور جاگیرِ نظام کی خرابیوں کا پلہ اس کی خوبیوں سے زیادہ بھاری تھا۔ اس نظام نے ایک دوا می اور خود مختار حکومت میں زمین داروں کی محدود جماعت کو استحکام بخشا۔ ان زمین داروں کا ہمیشہ سے یہی چلن رہا کہ بادشاہ کے جوئے کو اپنی گردن سے اتار بھینکیں، اور خود مختار جابر بن جائیں۔ مساوی عالم گیر قانون کی حکومت، ٹھلا دی گئی اور ہزاروں مقامی رسم و رواج جو لارڈوں کی خدشہ مندی نافذ ہوئے تھے، یورپ بھر میں رائج ہو گئے۔ صنعت و حرفت اور تعلیم سے نفرت کی جاتی تھی کیوں کہ صرف سپہ گری ہی ایک معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔

منظم حکومت کا مرکزی اقتدار ریاستیں اور اقتدارات عطا کر لے اور حریفانہ امور کی مسلسل بغاوتوں کی وجہ سے بے حد کم زور پڑ گیا تھا۔ جنگ فتوحات اور لوٹ ہی پر امیروں کی زندگی کا دار مدار تھا۔ ہر لارڈ کو اپنے پاس تنخواہ یا سپاہیوں کی ایک جماعت رکھنی پڑتی تھی تاکہ جب کبھی بادشاہ کو ان سپاہیوں کی ضرورت ہو، یہ تیار رہ سکیں۔ اس نوحہ ریز زمانے میں ایسی خانگی فوجوں کو قابو میں رکھنے کا ایک ہی طریقہ تھا وہ یہ کہ ان

کے لیے مہموں اور لوٹ کا سامان مہیا کیا جائے۔ جاگیریں یورپ ظالم اور بیٹھے
بیرتوں کے قلعوں اور گڑھیوں سے بھرا پڑا تھا۔ ان بیرتوں کی جموع الارض یعنی
جدید ریاستوں کے حصول اور اگر ممکن ہو تو اپنے سے بڑے لارڈ کی ماتحتی سے
آزادی حاصل کرنے کی مسلسل جدوجہد نے آئرستان سے لے کر فلسطین تک
تمام ملکوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔

جاگیریں نظام اپنے بہترین زمانے میں ایک سخت ذات بندی کا سماج
نظام تھا۔ اس نظام کے ماتحت تمام طبقے زندگی بسر کرتے اور اپنے جداگانہ
مخصوص آبائی دائروں میں کام کیا کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انھیں
تباہی لائے والی خفیہ قوتوں کی طرف سے طوائف الملوکی پیدا کر دینے کا ہمیشہ
ڈر لگا رہتا تھا۔ جاگیریں نظام اپنے بدترین زمانے میں کم زور بادشاہ کے
ماتحت قتل، لوٹ مار اور غارتگری کا ایک ہولناک منظر تھا۔ یہ ظالم اور
خود غرض اشرافیہ کی ایک زبردست طوائف الملوکی تھی اور ان کے ذہیل
اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے جاری تھی۔

نظام جاگیریں سے دست و گریباں ہونے والی قوتیں تقریباً سات سو

سال تک جاگیریں نظام یورپ کے بڑے حصوں پر مسلط
رہا۔ پندرھویں صدی کے اختتام پر طاقت ور قومی بادشاہوں کے عروج
کے ساتھ ہی کہا جاسکتا ہے کہ یورپی زندگی میں جاگیریں تصورات اور مرکزی
قوتوں کی فراہمی کا کام ختم ہو گیا۔ مگر اٹھارھویں صدی کے اختتام تک اس
کے بہت سے ادارے باقی تھے۔ فرانس جیسے روشن خیال ملک میں بھی یہ
ادارے قدیم زمانے کی یاد تازہ کر رہے تھے اور دوسرے مقاموں پر تو یہ

کہیں زیادہ طاقت در تھے۔ خود چارے زمانے میں جاگیرى نظام کی روایات اب تک اتنی با اثر ہیں کہ انھوں نے ایسے ملکوں میں جو کئی اعتبار سے کافی تمدنی ترقی حاصل کر چکے ہیں، وہاں بھی آزادی کے پیڑوں میں بیڑی ڈال رکھی ہو۔

ایک ایسے بڑے اعظم کو جو کسی زمانے میں یونانی آزادی کے خواب دیکھ چکا تھا، اس کی وحیاً نہ گرفت سے نجات دلانے کے لیے رفتہ رفتہ بہت سی قوتیں آپس میں متحد ہو گئیں۔

مقدس رومی سلطنت | ان دنوں جب کہ جاگیرى نظام ابھی تشکیل پا رہا تھا، فرانکوں کا ایک زبردست

بادشاہ شارلی مین (۷۵۴ء تا ۷۷۴ء) نمودار ہوا۔ یہ چارلس مارٹل کا پوتا تھا جس نے لٹور کی لڑائی میں عربوں کو شکست دی تھی۔ اس کے باپ نے پن نے روم کو لمبارڈوں کے حملے کے خطرے سے نجات دلائی تھی اور پوپ (روم کا بشپ) کو وسط اٹالیہ کا وہ علاقہ عطا کیا جس کو لمبارڈوں نے مشرقی سلطنت سے حال ہی میں فتح کیا تھا۔ یہی علاقہ بعد میں پاپائی ریاستیں کہلایا، اور ان کا ہر یہ عطیہ پاپن کے نام سے مشہور ہوا۔ اٹالیہ کے اندر ایک جداگانہ ریاست کی حیثیت سے اس کے وجود نے اطالوی اتحاد کو اور بھی مایوس کن بنا دیا اور کئی صدیوں کے بعد بھی یہ ریاست اتحاد کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔

شارلی مین نے اپنے باپ سے ایک وسیع سلطنت ورثے میں پائی۔ یہ سلطنت موجودہ فرانس، ندر لینڈ اور جرمنی کے مغربی حصے پر مشتمل تھی۔ شارلی مین نے اس سلطنت کو خاص کر جرمنی اور اسپین میں اور بھی وسعت

دی۔ اطالیہ میں لمبارڈوں کو زیر کر کے شارلی من ان کا بھی بادشاہ بن گیا۔ سلطنت کے علاوہ اس نے اپنے باپ سپے پن سے یہ خیال بھی ورثے میں پایا تھا کہ پوپ کا دوست بنارہنا چاہیے اور اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اس وقت تک پوپ معزلی اور جنوبی یورپ میں مسیحی کلیسا کا صدر تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ اس خیال کے تحت شارلی من نے اپنے باپ کے عطیے کی تجدید کی اور باپائی نظام سے دوامی دوستی کا معاہدہ کیا۔ آخر کار سن ۸۰۰ء میں پوپ نے رومیوں کے شہنشاہ کی حیثیت سے روم میں اس کی تاج پوشی کی رسم ادا کی۔ اس طرح پوپ پر پھر ایک بار ایک رومی شہنشاہ مسلط ہو گیا۔ اس تسلط کو اس نے سن ۸۰۰ء تک برلے نام ایک ہزار سال تک برقرار رکھا۔

لیکن نئی رومی سلطنت پڑانی سلطنت سے بالکل مختلف تھی۔ پہلے تو یہ کہ یہ سلطنت کلیسا اور اس کے مذہب کی حمایت اور توسیع کے لیے وجود میں آئی تھی اور اسی وجہ سے وہ مقدس رومی سلطنت کہلاتی تھی۔

پوپ اور شہنشاہ میں اکثر نزاع برپا رہتی اور وہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے، لیکن اس کا اثر سلطنت کے تقدس کے نظریے پر کچھ نہ پڑتا تھا۔

دوسرے یہ کہ اگرچہ روم (جہاں شہنشاہوں کی تاج پوشی کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا) ہی برائے نام دارالسلطنت رہا، تاہم اقتدار کا مرکز ہمیشہ کوہ آپس کے شمال میں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے شہنشاہوں کو اطالیہ میں برائے نام اقتدار حاصل رہتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ من چلے شہنشاہ اطالیہ میں اپنے اقتدار کو زیادہ موثر بنانے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔

لہ آگے چل کر مشرقی سلطنت کا کلیسا، جس کا صدر مقام قسطنطنیہ تھا، مغربی سلطنت کے رومی کلیسا سے بالکل علاحدہ ہو گیا۔

اور ان کوششوں میں اطالیہ مدتوں برباد ہوتا رہا۔ نئی رومی سلطنت سے مختلف ہونے کی تیسری وجہ یہ تھی کہ شہنشاہ دراصل جرمن بادشاہ بن گیا تھا۔ سلطنت کے لیے شہنشاہ کا انتخاب ہوتا تھا اور جرمنی کے مختلف رئیس اور سردار مل کر اس کا انتخاب کرتے تھے۔ شہنشاہ بننے کے لیے یہ لوگ ایسے شخص کا انتخاب کرتے تھے جو پہلے ہی سے جرمن فرماں روا ہوتا تھا۔ شہنشاہ کے انتخاب کے بعد وہ اس کے حلیف اور عموماً سرکش حلیف بن جلتے تھے۔ اس طرح سلطنت اطالوی سے زیادہ جرمن تھی اور جاگیر کی نظام کی حیثیت سے اس میں بدترین کم زوریاں اور خرابیاں موجود تھیں۔

شارلی من کی سلطنت بہت جلد ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور ایک زمانہ دراز تک جاگیر کی نظام اس کے کھنڈروں میں بے روک ٹوک پھلتا پھوٹتا رہا۔ بڑے بڑے امیر مطلق العنان حکم ماں بننے کی ہوس اور ناجائز لوٹ مار اور ظلم و زیادتی کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو گئے تھے "اشرافیہ کی آزادی نے ہر طبقے کی قیمت میں مصیبت لکھ دی تھی۔ یہ خود ساختہ خود مسرور ظالم و تباہ کن لڑائیوں میں اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ سب سے زیادہ بدترین چیز ان کی پھوٹ اور شخصی تفوق دہرتری کے لیے ذلیل سازشوں میں ان کا انہماک تھا۔ اسی چیز نے یورپ کو غیر مہذب حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔"

چنانچہ نویں صدی میں وحشی حملہ آوروں کی ایک دوسری موج اٹھی۔ اسکنڈی نے ویا کے ڈینوں اور نارمنوں (جو بعد میں فرانس میں نارمن کہلائے) نے یورپ پر شمال سے حملہ کیا اور ادھر منگولی ہنگریوں یا میگ یارپوں نے مشرق سے حملہ کر دیا۔ اسی اثنا میں سمندری عرب حملہ آور

جنوب میں بحرہ روم کے ساحلوں کو تسخیر کر رہے تھے۔ اس لیے جب ہنری فورکر (۹۱۹ء - ۹۳۶ء) نے جرمنی کا بادشاہ بن کر وحشیوں کے حملے اور جاگیر خاند جنگی کے انسداد کی تدبیر میں اختیار کرنی شروع کیں، تو یورپ کی قومیں خوش ہو کر اس کے لیے تیار ہو گئیں۔ دسویں صدی کے وسط میں ہنری کے بیٹے آٹو اعظم نے ہنگروی حملہ آوروں کو شکست فاش دی۔ چند سال بعد وہ اطالیہ میں داخل ہوا، اور روم میں شہنشاہ کی حیثیت سے اس کی تاج پوشی کی رسم انجام دی گئی۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں، اس کے بعد سے مقدس رومی سلطنت ناقابل تفریق طور پر جرمن شہنشاہی کے ساتھ متحد ہو گئی۔ شہنشاہ جو درحقیقت جرمن تھا جرمن ہی رہا۔ اسے اور دوسرے بادشاہوں کے علاوہ اطالیہ پر بھی سیادت حاصل تھی، اور یہ اکثر حقیقی مفہوم میں کلیسا کا محافظ بھی ہوتا تھا۔

گیارہویں صدی میں ہنری سوم نے مشرق کی جانب سلطنت کو وسعت دی۔ اس کے بعد اسی صدی میں تفوق و برتری کے جھگڑے میں سلطنت پاپائی نظام کے ساتھ الجھ گئی جو پوپ گری گوری ہفتم کے ماتحت بے حد طاقت ور ہو گیا تھا۔

بارہویں صدی میں سلطنت نے اپنے تفوق اور اپنے مرتبے سے کام لے کر جرمن جاگیر نظام کی بد نظمی کو روکنے کی بڑی اچھی خدمت انجام دی۔ کچھ عرصے تک اس نے صلیبی محاربات کی تحریک کی رہبری بھی کی۔ تیرہویں صدی میں فریڈرک دوم (۱۲۱۲ء - ۱۲۵۰ء) نے عارضی طور پر بیت المقدس پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ منگول حملہ آور جنھوں نے فاتح اعظم چنگیز خاں کے جانشینوں کے ماتحت مشرقی یورپ کو تاخت و تاراج کیا تھا،

ان کے مقابلے میں سلطنت نے حصہ بھی لیا تھا۔ لیکن اس تلخ اور طویل جھگڑے میں کہ آیا پاپائی نظام کو یا سلطنت کو زیادہ سیاسی اقتدار حاصل ہو، یکے بعد دیگرے پاپاؤں کا مقابلہ کرتے کرتے سلطنت تقریباً بالکل بے جان ہو گئی تھی۔ سوٹھویں صدی میں چارلس پنجم کے عہد میں سلطنت نے پہلے تو کافی قوت حاصل کر لی تھی۔ لیکن بعد میں اسی شہنشاہ کے ماتحت فرانس کے ساتھ طویل جنگوں اور کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کی مذہبی نزاع کے تصفیے میں ناکامی کی وجہ سے سلطنت خطرناک طور پر کم زور ہو گئی۔ اسی ناکامی نے جرمنی کے جاگیریں رئیسوں کے مرہٹے کو شہنشاہ کے مرکزی اقتدار کے مقابلے میں قوی کر دیا۔ ان میں سے بہت سے رئیس تو عملاً خود مختار حکم راں بن بیٹھے۔

سترھویں صدی میں شہنشاہ نے جس کی اصلی قوت اس وقت اسٹریا میں تھی، خوف ناک تیس سالہ جنگ (۱۶۱۸ء تا ۱۶۴۸ء) میں اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو واپس لینے اور روم کی کیتھولک فریق کے حق میں فیصلہ کر کے ان مذہبی جھگڑوں کا خاتمہ کرنے کی بڑی جان توڑ کوشش کی لیکن یہ کوشش ایک تباہ کن ناکامی ثابت ہوئی۔ سوٹھویں اور سترھویں صدی میں ترکوں کے بے پناہ حملوں سے بھی سلطنت نیم جان ہو گئی تھی۔ ترکوں نے ۱۵۲۹ء میں ہیسپرگ کے شاہی خاندان کے پاسے تخت ویانا کا محاصرہ کر لیا۔ تاہم غیر متحد جرمنی کو اس تازہ ایشیائی حملے سے بچانے میں شہنشاہ نے یورپ کی سب سے زیادہ اہم خدمت انجام دی۔

مقدس رومی سلطنت کے اندر یہ خیال
 سلطنت کی خدمات | کار فرما تھا کہ بڑا عظیم یورپ کو پوپ کی روحانی

اور شہنشاہ کی دنیوی سیادت کے ماتحت ایک عالم گیر ریاست میں دوبارہ متحد کر دینا چاہیے۔ یہ تصور کسی وقت بھی شرمندہ معنی نہ ہو سکا۔ پہلے جاگیر نظام بہت زیادہ قوی تھا اور بعد میں قومیت بہت زیادہ قوی ہو گئی۔ اس کے علاوہ شہنشاہی قوت اس قدیم خانہ بدوشانہ آریائی تصور سے وابستہ تھی کہ بادشاہ یا اس صورت میں شہنشاہ کا انتخاب اس کے امیروں کو کرنا چاہیے۔ اسی تصور کی وجہ سے شہنشاہیت خود اپنے ہی مرکز میں مفلوج ہو کر رہ گئی۔

خود سلطنت کا اصلی گھر جرمنی کبھی متحد نہ ہو سکا، بلکہ بارہویں صدی کے بعد طوائف الملوکی کے گہرے گڑھے میں جا پڑا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پروٹسٹنٹ اصلاح نے جرمن رئیسوں کو مزید طاقت اور اثر دے کر اس طوائف الملوکی کو اور تقویت پہنچائی۔ چنانچہ تیس سالہ جنگ میں اسی طرز عمل کو خوب ترقی دی گئی۔ جب تک فریڈرک اعظم شاہ پروشیا کے طاقت ور ہاتھوں نے اٹھارویں صدی میں اس مقصد کو جس کے حصول کی کوشش میں بہت سے شہنشاہ ناکام رہ چکے تھے، حاصل کرنا نہ شروع کیا، اس وقت تک یہی حال رہا۔ یہ کام اس وقت تک مکمل نہ ہو سکا جب تک سلطنت میں جرمنی اچھی طرح متحد نہ کر دیا گیا۔

اگرچہ کم زور شہنشاہ جرمن جاگیری رئیسوں کی ازکار رفتہ بساط کے شاہ شطرنج بنے ہوئے تھے، تاہم طاقت ور شہنشاہوں نے اطالیہ پر اقتدار حاصل کرنے کی بے حاصل حرص کے باوجود جرمن جاگیری نظام کی بُرائیوں کی کافی روک تھام کی، اس لیے ہم انھیں سلطنت کو ایسی قوتوں میں تقسیم کر دینے میں حق بجانب ثابت کر سکتے ہیں جو یورپ کو جاگیری نظام کی وحشیانہ

گرفت سے نجات دلانے کے لیے متحد ہو گئی تھیں۔ عام طور پر طاقت ور بادشاہ اپنے بعد اپنے بیٹے کے لیے انتخاب حاصل کرنے میں کام یاب ہو سکتا تھا اور یہ واقعہ ہر کہ شہنشاہی اقتدار اکثر صورتوں میں حکم راں خاندان ہی کے کسی رکن کو عطا کیا جاتا تھا۔ اس طرح عالم گیر حکومت کے خیال کو زندہ رکھا گیا۔ سارا یورپ چانتا تھا کہ سلطنت میں ایسی قوت کو کتنی ہی بھڑی اور کم زور رہی، موجود ضرور ہو جو معمولی جاگیر جماعت کی خود غرضانہ اور کوتاہ بین ظلم و ستم کے مقابلے میں ایک وسیع اور اعلا مقصد کی پشت پناہ ہو۔ ایک دل چسپ حربہ جس کو طاقت ور شہنشاہوں نے جاگیر نظام کے مقابلے میں اس کے بدترین زمانے میں استعمال کیا، وہ ”زمین داری امن“ تھا۔ عام طور پر یہ سلطنت کے کسی خاص حصے میں خانگی جھگڑوں اور قتل و غارت گری کو روکنے کا محض ایک حکم ہوتا تھا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں دو شہنشاہوں یعنی فریڈرک ماربروسہ اور اس کے پوتے فریڈرک دوم نے ”زمین داری امن“ کے دوامی محصول عائد کر دیے اور یہ جاگیری نظام کے ظلم و ستم کے قطعی انداد کے لیے مستقل قانونی ضابطے بنا دیے گئے۔ اس زمانے میں یہ ضابطے ناقابلِ عمل سمجھے جاتے تھے، لیکن انہی قوانین نے ظلمت میں نور کی ایک کرن دکھلائی۔

ایک دوسری زبردست قوت جو جاگیری نظام کے انداد

پاپائی نظام | میں کام کر رہی تھی، قرون وسطیٰ کا کلیسا تھا۔ یہ مقدس رومی سلطنت سے کہیں زیادہ اہم اور کہیں زیادہ با اثر اور قوی تھا۔ گیارہویں صدی کے زبردست پاپائی مدبر گری گوری ہفتم کے عہد میں کلیسا تمام دنیوی حکومتوں اور فرماں رواؤں پر مذہب کی کامل فضیلت

کا حامل تھا۔ یہ کلیسا مرکزی طور پر پاپائی نظام کے ماتحت منظم و متحد کیا گیا تھا۔ گری گوری نے اپنے زمانے کے تمام فرماں رواؤں پر اپنے غیر معمولی تفوق کا یکہ بٹھا رکھا تھا۔ اس نے ہنری چہارم جیسے زبردست شہنشاہ کو کلیسائی حقوق سے محروم کر دیا، اور اس کی رعایا کو اس کے احکام کی بجا آوری سے آزاد کر کے ہنری کو اطاعت پر مجبور کر دیا تھا۔ جب ہنری معافی کا غماز گزار ہوا تو گری گوری نے اس کو ملاقات کا موقع عطا کرنے سے پہلے کیا تو اس کے ایک قلعے میں جہاں پوپ ٹھہرا ہوا تھا، انتظار کروایا۔ اس زمانے کے پوپ کی ذات میں عالم گیر فرماں روا اور بڑے سے بڑے ارضی بادشاہ سے زیادہ سلطوت و عظمت صاف طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ یہ فرماں رواں وہ تھا جو دؤر دؤر تک مذہب اور انسانیت کے احکام جبراً نافذ کر سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یورپ پھر ایک بار عالمی مملکت کے تصور کو قیام رومی فوجی استبداد کے ماتحت ہمیں، بلکہ ایک روحانی قوت کے ماتحت جو محبت اخوت اور مساوات کے مذہب کی نمایندہ تھی، حقیقت کا جامہ پہنانے والا تھا۔

پاپائی نظام عظمت کے اس منتہا کو طویل مدت تک ارتقائی منازل طو کر کے پہنچا تھا۔ پوپ اس بات کا دعوا کرتے تھے کہ سینٹ پیٹر کو حضرت عیسیٰ نے اپنے تبعین میں سب سے اونچا درجہ عطا فرمایا ہے اور سینٹ پیٹر روم کا پہلا باپ بن گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی زمانے ہی میں سلطنت روم کے بشپ یعنی پوپ کو پنچایت، مرافعہ اور سبھی روایات کی شرح و تفسیر ملے کلیسائی حقوق سے محروم کر دینے سے مراد کلیسا سے اخراج اور اس کے تمام دینی اور دنیوی فوائد سے محرومی تھی۔

کے خاص خاص اختیارات عطا کیے گئے۔ پانچویں صدی کے وسط میں لویت یہاں تک پہنچ گئی کہ شہنشاہ رومہ کو ایسے مسائل میں پوپ کے فیصلوں کو قانونی فیصلوں کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد کلیسا کی تبلیغی کوششوں میں مرکزی منتظم قوت کی حیثیت سے پوپ نے قدیم سلطنت کے وحشی حملہ آوروں اور خصوصاً انگلستان اور قدیم سلطنت کے سرحدوں سے باہر ہجرتی میں اور بھی اہمیت حاصل کر لی۔ راسخ العقیدہ فرانک بادشاہوں کے ادب و احترام اور امداد کی بدولت اس نے بڑا رتبہ پیدا کر لیا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ پوپ ہی نے شہنشاہ شارل مین کے سر پر تاج رکھا تھا۔ اس تاج پوشی سے یہ خیال قطعی طور پر قائم ہو گیا کہ پوپ کی روحانی قوت دنیا کی سب سے زیادہ صاحب جبروت مادی قوت سے بھی بالاتر ہے۔ پوپ کو شہنشاہ گزرتک بھی دیکھا گیا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وسطی اٹالیہ میں ایک سلطنت کا عطیہ پیش کرنے سے اس وقت تک پاپائی نظام بہت قوی ہو گیا تھا۔ پاپائی کی مادی قوت نے پوپ کو اپنے روحانی دعاوی کے مستحکم کرنے میں بڑی مدد دی۔ پوپ نے نام نہاد ”عطیہ قنطنین“ سے بھی جو بعد میں جبل ثابت ہوا، اپنے دعووں کو تقویت پہنچائی۔

دسویں صدی میں ائمہ میں آٹو اعظم کی تاج پوشی اور ”کلیونیا کسٹ“^۱ وسیع اصلاحی نظام سے پاپائی نظام کے اتحاد نے پاپاؤں کے وقار کو اور بھی وسعت و استحکام بخشا۔ اس اصلاحی نظام نے کلیسا کو بہت سی

۱۔ فرانس میں ”کلیون“ نامی ایک خانقاہ تھی۔ اسی کے نام پر اس تحریک کا نام رکھا گیا ہے۔

برائیوں سے پاک کرنے اور اسے ہر قسم کے دنیاوی اقتدار کے دباؤ سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ بارہویں صدی کے وسط تک یورپ کے مختلف حصوں میں کلیونک تین سو سے زیادہ خانقاہوں پر قابض تھے اور کلیسا کی کونسلوں میں ان کا اثر سب پر غالب تھا۔

گیارہویں اور اس کے بعد کی صدیوں میں مدبر پاپاؤں کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ انھوں نے اس خیال کو اہل یورپ کے دلوں میں راسخ کر دیا کہ کلیسا کا سلطنت سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ کسی مجلس میں صدر کارائین سے یا روح کا جہم سے تعلق ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اس کلیسا کا مطلق العنان صدر پوپ ہے۔ جب کبھی کوئی فرماں روا پاپائی احکام سے انحراف کی جرات کرتا تو اس کو کلیسا کے حقوق سے محروم کر کے، یا اس کے ملک میں ایک اتنا عی حکم جاری کر کے اسے مطیع کیا جاتا تھا۔ اس اتنا عی حکم کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس ملک میں کسی کو اسطباع نہیں دیا جائے گا اور کسی کی شادی بیاہ یا ہر فیمن کے مراسم ادا نہیں کیے جائیں گے۔ قرون وسطیٰ کی ذہنیت کے لیے اس کے معنی یہ تھے کہ تمام آبادی نے دوزخ میں ابدی عذاب میں مبتلا ہونے کا عظیم خطرہ مول لیا ہے۔

اس طرح کچھ عرصے کے لیے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام یورپ پھر ایک بار ایک مرکزی اقتدار کے ماتحت واقعی ایک اتحاد ملک میں مربوط ہونے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اپنی بہت سی خرابیوں کے باوجود یہ مرکزی اقتدار رحم دلانہ اور تہذیب کی جانب ترقی کرنے والا اور طوائف الملوک اور بربریت کے دور میں روشن خیال قیادت کا پشتی بان تھا۔

یہ تمنا ایک مختصر زمانے تک اور بھی درخشاں طور پر بڑھتی ہوئی نظر

آئی۔ جب محارباتِ صلیبی کے ابتدائی نظام کے لیے پاپائی صدر پر یورپ نے غیر معمولی جوش و خروش کے ساتھ لبیک کہا تھا۔ جس وقت جاگیرِ نظام کی فوجیں شمال و مغرب کے انتہائی دُور درماز حصوں اور اسی طرح زیادہ مہذب جنوب کے علاقوں سے کچھ کر جمع ہوئیں اور ایک عام جوش کے ساتھ ارضِ مقدس کی فتح کے لیے بڑھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑا عظیم یورپ پھر ایک بار ایسے حاکم کے تحت متحد ہو گیا ہے جسے زمین پر حضرت عیسیٰ کا نمائندہ ہونے کا دعوا تھا۔

لیکن محارباتِ صلیبی جو اس قدر شان دار اور **پاپائی نظام کی ناکامی** اتنے پر غلوص ایثار کے ساتھ شروع کیے گئے تھے، ان میں صرف جزوی کام یابی ہوئی۔ عیسائی فوجوں کے قائد جاگیرِ نظام کے بادشاہ تھے۔ ان بادشاہوں کی زمین کے لیے ہوس اور باہمی ناچاقیوں نے محارباتِ صلیبی کا ستیا ناس کر دیا۔ پاپائی دعاوی کو بارہویں اور تیرہویں صدی کی ابتدا میں شہنشاہوں کی شدید مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے نتیجے کے طور پر جو اطامیاں ہوئیں ان سے اطالیہ تباہ و تاراج ہو گیا۔ پوپ شہنشاہ سے، شہری امیر سے اور ایک شہر اپنے ہمسایہ شہر سے دست و گریباں ہو گیا۔ پوپ اس درجہ نیچے اتر آئے کہ انھوں نے اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے ظلم و زیادتی، دغا بازی، جاسوسی، ایذا رسانی، قتل و غارت گری کو اپنا شعار بنالیا۔ چودھویں صدی میں پوپ پوری طرح زبردست فرانسیسی بادشاہت کے قبضے میں آ گئے تھے۔ ان کا صدر مقام روم سے فرانس میں بمقام لے گنناں منتقل کر دیا گیا تھا۔ آخر کار پاپائی نظام کی انتخابی خصوصیت جو ہمیشہ انتہائی ملائمتوں کا ہدف بنی رہتی تھی، پاپائی جانشینی کے لیے نزاع کا موجب بن گئی۔

یورپ نے دیکھا کہ بیک وقت دو دود اور بعد میں تین تین پوپ ایک دوسرے پر اپنی روحانی بجلیاں گرا رہے ہیں۔

پاپائی رہ نمائی میں یورپی استحکام کی ناکامی کے ان تمام اسباب سے زیادہ اہم سبب قومی جذبہ اور قومی بادشاہت کا عروج تھا۔ پوپ ایک کم زور بادشاہ کو چھوڑ کر سکتا تھا کہ اس کے دعوے کو مانے لیکن چوں کہ ایسا کرنے سے بادشاہ کی بکلی ہوتی تھی اور بادشاہ کی بکلی سے جاگیریں امیروں کی قوت میں اضافہ ہو جاتا تھا، اس لیے قومی وقار اور قومی مرکزی حکومت کی جو خواہش عوام میں پیدا ہو چکی تھی اس کی مزاحمت ہوتی تھی۔ ایک طاقت ور بادشاہ جو اپنے امیروں کو مطیع کرتا اور قومی وقار کو بڑھاتا رہتا تھا، وہ پاپائی دعوای کو ہمدردی سے مسترد کر سکتا تھا۔ ایسا کر کے وہ اپنی رعایا سے احترام اور مقبولیت حاصل کر سکتا تھا۔ یہ رعایا وہ تھی جس میں روشن خیالی کی رفتہ رفتہ اشاعت کلیسا کے حقوق سے محرومی اور انسانی احکام کے پاپائی حیلوں کو بے اثر کر رہی تھی۔

پاپائی نظام کی خدمات | یورپ کو ایک روحانی حکومت کے ماتحت مستحکم کرنے کی زبردست کوشش میں پاپائی

نظام ناکام رہا لیکن اس میں شک نہیں کہ پاپائی نظام اور کلیسا نے جس کی رہ نمائی پاپائی نظام کرتا تھا، انسانیت پر بے حد احسانات کیے ہیں۔ ہزاروں طریقوں سے کلیسا نے جاگیریں نظام کی بے رحمی اور بے قاعدگی کا مقابلہ کیا۔ جاگیریں نظام پر حملہ کرنے کے لیے ایک ہتھیار جو خاص طور پر فرانس میں استعمال کیا گیا وہ ”صلح خاوندی“ کا ادارہ تھا۔ اس صلح کی رو سے جس پر قسم کھانے کے لیے تمام آدمیوں کو آمادہ کیا جاتا تھا، مذہبی خدمات انجام دینے والوں، کسانوں اور دوسرے نہ لڑنے والے لوگوں کا

قتل و خون منموغ تھا۔ اس میں کاشت شدہ کھیتی کو برباد کرنے، مویشی کو بھگا لے جانے اور بعض مقررہ موسموں میں جنگ کرنے کی بھی ممانعت تھی۔ اسی قنیم کے ایسے ہی اقرار نامے کے ذریعے ہر سہتے، بُدھ کی شام سے پیر کی صبح تک اور ہر سال کے بڑے حصوں میں ہر قنیم کے خانگی لڑائی جھگڑے روک دیے گئے۔^{۱۵} کلیسا کے تقدس اور اس کے اختیارات کی وجہ سے چھوٹے بڑے تمام جاگیریں سردار اپنے لٹیرے ملازموں کو لوٹ مار سے روکنے، ناجائز طور پر حاصل کیے ہوئے منافع کو واپس کرنے اور کم از کم ظاہری شائستگی اور نظم برقرار رکھنے پر ہمیشہ مجبور رہتے تھے۔ بلاشبہ صدیوں تک کلیسا ہی یورپ کے بڑے حصے میں تہذیب کی تہانہ نثانی تھی اور اسی سے تمدن زندگی کے وجود کا امکان تھا۔ اس نے تازہ حملہ آوروں، آباد کاروں اور بیرونی وحشی قبیلوں کی اخلاقی تعلیم اور مسیحی اداروں کے کام کا انتظام اپنے ذمے لیا۔ اسی کی خانقاہوں میں جہاں قدیم مخطوطوں کی نقل در نقل احتیاط و احترام کے ساتھ کی جاتی تھی، یونان اور روم کے علم و حکمت کی حفاظت کی۔ اسی کے متعلقہ مذہبی طبقہ میں تحصیل علم کی روایت ایسے وقت باقی رہی جب کہ تمام دوسرے طبقوں نے اس کو بھٹلادیا تھا اور اس کی تحقیر کرتے تھے۔ بعد میں اسی کلیسا کے سایہ عاطفت میں جامعات ظہور پزیر ہوئیں اور قدما کے علم و دانش کو پھر دن کی روشنی نصیب ہوئی۔ کلیسا کے آدمی یا وہ لوگ جنہیں کلیسا نے تعلیم دی تھی اور کلیسا کے لیے تیار کیا تھا، ان میں سے بہت سے از مذہب وسطیٰ کے بڑے بڑے سیاست بنے۔ صرف سیاست ہی نہیں بلکہ یہی لوگ تلاش حق میں، ادب قدما کو زندہ کرنے میں اور قرون وسطیٰ کے اداروں اور تصورات پر تنقید کرنے

۱۵ "قرون وسطیٰ میں یورپ"، صفحہ ۱۰۳، مصنف: ڈی وی سن۔

میں سب سے آگے آگے تھے۔ اس طرح کلیسائے یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاح میں سب سے زیادہ اہم حصہ لیا ہے۔ تحریک اصلاح وہ زبردست تحریک ہے جسے جدید یورپ کی قرونِ وسطیٰ سے تبدیلی کی نمایاں حد فاصل کہا جاسکتا ہے۔

بچے بعد دیگرے صدیوں تک جاگیرِ نظام کے تشدد اور طوائفِ الملوکی کے زمانے میں کلیسائے ہزاروں محترم اور ایثار پیشہ مرد اور عورتیں پیدا کیے اور مسلسل خاموش طریقے پر ہدایت اور اصلاح کا کام جاری رکھا۔ اپنے اسی طرزِ عمل سے کلیسائے بربریت کو رحم و کرم کی غویہوں اور اغوت کے مقدس قانون کے آگے اپنا سر نیازِ زخم کرنا سکھایا جو جاگیرِ نظام کی بے رحمی اور خود غرضی سے کوسوں دور تھا۔

اگرچہ پاپائی نظامِ یورپ کو اپنی قیادت میں دوبارہ متحد کرنے کی کوشش میں ناکام رہا، تاہم اس نے جاگیرِ نظام کو قابو میں لانے اور لوگوں کو ظلمت اور بربریت سے نکلانے کی جو کوشش کی، اس میں اسے زبردست کامیابی ہوئی۔

ایک دوسری موثر قوت جو جاگیرِ نظام کی طوائفِ الملوکی کو روکنے کی باعث ہوئی، وہ قرونِ وسطیٰ کے قصبے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جاگیرِ نظام کی سماجی تنظیم میں قصبوں کے باشندوں کی کوئی حقیقی جگہ نہیں تھی، سوائے اس کے کہ زرعی غلاموں کی طرح جاگیری لارڈ کے ماتحت اس کی زمین میں بستے تھے۔ تاہم جیسے ہی وحشی آباد ہو گئے، اور تجارت اور صنعت و حرفت ترقی کرنے لگی، باشندے زیادہ سے زیادہ مال دار ہونے لگے۔ بعض وقت جاگیرِ قصبوں کے "لارڈ" کو رپڑ کی شدید ضرورت ہوتی تھی کیوں کہ

فوجوں کو ہمیشہ رکھنے کے لیے کثیر مصارف درکار ہوتے تھے اور جاگیریں جنگلوں کے لیے فوجوں کو تیار کرنا کثیر نقد رقمی مطالبوں کا موجب ہوا کرتا تھا۔ اس طرح اپنے باشندوں سے فرض لے کر ضرورتیں پوری کرنے کے لیے لارڈ خوشی سے تیار ہو جاتے تھے۔ اس کے معاوضے میں لارڈ باشندوں کو ایک منشور یعنی ایک ایسی دستاویز عطا کرتا تھا جس کی رؤسے یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ قصبے کو بعض معین حقوق اور آزادیاں دی گئی ہیں۔ بہت سے موقعوں پر ایسا بھی ہوا کہ جہاں مرکزی بادشاہت قوی ہوتی وہاں ایسے منشور راست بادشاہ سے خرید کیے جاتے تھے۔

قرون وسطیٰ میں مشرق سے راستوں کا انتہا شمالی اطالیہ اور شمالی جرمن قصبوں میں تھا۔ اس کی وجہ سے یہ قصبے بے انتہا مال دار ہو گئے تھے۔ اسی طرح مندرلینڈ کے باشندوں نے بھی ابتدائی زمانے ہی سے تجارت اور صنعت و حرفت میں قابل تعریف مہارت پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ ان علاقوں میں بہت سے قصبے اس قدر دولت مند ہو گئے تھے کہ وہ تقریباً اپنی پوری آزادی خرید لینے کے قابل تھے یہی وجہ ہو کہ یہ آزاد قصبے مشہور ہیں۔

دوسرے مقاموں پر بھی شہری متعدد خاص حقوق اور مراعات خرید

لے قرون وسطیٰ میں ایشیا کو جانے والے دو اہم راستے تھے۔ شمالی راستہ دریائے وولگا اور وہاں سے بحیرہ بالٹک کے ساحل تک جاتا تھا۔ سنہ ۱۲۷۱ء سے لگ بھگ شمالی جرمنی اور بالٹک کے اسٹی شہر زبروست "ہاں سی ٹی لیگ" میں متحد ہو گئے تھے تاکہ اس راستے کے ساتھ ساتھ اور دوسری تجارتوں کو اپنے قبضے میں رکھیں۔ جنوبی راستہ بحیرہ ارجنٹین فارس تک جاتا تھا۔ یہ راستہ خشکی میں مشرقی بحیرہ روم کی بندرگاہوں اور وہاں سے دیش، چین اور دوسرے اطالوی قصبوں کو جاتا تھا۔

رکھتے تھے۔ مثلاً انھیں اس بات کی اجازت دی جاتی تھی کہ وہ اپنے لارڈ کی زمین پر زرعی خدمت انجام دینے کی بجائے اسے حیرف نگانہ ادا کر دیا کریں۔ دوسرے یہ کہ انھیں اجازت دی جاتی تھی کہ وہ ہاٹ اور بازار قائم کریں اور وہاں جو جھگڑے ہوں، انھیں تھپے کے لیے لارڈ کی عدالت میں پیش کرے کی بجائے خود ہی آپس میں ان کا فیصلہ کریں۔ اس کے بعد ان تاجروں کو اپنی ایک انجن بنانے کی اجازت دی گئی۔ اس انجن میں تھپے کے ممتاز تاجر شریک کیے جاتے تھے۔ اس کو تجارتی انتظامات کی غرض سے وسیع اختیارات دیے گئے تھے۔ اس کے بعد صناعتوں کی انجنیں بننے لگیں اور صنعت و حرفت کے ہر شعبے میں کام کرنے والوں کی الگ الگ جماعتیں پیدا ہو گئیں (مثلاً شناروں کی انجن، جلاہوں کی انجن، نان بائیوں کی انجن) ان انجنوں کو اوقات کار کے تعین، کام کی درجہ بندی اور کام سیکھنے والوں کی تعلیم کے انتظام اور ایسے ہی دوسرے کاموں کا اختیار حاصل تھا۔ اس طرح یہ طریقہ عمل روز بروز آگے بڑھتا رہا۔ موقع ملنے پر انفرادی طور پر حقوق خریدے جاتے رہے اور اس وقت تک یہ طریقہ جاری رہا جب تک کہ تمام اہم مشوروں کی ضمانت پر ایک ٹھوس اور حقیقی آزادی حاصل نہ کر لی گئی۔

محارباتِ صلیبی کے طوفانی زمانے نے قصبوں کی ترقی اور مشوروں کے حصول میں بڑی تیزی پیدا کر دی۔ محارباتِ صلیبی کا زمانہ وہ ہے، جبکہ یورپ کے ہر ملک کے جاگیردار امیروں کو ارض مقدس کے لیے فوجیں روانہ کرنے کے لیے رپے کی شدید ضرورت تھی۔ اس کے بعد امیروں کے قدیم مرض یعنی طلبِ لڑنے نے نہ صرف مشوروں کی فروخت کو فروغ دیا بلکہ بعض ملکوں میں زرعی غلاموں کی آزادی کا اولین سبب بھی یہی ہوا۔ ان غلاموں کو اس بات کی

اجازت تھی کہ وہ اپنے لارڈ کی زمین داریوں میں قدیم جبری طریقہ پر کام کرنے کی بجائے زرندگان ادا کیا کریں۔ انگلستان میں بہت سے ایسے کاشت کار اپنے پاس اپنے لارڈوں کے معاہدوں کی نقلیں رکھتے تھے، جن کی رؤ سے ان کے کھیت ان کو عطا کر دیے گئے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے یہ لوگ ”نقل دار“ کہلاتے تھے اور ایسی نقلوں کو کانوں کا نشور کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں جب کہ اطالیہ میں شہنشاہ اور اس کے مخالفوں میں سخت لڑائیاں ہو رہی تھیں اور اسی عہد میں جب کہ فرانس اور انگلستان سو سالہ جنگ میں الجھے ہوئے تھے، جاگیر مراعات کے فروخت کا طریقہ برابر ترقی پذیر رہا۔ اور اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ تقریباً ہر ایک بڑے قصبے کو اس کا نشور حاصل نہ ہو گیا۔

شہری پنچائیتیں | قرون وسطیٰ کے آخری زمانوں میں بہت سے بڑے بڑے شہروں کے اندر ایک طرح کی خود اختیاری جمہوری حکومت نے جگہ لینی شروع کی۔ یہ طرز حکومت دیکھنے والوں کو شہریت کے ساتھ یونانی شہری ریاست کی یاد دلانا تھا۔ وہ طریقہ جس سے ایسی جمہوریت قائم ہوتی تھی، عام طور پر ایک ”شہری پنچایت“ کا قیام تھا۔ یہ شہریوں کی ایک جماعت ہوتی تھی۔ اس کا کام اپنے جاگیری حاکموں کے ستم بے جا کی ممانعت کرنا اور شہر میں ایک جمہوری طرز کی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس کے لیے بار بار یہ قانون بنایا جاتا تھا کہ جو شخص اس شہری پنچایت کا رکن نہ ہو وہ شہر میں بھی نہ رہے۔

ان شہری پنچایتوں کو اپنی بقا کے لیے اکثر جان توڑ کوششیں کرنی پڑیں تھیں کیوں کہ جاگیری نظام کے ظالم لارڈوں کے نزدیک یہ نہایت نفرت

تھیں۔ اس کش مکش میں شہریوں نے آزادی کی محبت اور مساوات اور رفاه عام کے تصورات کو خوب ترقی دی۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پریکٹس کے زمانے کی حقیقی اینٹھنری جمہوریت نے پھر سے نیا جنم لیا ہے۔ مثلاً شمالی اطالیہ کے شہروں کو ہم نہ صرف "متوسط اطالوی طبقوں اور ایک مخصوص بے قانون قسٹم کے جاگیر نظام کے درمیان ایک حد فاصل بناتے" بلکہ بعض وقت انھیں بے انتہا ہمت و جرأت کے ساتھ کسی بیرونی قبضے کی کوشش کا مقابلہ کرتے دیکھتے ہیں۔ بارھویں صدی میں جب شہنشاہ فریڈرک باربروسہ نے اطالیہ میں حقوق سلطنت کی توسیع اور اس کی قانون بندی کرے کی کوشش کی اور اس روح آزادی کو کچل دینا چاہا جو قصبوں میں پہلے ہی سے طاقتور ہو چکی تھی تو اس کو میلان اور کرسیمائی شہری پنچایتوں کی شدید مزاحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ شہنشاہی فوجوں نے ان دونوں قصبوں کا محاصرہ کر کے انھیں تباہ کر دیا، لیکن آزادی کے لیے ان کی یہ جدوجہد شمالی اطالیہ کے شہروں کی "لمبارڈ لیگ" کی تشکیل کی صورت میں رنگ لائی۔ اس لیگ نے لگاتار کی زبردست لڑائی لڑا، یہیں شہنشاہ کی فوجوں کو فاش شکست دے کر شہنشاہ سے بہت کچھ خود مختاری چھین لی۔

بارھویں صدی کے اختتام پر فلانڈرس میں بھی چالیس دولت مند شہری پنچائیتیں تھیں۔ ان کا دار مدار زیادہ تر بیرونی بازاروں کے لیے اپنی صنعت و حرفت میں مہارت پیدا کرنے پر تھا۔ فلانڈرس کے باشندوں نے اپنے جاگیر لارڈ کاؤنٹ آف فلانڈرس کے مظالم اور شاہانِ فرانس کی دست درازیوں کے مقابلے کے لیے ایک سخت جنگ کی۔ کوٹ رائی کی جنگ (۱۳۸۰ء) میں انھوں نے دنیا کو پھر ایک بار دکھا دیا کہ آزادی کے نئے

سے سرشار ہو کر شہریوں کی فوج ایک جاگیری فوج کو کھلے میدان میں کس طرح مار بھگا سکتی ہو۔

فرانس اور انگلستان میں یہ قصبے خاص کر اشرافیہ کے مقابلے میں بادشاہ کے حلیف بن کر طاقت ور ہو گئے اور ایک مستحکم قومی بادشاہت کے ارتقا میں ان کی حمایت نہایت بیش قیمت ثابت ہوئی۔ فرانس میں آخر کار شہری پنچایتوں کو اس طرح زمین کا لگان دار تسلیم کر لیا گیا کہ زمین راہ براست بادشاہ سے ان کے قبضے میں دی گئی ہو، اور بادشاہ کی مرضی سے ان سے زمین لگان اور فوجی خدمات لی جا سکتی ہیں۔ شہری پنچایتوں کا مراعات یافتہ مرتبہ اور بادشاہت سے اس کا اتحاد جاگیری اشرافیہ کے لیے ایک مستقل اور قوی خطرہ بن گیا۔ آئندہ جیسے جیسے بادشاہت قوی ہوتی گئی اور قصبے باہمی ناچاقیوں سے کم زور ہوتے گئے، بہت سے فرانسیسی شہروں نے اپنے نشور کھو دیے اور بادشاہ کی استبدادی حکومت کے ماتحت آگئے جو اس کے شاہی کمشنروں کے ذریعے سے کی جاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر اوقات شہریوں نے اس تغیر کو پسند کیا ہو گا کیوں کہ اس نے ان تمام تباہ کن اور دائمی جماعتی لڑائیوں کا خاتمہ کر دیا، جن میں یہ شہری پنچائیتیں مبتلا رہتی تھیں۔ انگلستان کے اندر گیارہویں صدی میں نارمن خاندان کے بانی ولیم فاتح کی مطلق العنان اور استبدادی حکمت عملی نے تاج کو اور دوسرے مقامات کی بہ نسبت سب سے زیادہ قوی بنا دیا تھا۔ انگلستان کو اس کی دوری اور اس کے سب سے الگ تھلک ہونے نے اس کو مفلس بنا رکھا تھا۔ اس لیے انگلستان کے قصبے بھی عرصہ دراز تک نسبتاً چھوٹے اور غیر ترقی یافتہ رہے۔ اگرچہ مناواں اور تاجروں کی جماعتوں کی اعلا تنظیم کی گئی تھی، پھر بھی یہاں حقیقی شہری

پنچایتوں نے یقیناً کبھی فروغ نہیں پایا۔ لیکن تیرھویں صدی میں پارلیمنٹ کے عروج نے انگریزی شہروں کو سیاسی اہمیت دلادی۔ ۱۳۶۵ء میں پہلی مرتبہ ان شہروں کے نمائندے اور ان کے ساتھ ہر ضلع سے دو دو مائٹ طلب کیے گئے تاکہ وہ انگلستان کے باغی گورنر ارل سائمن ڈی ہاں فورٹ کو محاصل کے ذریعے رقمی امداد نہ دیں۔ اس طریقے کو شاہ ایڈورڈ اول نے ۱۳۹۵ء میں باضابطہ اور مستقل کر دیا، اور اس وقت سے پارلیمنٹ کی قوت کے ساتھ ساتھ قصبوں کی قوت بھی بڑھتی گئی۔

اس طرح یورپ کے بہت سے حصوں میں عین عام جاگیرى طوائف الملک کے زمانے میں بھی قصبے ترقی کر کے تجارت اور دولت کے مرکز بن رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ بادشاہوں اور بیرونوں سے اپنے منشور خرید رہے تھے، شہری پنچائیتیں قائم کر رہے تھے، اپنی خاص عدالتوں میں مقدموں کا فیصلہ کر رہے تھے اور خود اپنے منتخب کیے ہوئے عہدے داروں کے تحت آزاد اور قومی جذبے کی حامل بلدی زندگی کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ جاگیرى جنگیں جتنی زیادہ شدید ہوتی گئیں، اتنے ہی زیادہ قصبے ترقی کرتے گئے کیوں کہ بیرونوں کو رپڑ کی جتنی زیادہ ضرورت ہوتی، اتنے ہی وہ زیادہ منشور عطا کرنے پر راضی ہو جاتے تھے۔

لیکن قرون وسطیٰ کے شہر اور خصوصاً شہری پنچائیتیں قصبوں میں نفاق اپنے معائب و محاسن میں یونانی شہری ریاست سے مشابہ تھیں۔ آزادی کے معنی جماعتی دشمنی اور نفاق کی لڑائی کے سمجھے جاتے تھے۔ ایک دوسرے کو مدد دینے کے لیے یہ شہر بہت کم آمادہ ہوتے تھے۔ ان کے مشترکہ دشمن یعنی جاگیرى بیرون ان کے کسی ہمسایہ شہر پر حسرت

انھیں رشک و حسد ہوتا، حملہ آور ہوتے تو یہ ان سے ساز باز کر لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جیسے جیسے قومی بادشاہتیں طاقت ور ہوتی گئیں ویسے ہی قصبوں کی آزادی بھی رفتہ رفتہ سلب ہوتی گئی۔

اطالیہ میں شہروں نے یونانی آزادی کی ایک دوسری صورت میں پیروی کی کیوں کہ اندرونی نفاق نے چھوٹے چھوٹے استبدادیوں اور ظالموں کو اُبھرنے کا موقع دے دیا تھا۔ اگرچہ ان کی حکومت بعض وقت شان دار اور مقبول رہی، تاہم یہ ویسی ہی استبدادی حکومتیں تھیں جیسی کہ ان کے پیش روؤں کی۔ اطالوی قصبوں میں استبداد کا سیلاب متقل طور پر بڑھتا ہی گیا، یہاں تک کہ پندرھویں صدی میں صرف ویش ہی میں جمہوری ادارے باقی رہ گئے۔ اس کے بعد خود ویش کو ایک قریبی اور استبدادی حکومت کے تسلط میں آنا پڑا۔

تاہم نفاق اور ظلم و ستم میں بتلاسنے کے بعد ان اطالوی شہروں نے بربریت کے تاریک زمانوں کے بعد یونانی جمہوریت اور یونانی خود مختاری کے احیا کی عملی مثال دنیا کے آگے پیش کی ہو۔ اس طرح آزادی کا خمیر غیر محسوس طور پر اپنا کام کرتا رہا۔ اس کے علاوہ یہ آزاد اطالوی شہر ایٹھنز کے عہدِ نوزی کی طرح فنون لطیفہ اور ادب کے گہوارے بن گئے تھے۔ استبدادی ظالم حکمران یونانی استبدادیوں کی طرح شاعروں، مصوروں اور تعمیر کاروں کی فیاضانہ سرپرستی کرتے تھے۔ اس طرح فنون لطیفہ کی اعلیٰ قابلیتوں کی حیرت انگیز بیداری کا راستہ تیار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نشاۃ ثانیہ میں تحصیل علم کا احیا ہوا۔ نشاۃ ثانیہ کے کام کے دوران میں مشہور ترین نام فلارنس کے ایک بہت بڑے شاعر دان تھے

(۲۶۵ء، ۳۲۱ء) کا ملتا ہوا۔

جاگیری نظام کے زوال کا دوسرا اہم سبب
لڑائی کے جدید طریقے جاگیری طریقہ جنگ کا ناکارہ ہونا تھا۔

جاگیری نظام کی فوج میں ہر بڑا بیرن خود اپنے دستے تیار کرتا، ان کے لیے ہتھیار مہیا کرتا اور خود ہی ان کا خرچ اٹھاتا تھا۔ یہ بیرن ایک مقررہ مدت تک خدمت انجام دینے پر مجبور تھے۔ مثلاً انگلستان میں یہ مدت سال کے دوران میں چالیس دن تھی۔ اگر مالی غنیمت اور خود اپنی ذات کے لیے نئی جا پیدا دیں حاصل کرنے کے مواقع کافی دل کش نہ ہوتے تو خدمت کی مقررہ مدت ختم ہوتے ہی یہ بیرن عموماً اپنے فوجی دستوں کو برخاست کر دیتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خواہ بادشاہ نے کیسی ہی لڑائی چھیڑ رکھی ہو، وہ ایک شرمناک اختتام کو پہنچ جاتی تھی۔

چنانچہ نظام جاگیری کے ہر طاقت ور بادشاہ کو یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنے جاگیرداروں سے فوجی دستوں کی بجائے نقد رقم لیا کرے۔ عام طور پر بیرن بادشاہ کی اس خواہش پر رضامند ہو جاتے تھے۔ کیوں کہ بادشاہ کی فوجی خدمت ایک ناپسندیدہ بوجھ اور غلامی کا طوق سمجھی جاتی تھی۔

اس طرح بیرنوں کو بڑی بڑی رقموں کی فراہمی کی جو ضرورت پیش آنے لگی، اس سے تھبوں کو ان کے منشور اور زرعی غلاموں کو ان کے ٹھیکے دلانے میں مدد دی۔ اس نظام کے ماتحت بادشاہ کو جو رقیس ملتی تھیں، ان سے بادشاہ نے تنخواہ یا ب فوجیں ملازم رکھیں۔ اب چون کہ بادشاہ ان کو تنخواہ ادا کرتا تھا، اس لیے وہ بیرنوں یا بیرنوں کے لگان داروں سے زیادہ بادشاہ کی اطاعت کرتے تھے۔ اس طرح یہ نئی فوجیں لڑائی میں

بہت زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھیں اور یہ باتریت یافتہ اور غیر آراستہ جاگیر کی صف آرائی سے کبھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ بادشاہوں کی قوت بڑھتی رہی اور سیرنوں کی قوت گھٹتی گئی۔ یہ تمام عمل ایک ایسی ہی تحریک کی محض نقل تھی، جو ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں پہلے آریا حملہ آوروں کے قیام پذیر ہونے کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھی۔ اور جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہو۔

اس کے بعد طریقہ جنگ اور آلات حرب کے استعمال میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح لمبارڈ لیگ کی فوجوں نے لگ ناؤ کے میدان میں فریڈرک باربروسہ کو شکست ناش دی اور کس طرح فلیسی شہروں کے باشندوں نے فرانز کے بادشاہ کی جاگیر کی فوج کو کوٹ رائی کے مقام پر کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس آخر الذکر لڑائی کے بعد ہی سوئزر لینڈ کے جفاکش پہاڑیوں نے آسٹروی ہیسپرگ خاندان کے جاگیر کی لارڈوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ چنانچہ ہیسپرگ خاندان کے لارڈ ایک زبردست فوج لے کر باغیوں کی سرکوبی کے لیے پہاڑوں میں پہنچے۔ ارٹ گارن (۱۳۱۵ء) کے مقام پر سوئزر لینڈ کے باشندوں نے اچانک ایک نعرہ لگایا اور گنجان صفوں پر کثرت سے چٹانیں اور پتھر لڑھکائے شروع کیے۔ سنگین کلہاڑیوں سے انھوں نے دشمن کی زبرہوں کو پارہ پارہ کر دیا اور ایسی برچھیوں سے ضربات لگائے اور انھیں سینوں میں پیوست کر کے لگے۔ ہلکی سی کپڑے سے لٹکے ہوئے گھوڑوں کی نقل و حرکت میں دشواری پیدا ہو گئی۔ بہت سے گھوڑے جھیل میں کود پڑے اور بقیہ تمام بھڑک اٹھے۔ آخر کار پوری سوار فوج کے قدم اکھڑ گئے اور وہ یک بیک عقبی پیدل فوج پر آ پڑی۔ ملک کی طبعی حالت اس بات کی اجازت نہیں

دیتی تھی کہ پیدل فوج کی صفیں کھول دی جاتیں اور انھیں پھیلادیا جاتا رہنا چاہیے۔ اس پیدل فوج پرستے بھڑکے ہوئے گھوڑوں کا یہ دستہ گزر گیا، جس سے آدمی روئندے اور مارے گئے۔“ لہ

یہ فیصلہ کن فتح جسے شہر دیوں نے نہیں بلکہ کسانوں نے اپنے قدیم ظالم جاگیر رتیسوں کے مقابلے میں حاصل تھی، بہت ہی زیادہ اہم ہے۔ اس نے نہ صرف یورپ میں دور دور تک جاگیریں مضالم کی عمارت ہلا دی، بلکہ اس نے ایک کسان ریاست کے لیے حقیقی آزادی کے جنم لینے کی داغ بیل ڈال دی۔ پٹناں چہ ہیسپرگ سونز کسانوں کی لیگ کو پھر فتح کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ مارٹ گارٹن کی لڑائی کے ستر سال بعد ۱۸۶۷ء میں سم پانچ کے مقام پر ایک دوسری یادگار لڑائی میں ان کی آزادی کو پامال کرنے کی ایک زبردست کوشش کو سونزستانیوں نے شکست دے دی۔ اس لڑائی میں دکنل رائٹ کے بہادر آرنالڈ نے اپنے سینے پر سینکڑوں برچھیوں کے خنجر کھا کر سونزستانی نیزہ برداروں کے لیے جاگیریں صفوں کے اندر راستہ پیدا کر دیا تھا۔ اس دوران میں نیزے سے بھی کہیں زیادہ موثر ہتھیار یعنی

تیراندازی

تیراندازان ایجاد ہوا۔ اس کے ذریعے ایک زبردست اور پوری طرح تربیت یافتہ کسان فوج اپنی حسب مرضی مناسب دوری سے جاگیریں سوار فوج کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ماہر تیرانداز شاہ بلوط کے چار انچ دبیز دروازے میں سوراخ کر سکتا ہے اور اس کے تیر چار سو گز تک جا سکتے ہیں۔ یہ بات بہت جلد واضح ہو گئی کہ ایسے خطرناک ہتھیار سے آگے جاگیریں طریقہ جنگ بالکل بیچ ہیں۔ کرپسی کی جنگ (۱۸۷۷ء) کو

بڑی اہمیت حاصل ہو، کیوں کہ اس میں فرانس کی شان دار جاگیر فوج اس سے تعداد میں کہیں کم انگریز کسانوں کے مقابلے میں جو تیر و مکان سے مسلح تھے۔ تقریباً بالکل بے بس ثابت ہوئی۔ کر تیزی کی لڑائی کے چھو سال بعد مائٹرس کی جنگ (۱۸۵۶ء) نے بھی یہی سبق دیا۔ اس لڑائی میں جاگیر امیروں اور انگریز تیر انداز کسانوں کے درمیان ایک خوف ناک نوحہ ریزی کے بعد انگریزوں نے خود شاہ فرانس اور اس کے بہت سے بیرونوں کو قید کر لیا۔ اس کے بعد آگن کورٹ کے مقام پر ۱۸۵۷ء میں فرانس کی تیس ہزار طاقتور جاگیر فوج نے پانچ ہزار انگریزوں کے مقابلے میں اس سے بھی زیادہ تباہ کن اور شرم ناک ہزیمت اٹھائی۔ اس روز خوب بارش ہو رہی تھی اور زمین نرم ہو گئی تھی۔ وزنی ہتھیار اور زرہ بکتر پہنے ہوئے نائیٹ کچھڑیں بڑی طرح پھنس گئے۔ ان پر تیروں کی بوچھاڑ ہوئے لگی۔ بہت سے مارے گئے۔ ان کے سروں پر خوب مار پڑی اور یہ گرفتار کر لیے گئے۔ آٹھ ہزار سے زیادہ فرانسیسی مارے گئے اور پندرہ سو نائیٹ اور امیر قید کر لیے گئے۔

اب یورپ پر یہ اچھی طرح واضح ہو گیا تھا کہ میدان جنگ میں جاگیر امیر کسانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، جن سے وہ نفرت کرتے اور ان کی جانبدارانہ لوٹا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد جنگوں میں بارود کے استعمال اور آتشیں آلات سے مسلح تربیت یافتہ فوجوں کی ترقی نے یہ سبق اور بھی زیادہ قطعیت کے ساتھ ذہن نشین کر دیا۔ جب مغرور بیرٹوں اور نام آور نائیٹوں کو جو اپنی بڑی بڑی زمین داریوں کے بالکل مطلق العنان حاکم اور ایک درجن نسلوں سے اشرافی مراعات کے وارث ہوئے تھے، انھیں ادنا سے ادنا زرعی غلام دغا اور فریب سے بہت دور سے تیر یا بندوق کا نشانہ بننے لگا

تو قدیم جاگیرى اقتدار بڑى طرح فنا ہوئے لگا۔

انگلستان میں اشترافىہ نے روزكى جنگوں میں جو پندرہویں صدى كے نصف آخر تک جارى رہى، خود اپنے پتیر پر آپ ہى كلبھاڑى مارلى۔ ان جنگوں میں بہت سے امیر مارے گئے، اور جو بچ رہے وہ اتنے مفلس اور كم زور ہو گئے تھے كہ مشہور ٹیوڈر خانہ ان كے ماتحت بغیر كسى دقت كے ایک طاقت ور قومى بادشاہت قائم ہو گى۔

فرانس میں سولھویں صدى كے دوران میں مذہبى جنگوں نے بھى یہى اثر دکھایا۔ لیكن اس ملك میں اشترافىہ كو انگلستان كى بہ نسبت كسانوں پر بہت زیادہ اقتدار حاصل رہا۔

بادشاہت حقیقى جاگیرى نظام كے بادشاہ كو اپنے خانہ بدوش قبیلے كے پیش روں كى طرح امیر ہى منتخب كرتے، اسے مشورہ دیتے اور بڑى حد تک اس پر نگرانى ركھتے تھے۔ نقل وطن اور حملوں كے عہد كے یہ امیر بڑے بڑے خانہ دانوں كے سردار اور بادشاہ كے مصاحب ہوتے تھے۔ قبیلے جب اپنے مفتوحہ ملكوں میں آباد ہو گئے تو ان امیروں كو بڑى بڑى جاگیریں عطا كى گئى تھیں۔

ایسے ملكوں میں جہاں ان بڑے امیروں كى جاگیریں مفتوحہ ملك میں چھوٹے چھوٹے ملكروں پر بھىل ہوئى تھیں، وہاں كسى بیرن كے لیے یہ ممكن نہ تھا كہ وہ بادشاہ كے مقابلے میں خود مختار حاكم بن بیٹھتا۔ ایسى صورت بہت بڑى حد تک انگلستان میں پیش آئى۔

اس كے بعد تنخواہ یاب فوجوں كى ترقى اور امیروں كے خلاف عوام كے ساتھ بادشاہ كے اتحاد نے بادشاہت كو بہت زیادہ طاقت ور بنا دیا۔

عام رعایا کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ ”اچھی حکومت دراصل ایک طاقت ور اور عوام کی حامی بادشاہت کا دوسرا نام ہے۔“ لوگوں نے محسوس کیا کہ بادشاہ ان کا دوست ہے اور موروثی امیر اپنے ظالمانہ جاگیري حقوق کے ساتھ ان کے دشمن ہیں۔ طاقت ور بادشاہ نہ صرف بیرون کی زیادتیوں اور ظالمانہ خود غرضیوں کا انداز کرتا تھا بلکہ وہ جاگیري عدالتوں کے سن مانے اور بے اصول قانون کی جگہ ایک با اصول قانون اور عدل کا طریقہ عائد کرتا تھا۔ اس کی دیکھ بھال اور انتظام خود اس کے مقرر کیے ہوئے عہدہ دار اور دورہ کرنے والے منصف کیا کرتے تھے۔ ایسے منصف انگلتان میں ”شریف“ کہلاتے تھے۔ ”بادشاہ کا وجود انصاف کرنے کے لیے اور اپنی رعایا کے ہر شخص کی حفاظت، اور شخصیتوں کا لحاظ کیے بغیر قانون استعمال کرنے کے لیے تھا۔“

قرون وسطیٰ کے بادشاہ نے پولس اور عدالت کے عہدے داروں کے علاوہ مالیے کا مرکز بھی قائم کیا۔ عدالت اور مال کے نظم و نسق کے ان ہی دو بنیادی اصولوں سے موجودہ انتظامی حکومت کا نظام وجود میں آیا ہے۔

وسطی اور مشرقی یورپ اور خصوصاً مقدس رومی سلطنت کے شہنشاہوں اور پولینڈ کے بادشاہوں کے معاملے میں انتخابی بادشاہت کا اصول مستقل طور پر قائم رہا۔ اس طرح جرمنی اور اس کے آگے کے ملکوں میں مرکزی بادشاہ کا اقتدار نسبتاً کم زور اور جاگیري اشرافیہ کا اقتدار قوی تھا۔ لیکن مغرب میں بہت جلد بادشاہوں اور عوام کو معلوم ہو گیا کہ موروثی جانشینی کا اصول ناگزیر ہے۔ کیوں کہ نزاعی انتخاب کے خطرات، انتخاب کر سنے والوں کے ساتھ بیرونی مداخلت، اور ایک فرماں روا کی موت اور اس سے جانشین کے انتخاب کے

درمیانی وقفے کے زمانے میں طوائف الملوکی کے موقعوں نے انتہائی طریقہ عمل کو بالکل ناکارہ کر دیا تھا۔ دوسری طرف اشرفیہ کی عام خواہش تھی کہ انتخابی طریقے کو جاری رکھا جائے، یا اسے دوبارہ قائم کیا جائے، کیوں کہ اس سے بہت زیادہ اقتدار اور اعزاز خود انھی کے قبضے میں رہتا تھا۔

قانون وسطی کے اختتام کے قریب بیرون کی سخت مخالفت کے باوجود موروثی بادشاہت عوام کے اتحاد کے ساتھ انگلستان، فرانس، اور اسپین میں ایک طاقت ور مرکزی حکومت بن گئی۔ دوسری طرف جرمنی میں تین سو نیم خود مختار جاگیر ریاستیں تھیں، جن کے حکمران اپنے منتخب کردہ شہنشاہ کے برائے نام ماتحت تھے۔ پولینڈ میں امرا بالکل خود مختار تھے۔ ابھی تک اطالیہ بہت بڑی طرح منقسم اور زیادہ تر بیرونی ریسوں کے زیر اقتدار تھا۔

ہیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ طاقت ور بادشاہت کی ترقی ہر جگہ

پارلیمنٹ | یکساں طور پر جاری تھی۔ خود مغربی یورپ کے ملکوں میں

بھی یہ بات نہ تھی۔ ایسے بھی دور آئے جب کہ اشرفیہ بادشاہ کی کم زوری سے قائم رہا، یا موروثی جانشینی میں رخنہ پکڑا، وقتی طور پر پوری طرح غالب ہو جاتے تھے۔ لیکن اشرفیہ امیر ہمیشہ آپس میں لڑ پڑتے تھے اور اس طرح شہریوں اور عوام کی مدد سے بادشاہت اپنا مرتبہ اور اقتدار واپس لے لینے میں ہمیشہ کام یاب رہتی تھی۔ بادشاہت اور اشرفیہ کے درمیان اس کشمکش کا ایک نہایت اہم سبب پارلیمنٹ کا عروج تھا۔ یہ مجاہدیں ابتدائی آریا قبیلے کے اجتماعات سے براہ راست تعلق رکھتی تھیں۔ ان اصطلاحات کی زبان میں جو انگلستان میں استعمال ہونے لگیں، ایک طرف ”دارالامرا“ تھا۔ یہ ”کونسل آف ریلڈرس“ کے مماثل تھا جو بادشاہ کو مشورہ دیا کرتی تھی۔

دوسری طرف ”دارالعوام“ تھا۔ اور یہ تمام لوگوں کی مجلس ہوتی تھی۔ ان لوگوں کو بادشاہ اور رٹورس کسی ایسے مسئلے کے تقصی کے لیے طلب کرتے تھے جو پوری جماعت کے لیے اہمیت رکھتا تھا۔ جاگیرى نظام کے زمانے میں صدیوں تک عام مجلس ہنگامی ہوا کرتی تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، انگلستان میں ارل سائمن ڈی ماں فورڈ اور شاہ ایڈورڈ اول نے رُپیہ فراہم کرنے کے لیے اس اصول میں ترمیم کی تھی۔ فرانس میں ”ستیری اسٹیٹ“ فرانیسی میں ”عوام“ کا دوسرا نام (کوشاہ فلپ ہفتم نے سن ۱۳۱۴ء میں پاپائی نظام کے خلاف امداد حاصل کرنے کے لیے طلب کیا تھا۔

انگلستان میں بادشاہوں کی قابلیت نے پارلیمنٹ کی ترقی اور اقتدار کے لیے زمین تیار کر دی تھی۔ بادشاہوں نے یہ قابلیت چھوٹے زمین داروں اور بڑے بڑے شہریوں کو عدلیہ اور مالیہ کے نظم و نسق میں حصہ دے کر انھیں سخر کر لینے میں دکھائی تھی۔ یہ لوگ جیوری انٹھیں کنندہ محاصل اور اعزازى مجسٹریٹ کی حیثیت سے حکومت کے بہت سے کام یا تو سیکھ چکے تھے، یا سیکھ رہے تھے، اور بیرونوں یا شاہی عہدے داروں کی بد اعمالیوں پر گرفت کرنے یا انھیں ٹھیک کرنے میں بہت چست ہو گئے تھے۔ چناں چہ رفتہ رفتہ جب پارلیمنٹ باقاعدہ طور پر وجود میں آئی، اس وقت تک حکومت کے کاموں میں تجربے کار متوسط طبقہ ترقی پائے لگا مختلف ملکوں کی تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ پارلیمنٹى اداروں کی کام یابی کا زیادہ انحصار ایسے ہی متوسط طبقے کے وجود پر ہے۔ اس طبقے کے بغیر یہ ادارے یا تو صواب دولت و نسب عدیدہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں یا عوام کی دہشت انگیزی کی صورت میں ترقی پاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہی فوجى خود مختاری کے

دور دورے کا امکان ہو جاتا ہو۔

فرانس میں امیروں کی جماعت انگلستان کی بہ نسبت بہت زیادہ قوی تھی۔ یہاں بادشاہت نے اپنے بعض وظائف حکومت کو نیا بتا انجام دینے کی اس قدر کام یابی کے ساتھ کوشش نہیں کی تھی۔ اس لیے قوم پر محصول عائد کرنے کے قابل مجلس مرتب کرنے کی کوشش خصوصاً اس لیے ناکام رہی کہ اس کام میں مدد دینے کے لیے کوئی روشن خیال اور تجربے کار متوسط طبقہ ہوتا نہ ہو سکتا تھا۔ تاہم فرانسیسی بادشاہت اور عوام کے درمیان اتحاد (یہ اتحاد ہستری اسٹیٹ کہلاتا تھا) نے چھوٹے زمین داروں اور دیہی مجلسوں کی اپنے جاگیریں سرداروں کے خلاف بغاوت میں اکثر شاہی امداد کی صورت اختیار کی تھی۔ یہی اتحاد مغرور اثر افیہ کی قوت کو کم زور کرنے میں کافی طور پر موثر ثابت ہوا۔

ایسی مجلسیں جو تمام قوم پر محصول عائد کرنے کی اہل تسلیم کی جاتیں، ان کو مرتب کرنے اور ایسی مجلسوں کی مدد سے بیرونیوں کی قوت توڑنے کی جو کوششیں بادشاہوں نے کیں، ان میں کام یابی کا انحصار نہ صرف اوسط طبقے کے عروج پر تھا بلکہ طلب کردہ مجلسوں کی نمایندگی کی قابلیت پر بھی تھا۔ آخر کار ہر شہری کو حکومتی مجلس میں نشست دینے کی غلطی سے بچنے کا ایک طریقہ دریافت کر لیا گیا۔ اسی غلطی نے تمام قدیم جمہوریتوں کو مقید کر رکھا تھا۔ اس لیے کہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قدیم دنیا میں ایسی ”براہ راست جمہوریت“ کے معنی کا اہل اور مفلس عوام کے ذریعے حکومت کے لیے جانے لگے تھے۔ اور یہ بات خود جمہوریت کے لیے ہم قاتل تھی۔ لیکن انگلستان میں رفتہ رفتہ ایک دوسرا طریقہ رائج ہو گیا۔ نمایندگی کا یہ نظام جس پر پارلیمنٹ کا

دار مدار تھا، قانونی عدالتوں، محاصل کے تعین، اور خانقاہ کی تحریکوں سے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں سے شروع ہوا۔ ہر گانویا ہر شہر اپنے نمائندے دیہی عدالت میں بھیجتا تھا، اور ایڈورڈ اول کے عہد حکومت (۱۲۷۲ء تا ۱۳۰۷ء) سے دیہی عدالت پارلیمنٹ میں اپنے نمائندے بھیجتی تھی۔ اس کے بعد قصبے اور شہروں کے نمائندے مل کر "دارالعوام" بن گئے۔ اور رفتہ رفتہ امیروں کی موجودگی کے بغیر جو انھیں خوف زدہ کر سکتے تھے، مباحث میں حصہ لینے اور خود رائے دینے لگے۔

نمائندگی کے اس طریقے سے بہ راہ راست جمہوریت کی بُرائیاں دُور ہو گئیں۔ پارلیمنٹ کی حکومت عوام کی ایک بڑی اور ہنگامہ پرور مجلس تھی اور نہ اس کے "تلون" اس کے کینہ محرکات و جذبات اور اس کی نفاق پسند روح کی حکومت تھی۔ تاہم حکومت اب بھی جمہوری اور مقبول ہو سکتی تھی کیوں کہ پارلیمنٹ میں بیٹھنے والے اور ملک پر محصول عائد کرنے کے طریقے معین کرنے والے اور جدید قوانین وضع کرنے والے لوگ عوام کے منتخبہ نمائندے ہوتے تھے۔ جن لوگوں نے انھیں منتخب کیا تھا، ان کے آگے یہ جواب دہ تھے۔ یہ لوگ اس قابل تھے کہ اپنے منتخب کرنے والوں کی طرف سے گفتگو کریں اور وطن واپس ہوئے پر ان کو حکومت کی مرضی سے مطلع کریں۔

پہلے پہل پارلیمنٹ کا رکن ہونا، اور کچھ نہیں تو ایک اعزاز اور

پارلیمنٹ کے اقتدار کا عروج

انتیاز سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ کا یہ مطالبہ کہ ہر شہر یا ہر ضلع سے نمائندے مقرر کیے جائیں، بالکل ناپسند کیا گیا۔ سمجھا یہ جاتا کہ رعایا کو دیے ہوئے اس حکم

کا منشا یہ ہو کہ شاہی محصلوں کے ہاتھوں اپنی تباہی میں آپ مدد دیں۔ مگر عوام کو اس حقیقت کے سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ جو گوئیے کو معاوضہ دیتا ہو، اس کو گانا سننے کا حق حاصل ہو۔ انھوں نے اس رقم پر جو وہ بادشاہ کو ادا کیا کرتے تھے، اس کو صرف کرنے کے طریقے پر اپنی وسعت کے ساتھ بڑھتی ہوئی نگرانی کا کام یابی کے ساتھ دعو کیا۔ دارالامرا یعنی بیرونوں کی قیدیہ جاگیر کی کونسل نے ۱۲۱۵ء میں اتنا اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ اس نے بادشاہ جان کو مجبور کر کے اس سے ایک اہم منشور حاصل کر لیا۔ اس منشور میں دارالامرا کے مفاد کے مطابق وسیع مراعات دیے گئے تھے۔ ان مراعات کو دارالامرا نے جان جیسے کم زور بادشاہ اور اس کے بعد کے کم زور تر جانشینوں کے عہد میں ناجائز طور پر استعمال کیا۔ لیکن اسی منشور کو بعد میں خود عوام نے انگریزوں کی کامل آزادی کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ تاہم دارالامرا نے اپنے مرتبے اور اپنی جاگیر کی عظمت کے باوجود پہلے عوام کو اپنا معاون اور پھر مخالف پایا۔ آخر کار عوام نے کچھ ایسی چال چلی کہ وہی خود حکومت کے حقیقی آلہ کار بن گئے۔ اس معاملے میں بھی اور باتوں کی طرح عوام معمول اندازی پر تصرف کے سب سے بڑے حربے پر بھروسہ رکھتے تھے۔

چودھویں صدی کے وسط میں ان گراں خرچ جنگوں کی وجہ سے جو شاہ انگلستان فرانس سے ساتھ کر رہا تھا، انگلستان کا بادشاہ ہر سال پارلیمنٹ طلب کرنے پر مجبور ہو گیا۔ شاہ انگلستان پالیسی سے متعلق اہم ترین مسئلوں میں پارلیمنٹ سے مشورہ لیتا اور حکومت کے مختلف محکموں سے اس کی شکایتوں کے انسداد کی درخواستوں کو عموماً منظور کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔ اس طرح جرات پاکر عوام نے ۱۷۰۱ء میں فرانسیسی جنگ سے متعلق بدانتظامیوں

پر اعتراض کر دیا، اور دارالامرا میں حکومت کے دغا باز ٹھہرنے کے باوجود خود شاہی وزیروں کو اس کا لازم ٹھہرایا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد عوام کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ شاہی حسابات کی تنقیح کریں کہ آیا وہ رقم جو انھوں نے منظور کی تھی، وہ ٹھیک طور پر ان ہی اغراض و مقاصد پر صرف ہو رہی ہو جس کے لیے انھوں نے رائے دی تھی۔ پندرھویں صدی کے ابتدائیں پارلیمنٹ اتنی طاقت ور ہو گئی تھی کہ اس نے ایک بادشاہ کو معزول کر کے ایک دوسرے شخص کے سر پر تاج شاہی رکھا۔

تو روز خاندان کی جنگوں کی طوائف الملوک کے ساتھ ساتھ پارلیمنٹ کی قوت بھی گھٹنے لگی اور ان کے اختتام پر انگلستان کی ایک ہی خواہش تھی کہ ایک مستحکم مرکزی حکومت قائم کی جائے۔ اس کے متعلق لوگ محسوس کرتے تھے کہ یہ کام صرف ایک طاقت ور بادشاہت ہی انجام دے سکتی ہو اور جاگیر بد نظمی کے پھر از سر نو اجرا کے خلاف ہی ایک محافظ ہو۔ اس طرح سولہویں صدی میں پارلیمنٹ اس زبردست یوڈر خاندان کی مطیع اور فرماں بردار بنی رہی جس کے بہت سے طریقے بالکل استبدادی تھے۔ لیکن لوگوں کو وہ وعدے یاد تھے جو پارلیمنٹ نے ایک دفعہ کیے تھے۔ سترھویں صدی میں جب اسٹوارٹ خاندان کے عہد میں بادشاہت کو زوال ہونے لگا تو پارلیمنٹ طلب کی گئی، تاکہ عام حقوق کو پھر سے تازہ کیا جائے۔ اس وقت عوام آزادی کے سوراؤں کی حیثیت سے پھر ایک بار اپنی قدیم جگہ حاصل کر لینے کے لیے تیار تھے۔

اس طرح ہم پارلیمنٹ کی ترقی کے ساتھ ساتھ آزادی اور نظم و تربیت کی روح کو ترقی کرنے دیکھتے ہیں۔ یہ روح جاگیر بد نظمی کے خلاف مرکزی

اقتدار کے لیے تاج کی کش مکش میں تاج کی مدد کرتی ہو۔ اور یہی چیز امیروں کی قوت توڑنے میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔ اگرچہ یہ بات کسی اور جگہ نہیں ہوئی لیکن انگلستان میں قرون وسطیٰ کی پارلیمنٹ بہت بڑی حد تک خود تاج پر سیادت قائم کر لینے میں کامیاب ہوتی ہو، اور اس طرح عام آزادی برقرار رکھنے کا ایک قابلِ قدر ذریعہ بن جاتی ہو۔ ”پارلیمنٹ کے قائم ہونے سے دو صدی پیش تر اس نے پانچ بادشاہوں کو معزول کیا اور تین نئے خاندانوں کو باضابطہ خطاب عطا کیے۔ اس نے وہ راہیں دکھائی ہیں جن پر عمل کر کے خانہ جنگی کے بغیر استبدادیت سے مقابلہ کیا جاسکتا اور اسے برباد کیا جاسکتا ہو۔ اس نے ثابت کر دیا کہ دستور میں نمایندگی کا عنصر بادشاہت اور اثرانیہ دونوں کو مغلوب کر سکتا ہو۔“ ۱۵

قرون وسطیٰ کی ابتدا میں یورپ خانہ بدوش وحشی قبیلوں سے بھرا خلاصہ پڑا تھا۔ یہ قبیلے وہ تھے جو چین کے دباؤ سے مغربی جانب ڈھکیل دیے گئے تھے۔ کلیسا نے پاپائی رہ نمائی میں ان وحشیوں کو رام کرنے میں بڑی محنت اٹھائی۔ انھیں مسیحی اخلاقیات کے مبادیات کی تعلیم دی۔ ان کے دل پر باقاعدہ عالمی حکومت کی عظمت کا بیکہ بٹھایا۔ اسی نے ظلمت کے طویل زمانوں میں زمانہ قدیم کی عظمت اور آزادی کی یادداشتوں کو محفوظ رکھا اور جماعت کی بنیاد ڈالی، جن میں آخر کار یہی یادداشتیں پڑھی جاسے والی تھیں۔

فاتح وحشیوں نے ایک نیا سادہ اور آسان سماجی اور سیاسی نظام تیار کیا تھا۔ اس میں تصویر یہ تھا کہ ہر شخص کو خدمت اور فرائض انجام دینے چاہئیں،

لیکن اس نظام میں اتنی گنجائش تھی کہ وہ خود غرض اور حربیں اشراقیہ کے ہاتھوں اس کی بے لگام اور بے قانون دست اندازیوں کا شکار ہو جائے۔ چنانچہ غریبوں پر مظالم ڈھائے گئے اور سماج اور ریاست کا شیرازہ بڑی طرح بکھر گیا۔

ایک ایسے معرکے میں جو شروع سے آخر تک ایک ہزار سال سے زیادہ طویل مدت تک جاری رہا، اس جاگیرِ نظام سے جنگ جاری رہی، اور آخر کار مختلف قسم کی قوتوں کی مدد سے اسے زیر کر لیا گیا۔ ان قوتوں میں اگرچہ سب سے بڑی اور سب سے زیادہ موثر قوتوں میں نہ تھی، تاہم مقدس رومی سلطنت بھی ایک قوت تھی۔ یہ رومیوں کی عالمی سلطنت کو پھر سے دنیا میں قائم کرنے کی ایک ناکام کوشش تھی۔ دوسری قوت پاپائی نظام تھا، اس کے چند زبردست پاپوں کو عارضی غلبہ حاصل ہونے کے باوجود یہ نظام سب کو متحد کر دینے کی کوشش میں ناکام رہا۔ کیوں کہ پاپائی نظام کو معلوم ہو گیا تھا کہ قومی احساس کی بڑھتی ہوئی قوت خود اس کی مخالفت تھی، اور بادشاہ و عوام رومی بشپ کے خود مختارانہ دعاوی کے خلاف بغاوت کر رہے تھے۔ امیروں کی یاد ت کو مغلوب کرنے میں ایک بہت ہی طاقتور قوت قصبوں کا عروج تھا۔ اس عروج کا دار مدار تجارتی دولت پر تھا اور خود امیروں نے شہریوں کے ہاتھ ان کے جاگیرِ حقوق فروخت کر کے غیر شعوری طور پر ان کی ہمت افزائی کی تھی۔ اس کے علاوہ شہری اور کسان اپنے نیزوں اور تیرکمان سے مسلح ہو کر رفتہ رفتہ جاگیرِ امیروں کو خود ان کے آبائی پیشہ یعنی جنگ میں شکست دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ آخر کار طاقتور بادشاہتوں کے عروج اور عوام کی نمایندہ مجلسوں سے

ان کے اتحاد نے اشرافیہ کی سیادت کا خاتمہ کر دیا۔ اشرافیہ نعوں ریز خانہ جنگیوں سے خود اپنی تباہی کے آپ ہی باعث ہوئے۔
اس طرح قرون وسطیٰ جنگ و جدل کا عہد ہے۔ اس عہد میں بادشاہوں اور عوام نے رفتہ رفتہ جاگیرى نظام کا خاتمہ کر دیا۔

ساتواں باب

قومیت

جب ہم گزشتہ سطر سے چار سو سال کی مدت پر نظر ڈالتے ہیں جو عام طور پر یورپی تاریخ کے عہد جدید کے نشوونما کا زمانہ سمجھا جاتا ہے تو ہم انہی قوتوں کو مصروف عمل دیکھتے ہیں جو قرون وسطیٰ میں جاگیرى نظام سے کشمکش میں پیش پیش تھیں۔ لیکن ان قوتوں کا اثر ایک نئی اور زیادہ طاقت ور ہمہ گیر قوت کے آگے دب گیا، جس کی ابتدا ہم یہودیوں میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ قوت جو روز افزوں اثر کے ساتھ قرون وسطیٰ کے آخری دور میں ترقی پزیر تھی، قومیت ہے۔ قرون وسطیٰ کا زمانہ اگر جاگیرى معرکوں اور تہذیب اور جاگیرى نظام کی آویزش کا زمانہ معروض تھا، تو عہد جدید قومی معرکوں اور تہذیب اور قومیت کی معرکہ آرائی کا دور ہے۔

قومی مجالس کے ساتھ اتحاد سے شاہی اقتدار کے
قومیت کا عروج استحکام کا اجالی ذکر ہم کر چکے ہیں۔ یہ استحکام نہ صرف

انگلستان اور فرانس میں حاصل ہوا بلکہ اسپین میں بھی یہی یاست ہوئی۔ اس استحکام کو لڑائیوں کے سلسلے نے قومی احساس پیدا کر کے ممکن بنا دیا۔ یہ لڑائیاں ایک طرف انگلستان اور فرانس، اور دوسری طرف اسپین اور مسلمان فاتحوں کے درمیان ہو رہی تھیں۔ یہ حریف امیروں کے درمیان محض جاگیر لڑائی نہیں تھیں۔ عوام نے ان میں بڑی جاں بازی سے حصہ لیا، اور اس سے ان میں مشترک مفاد اور قومی حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ ادھر بادشاہ زیادہ تر اس وجہ سے مقبول اور طاقت ور ہو گئے کہ وہ قومی دشمن کے مقابلے میں قومی رہے نہ تھے۔

غالباً یورپ میں فرانس ہی وہ پہلا ملک ہے، جہاں حقیقی قومیت نے نشوونما پایا۔ ۱۲۱۳ء میں شاہ انگلستان، شہنشاہ جرمنی اور فلانڈرس کے کاؤنٹ نے مل کر فرانس پر حملہ کیا اور بونیٹس کی زبردست جنگ میں شاہ فلپس اور اس کی فوج سے شکست فاش کھائی۔ اس جنگ کو ہم سرسری طور پر فرانس کی قومیت کے آغاز کا زمانہ قرار دے سکتے ہیں۔ ٹھیک ایک سو سال بعد جنگ بین کی لڑائی میں انگریزوں پر شاہ رابرٹ بروکس کی فتح بھی ایک بڑا اسکاچی قومی جذبہ تھا۔ ایک طرف اس کا چلتا لیٹوائیوں اور دوسری طرف فرانس کے ساتھ سو سالہ جنگ میں کریسی اور رائیٹس کی عظیم الشان فتوحات نے قومیت کے احساس کو تیز کر دیا۔ قومیت کا یہ احساس انگلستان میں پہلے ہی سے موجود تھا، اگرچہ بعد میں روز خاندان کی جنگیں اس کی ترقی میں مدد ملیں۔

فرانسیسی بادشاہت سو سالہ جنگ (۱۳۳۷ء-۱۴۵۳ء) کے ابتدائی زمانے میں، بہت ہی ناکارہ ہو گئی تھی۔ جاگیر کی طائف الملوکی کے گزرجی تھی، کانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ اور ملک کے بڑے حصے کو انگریز تاخت

وتنازع کر رہے تھے۔ مگر فرانس میں قومیت کا احساس پھر عموماً نہ آیا، اور دو شیر جنگ آزما "جون آف آرک" کے بہادرانہ طرزِ عمل سے فرانسیسی جذبہٴ حب وطن شعلہٴ جوالہ بن کر اٹھا۔ اس سے فرانسیسی قومیت اپنے انتہائی اعلا وارفع مرتبہ کو پہنچ گئی (۱۴۱۲ء - ۱۴۱۸ء) جون آف آرک کے ساتھ بادشاہ نے کیمنے پن ہے دغا کی جس کو جون نے فرانسیسی قوم کی قیادت واپس دلائی تھی۔ جون آف آرک کو ایک دہشت ناک موت مرنا پڑا لیکن وہ اپنا کام پورا کر چکی تھی۔ قومی روح مؤثر طور پر پیدا ہو چکی تھی اور آخر کار قومی دشمن سرزمینِ فرانس سے سرکے بل نکالا جا چکا تھا۔

موروں کے مقابلے میں اسپینوں کی طویل جنگیں پندرھویں صدی کے اختتام پر غرناطہ کی فتح تک انجام کو نہ پہنچیں۔ اس وقت سے ایک طاقت ور قومی بادشاہت نے اسپین کو پوری طرح متحد اور مستحکم کر دیا، اور ان تمام مخالفتوں کو جو خواہ امیروں، یا اسمبلیوں، یا مقامی خود مختار حکومتوں کی طرف کی گئیں، انھیں پورے طور پر دبا دیا۔ سولھویں صدی کے نصفِ آخر تک اہل اسپین فرانس اور انگلستان کی بہ نسبت ایک نہایت منظم اور طاقت ور قوم بنے رہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یکے بعد دیگرے جرمنی کے متعدد بڑے بڑے شہنشاہوں نے اطالیہ کو پوری طرح فتح کر لینے کی کوشش کی۔ یہ کوشش کچھ تو اطالوی شہری ریاستوں اور کچھ پاپائی نظام کی مزاحمت، کچھ مشرقی یورپ پر ترکی اور منگولی حملوں کے نتیجے کے طور پر، اور کچھ خود جرمنی میں جاگیر نظام کی قوت کی وجہ سے ناکام رہیں۔ اطالیہ میں شہنشاہوں کی ناکامی نے دونوں ملکوں کی قومی ترقی کو بہت پیچھے ڈال دیا۔ اتفاق ڈالنے والی قوتوں نے اتنا

زور پکڑا کہ ہر خطہ زمین بیرونی لٹیڑے حملہ آوروں کا میدانِ کارزار بن گیا۔ فرانس، اسپین اور اسٹریا نے اطالیہ کو تاخت و تاراج کر کے اس کے حصے بخرے کر لیے۔ سویڈن، ڈنمارک، فرانس اور آسٹریا نے جرمنی کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ ایک طاقت ور بادشاہت کے ماتحت قومی اتحاد پیدا کرنے کے لیے ان دونوں ملکوں کو انیسویں صدی تک انتظار کرنا پڑا۔

تاریخ میں ایک قوت کی حیثیت سے قومیت کی ابتدا **قومی مطلق العنانی** کا سرانجام قرونِ وسطیٰ میں بہت دیر پیچھے ہٹ کر تلاش کرنا چاہیے۔ بعض مؤرخوں نے اس کی ابتدا کا زمانہ اور بھی پیچھے ہٹ کر نویں اور دسویں صدی میں متعین کیا ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے جب کہ شاہ آجریٹ (۸۷۷ء-۸۷۹ء) کے ماتحت انگلستان ایک ملک کی صورت میں استحکام پا رہا تھا اور اس کا سلسلہ شاہ الفریڈ (۸۷۹ء-۹۰۰ء) کے عہدِ حکومت تک جاری رہا۔ ادھر فرانس اور جرمنی میں ہیبو کاہٹ (۹۱۹ء-۹۲۶ء) اور ہنری دی فاوئر (۹۱۹ء-۹۲۶ء) کے ماتحت علیحدہ علیحدہ طاقت ور حکومتیں بن گئی تھیں۔ ہر مقام پر جاگیرِ نظام، قومی اتحاد کا ایک بدترین دشمن ثابت ہوا۔

۱۰۶۶ء کے بعد سے شہنشاہ کی قوت کا مرکز بن گیا تھا۔ یہی سال تیس سالہ جنگ کے اختتام کا سال ہے۔ اس جنگ کے دوران میں بیرونی قوموں نے بے درک لوگ جرمنی کو مغلوب کر کے اسے برباد کیا۔ اس کے بعد ہابسبرگ خاندان جس کے قبضے میں شہنشاہی اقتدار تھا، جرمنی میں اور بھی کم زور ہو گیا، اس لیے یہ خاندان جرمنی سے نکال دیا گیا۔ انھوں نے اسٹریا کے اندر جہاں کے یہ سوری کوئی حاکم تھے، اور اس کے باہر اپنی قوت کو وسعت اور استحکام دینا شروع کیا۔ اسٹریائی قوت کو فتوحات اور وسعت زیادہ تر مغربی جانب اطالیہ اور جنوب کے ان ملکوں میں حاصل ہوئی، جن پر ترک قابض تھے۔

مضبوط قومی بادشاہت کی ترقی کے راستے میں قائم قدیم پر بیرن متضادم ہونے
تھے اور قومی بادشاہت ہی ایسا اتحاد حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھی۔ بیرن ہر
اس چیز کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے جو ان کی آزادی کو برقرار رکھ سکتی
تھی لیکن مغربی یورپ میں قومی خود مختاری کے سیلاب کو کسی طرح روکا نہیں
جاسکا۔ سولہویں صدی کی ابتدا میں فرانس، انگلستان اور اسپین حقیقی قومیں بن
چکے تھے۔ ان قوموں پر طاقت ور اور عظیم الشان بادشاہ خود مختاری کے ساتھ
حکومت کر رہے تھے۔ ان کے بادشاہ صرف خود مختار ہی نہیں تھے بلکہ مقبول
خود مختار حکم راں تھے کیوں کہ انھوں نے اپنی قوموں کی نام آوری مہمات پسندی
اور آزادی حاصل کرنے کی خواہش کو اپنی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اس کے
بعد ہی شہنشاہ چارلس پنجم نے جاگیر بد نظمی کے خلاف ایک انتہائی زبردست
کوشش کی کیوں کہ جاگیر بد نظمی نے اس کی سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔
چارلس نے جرمنی میں ایک طاقت ور مرکزی حکومت قائم کرنی چاہی۔ وہ
چاہتا تھا کہ اس حکومت کی باگ خود اسی کے ہاتھ میں رہے اور اگر ضرورت
ہو تو اس مقصد کے لیے اسپینی سپاہیوں کی امداد بھی حاصل ہو سکتی تھی کیوں کہ
وہ اسپین کا بھی بادشاہ تھا۔ لیکن اس کی کوششوں کا بے نتیجہ ہونا مقدر ہو چکا
تھا۔ جاگیر بد نظمی، مذہبی جھگڑے اور اس کے اسپینی سپاہیوں سے نفرت،
یہ سب ایسی قوتیں تھیں جن کا مقابلہ کرنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔

۱۵۳۲ء میں اطالوی مصنف اور سیاست دان میکیا آولی نے اپنی
مشہور کتاب ”رئیس“ شائع کی۔ اس میں میکیا آولی نے مطلق العنانی کا ایک
انتہائی تصور پیش کیا۔ اس کی رائے ریاست کے مفاد کو ایک مطلق العنان
فرماں روا کی ذات میں مجسم کر دیا، جو مذہب اور اخلاق کے قوانین سے بالاتر

ہر-سیکیاؤلی کے تصورات اس کے عہد کی روح کا خلاصہ ہیں۔ یہ روح وہ تھی جو متعدد دیشیوں سے سولہویں، سترھویں اور اٹھارھویں صدی سے گزر کر انیسویں صدی میں بھی باقی رہی۔

اس طویل عہد میں یورپ کے اکثر ملکوں میں عام مجلسیں یا تو اپنا اقتدار کھو کر ناکارہ ہو گئی تھیں، یا بادشاہ کی شخصی مرضی کے آگے جھک گئی تھیں۔ خوف ناک بین الاقوامی جنگوں کی وجہ سے بڑا عظیم یورپ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اگرچہ مذہبی اور تجارتی اغراض بھی ان جنگوں کے وجود میں لانے کا باعث ہوئیں لیکن زیادہ تر شاہی خاندانوں کی تنازعات پر ان کی بنیاد تھی۔

قومیت کے ارتقا میں مذہب اور تجارت کا اثر | سولہویں صدی

کی ابتدا میں جب پروٹسٹنٹ اصلاح سے رومی کلیسا علیحدہ ہو گیا تو اسپین، مجنونا نہ طور پر کیتھولک ہی رہا۔ انگلستان معتدل طور پر پروٹسٹنٹ بن گیا۔ (پوپ کی جگہ انگلستان کا فرماں روا قومی کلیسا کا صدر ہو گیا) اور فرانس نے خوف ناک خانہ جنگیوں کے بعد معتدل طور پر کیتھولک رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ جرمنی کا علاقہ جنوب میں کیتھولک نظام اور شمال میں ایک طرح کے پروٹسٹنٹ نظام کے ماتحت بٹ گیا۔ ان نظاموں نے مقامی رئیس کو اس کی ریاست میں مذہبی صدر بنادیا اور اس طرح جرمنی کے اندرونی جھگڑوں میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ چنانچہ مذہبی اصلاح کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ کرنے والی قوتوں میں مذہبی نفاق کی ایک اور قوت شامل ہو گئی۔

یہ لیکن یہاں بھی لوی چہارم اور نپولین جیسے مطلق العنان بادشاہ، پوپ سے آزاد ہو کر بھی چاہتا کرنے تھے بلکہ یہ خود ہی پوپ کو ہدایت کرتے تھے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

تجارت کے لحاظ سے پندرھویں صدی کے اختتام پر امریکہ اور مشرق کو جانے والے بحری راستوں کی دریافت عظیم الشان بحری تجارت کی ترقی کا باعث ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوف ناک قومی رقابتیں پیدا ہو گئیں۔ ان رقابتوں کو حرص اور مہمت پندی کی روح، جو اس عہد کے ملاحوں اور سوداگروں میں بہت تیز تھی، بہت کچھ تقویت دے رہی تھیں۔ پہلے پرتگالیوں اور پھر ولندیزیوں نے کوشش کی کہ مشرق کے ساتھ جدید تجارت کو اپنے ہی قبضے میں رکھیں۔ ادھر پوپ کی حمایت سے اسپینوں نے دعویٰ کیا کہ امریکی براعظموں اور جزیروں سے نفع اٹھانے کے وہی حق دار ہیں۔ اس میں صرف برازیل کا ملک جو مشغی تھا، پرتگالیوں کے ہاتھ آیا۔ اسپین اور انگلستان کے درمیان قومی پرغاش، جو سولھویں صدی کے آخری حصے میں بہت نمایاں رہی، زیادہ تر اسپین کے امریکی اجارے میں انگریزوں کی مداخلتوں سے پیدا ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ ان قوموں کو لڑانے میں مذہبی اختلافات کا بھی کافی اثر تھا۔ سترھویں صدی میں انگریز اور ولندیزی دونوں پروٹسٹنٹ قوموں کی آپس کی لڑائیاں بھی تجارتی مسائل اور تجارتی رشک و حسد ہی کی وجہ سے ہوئیں۔ سن ۱۶۰۲ء اور ۱۶۱۳ء کے درمیان انگلستان اور فرانس میں بولوائیاں ہوئیں ان سے بہت بڑی حد تک یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ تجارت میں وسعت اور دؤر دؤر کی منڈیوں کو حاصل کرنے اور انھیں اپنے قبضے میں رکھنے کی خواہش، یہ وہ اہم اسباب تھے جنہوں نے انیسویں صدی میں یورپ کی مختلف کی قوتوں کو نوآبادیاتی جھگڑوں اور معرکوں میں مبتلا کر دیا اور آخر کار جرمنی کی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) تک ان کا سلسلہ جاری رہا۔

فیاض مطلق العنانی | یورپ میں مطلق العنانی کا دور دورہ اس وقت تک رہا جب تک کہ وہ قومی کارکردگی اور قومی

وسعت کے لیے پوری قوم کی مرضی کا اظہار اور اس کی نمایندگی کرتی رہی۔ اسی حیثیت سے وہ حقیقی طور پر مقبول رہی۔ اس طرح فرانس کا زبردست مطلق العنان بادشاہ کوئی چہار دہم اس لیے خود مختاری کے ساتھ حکومت کر سکتا تھا کہ اس نے کچھ عرصے کے لیے اپنے ملک کو عظمت اور شان و شوکت کی انتہائی بلندی تک پہنچا دیا تھا۔ اس بادشاہ نے ایک طرف فرانسیسی تمدن اور دوسری طرف فرانسیسی فوجوں کو پورے براعظم یورپ کے لیے نمونہ بنا دیا تھا۔ پھر نپولین بھی اس طرح انھی وجوہ کی بنا پر مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کر سکتا تھا۔ نپولین ایک زبردست قوم کے اقتدار اور عظمت کے حصول کے جذبہ کا زندہ مجسمہ تھا۔ اس کے علاوہ نپولین کی حکومت پوری طرح کارآمد اور کاروباری تھی۔ دوسرے بڑے بڑے مطلق العنان بادشاہوں کی نسبت بھی یہی درست ہے۔ مثلاً روس کا پیٹر اعظم (۱۶۸۹ء، ۱۷۲۵ء) پریشیا کا فریڈرک اعظم (۱۷۴۰ء، ۱۷۸۶ء) اور ان سے دوسرے درجے پر آسٹریا کا جوزف دوم (۱۷۶۵ء، ۱۷۹۶ء) اس فہرست میں اہم غالباً انگلستان کے آئوگر مول کا نام بھی شامل کر سکتے ہیں۔

یہ مطلق العنان بادشاہ مضبوط کردار، روشن خیال، صاحبِ عزم و تہمت اور عالی ہمت انسان تھے۔ یہ وہ آدمی تھے، جنہوں نے اپنی تمام قابلیتوں کو کارکردگی اور ترقی کے اصولوں کے مطابق اپنی قوم پر حکومت کرنے میں لگا دیا تھا۔ امیروں کی قوت کو سختی کے ساتھ دبا دیا گیا۔ تجارت اور صنعت و حرفت کی ہمت افزائی کی گئی۔ تعلیم کے نظامات مرتب کیے گئے۔ قومی مالیات

کو احتیاط کے ساتھ منظم کیا گیا اور عہدے داروں کی بدعنوانیوں کا انکشاف کیا گیا۔ نوآبادیاں بسائی گئیں۔ قوانین منضبط کیے گئے۔ رفاہ عامہ کے بڑے بڑے کام کیے گئے۔ شہروں کی تعمیر ہوئی۔ نہریں کھودی گئیں اور دلدلوں کو پاٹ دیا گیا۔ ایسے "فیاض مطلق العنان" بادشاہوں نے نہ صرف اپنی کامیابی بیرونی جنگوں سے بلکہ ہر قسم کی داخلی دانش مندانہ قانون سازی سے اپنی اپنی قوموں کی قوت میں اضافہ کیا۔ ان کی طاقت کے انحصار کا آخری ذریعہ بڑی بڑی فوجیں تھیں، جن کو مطمئن رکھنا اور بیرونی لڑائیوں میں مصروف رکھنا پڑتا تھا۔ مجلسوں کے نمائندے بہت بڑی حد تک گوشہ گم نامی میں پڑ گئے تھے۔ بعض ملکوں میں ایسی مجلسیں عملاً مسدود کر دی گئی تھیں۔ دوسرے ملکوں میں نیم دلی کے ساتھ کوشش کی گئی کہ ان کو بھی حکومت کے کام میں کچھ حصہ دیا جائے لیکن جیسے ہی مجلس نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا، اسے فوراً توڑ دیا گیا۔ کرامول کا یہی طریقہ تھا۔

فیاض مطلق العنانی کا زمانہ ایک مسلسل جنگ و جدل کا زمانہ تھا، اس کی وجہ نہ صرف یہ تھی کہ ان قومی فوجوں کی فتح مندی اور نام آوری کی پیاس بھجانی تھی، بلکہ یہ وجہ بھی تھی کہ ایسے معرکے ان حکمرانوں کی اسنگوں کو دل کھول کر پوری کرنے کا موقع دیتے تھے۔ ان اسنگوں کی حمایت میں رائے عامہ کے حاصل کرنے کے یہی بہترین طریقے تھے۔ یہ اسنگیں کیا تھیں؟ بادشاہوں کے انفرادی اور خاندانی معاملات تھے۔ مثلاً وراثتی جھگڑے، بادشاہی بیابہ کی قراردادیں، یا خود ان مطلق العنان بادشاہوں کی شخصی عداوت یا دوستی۔

لیکن یورپ کی قوموں پر دائمی طور پر ایسی حکومت

جمہوری قومیت

نہیں کی جاسکتی تھی۔ جوں جوں تعلیم کی اشاعت

ہوئی، جیسے جیسے تجارت کو فروغ ہوا، جیسے جیسے مال و دولت میں اضافہ ہوا اور جیسے جیسے سائنس نے قدرت پر قابو پانے کے جدید ذرائع اور اس سے قوت حاصل کرنے کے تازہ خزانے دریافت کیے، ویسے ویسے آزادی کی خواہش بھی قوی سے قوی تر ہوتی گئی۔ جب تک یہ مطلق العنان بادشاہ سچے خیر اندیش اور حقیقی طور پر قابل رہے، لوگوں نے ناگواری کے ساتھ ان کی اصلاح کو قبول کیا۔ مگر جو اصلاحیں اس طرح عائد کی جائیں، وہ بہت زیادہ پس و پیش کے بعد قبول کی جاتی ہیں اور ان اصلاحوں کی بہ نسبت جو ایک قوم خود اپنے آپ پر عائد کرتی ہو، یہ قومی کردار میں حقیقی تغیرات پیدا کرنے کے بہت کم قابل ہوتی ہیں۔ یہ مطلق العنان بادشاہ اپنی اصلاح کے جوش میں نادانی اور جبر و تعدی کا سا انداز رکھتے تھے، اور قوم کے ان ہی حصوں کو غیر ضروری نقصان پہنچاتے تھے جن کو راضی رکھنا ان کے لیے نہایت ضروری تھا، اگر وہ اپنی کی ہوئی تبدیلیوں کو دائمی بنانا چاہتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فیاض مطلق العنان ہمیشہ ہمیشہ حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ مرجاتا تو موروثی جانشینی کی رو سے تخت پر دوسرا مطلق العنان بادشاہ بیٹھتا، جو نہ صرف یہ کہ فیاض نہیں ہوتا بلکہ محض استبدادی یا کم زور، نااہل اور اپنی قوم کے لیے باعثِ ننگ ہوتا تھا۔ موروثی جانشینی پولینڈ اور مقدس رومی سلطنت کے سوا اس وقت تک یورپ میں ہر جگہ رائج ہو گئی تھی۔ چنانچہ عظیم الشان لومنی چہار دہم کا جانشین، قابلِ تفریق لومنی پانزدہم ہوا۔

مختصر یہ کہ رفتہ رفتہ مطلق العنانی کی مقبولیت ختم ہو گئی۔ یہ تغیر اس لیے مہلک ثابت ہوا۔ مفکروں کے ایک عظیم الشان سلسلے نے جن میں روس سے زیادہ فصیح البیان اور با اثر تھا، آزادی کے قدیم اصولوں کو استعمال

کرنے کے خیال کی طرف یورپ کو پھر متوجہ کیا۔ انگلستان کے خلاف امریکی نوآبادیوں کی بغاوت اور ممالک متحدہ کی جمہوریت کا قیام اس بات کا عملی ثبوت تھا کہ فی الواقع آزادی کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد ۱۷۹۳ء سے ۱۷۹۵ء کے دوران میں انقلابوں کے ایک سلسلے نے خود مختاری کا تختہ الٹ دیا۔ فرانس کی طرح بعض ملکوں میں یہ کئی دفعہ قائم ہوئی اور پھر الٹ دی گئی۔ جمہوریت نے ہر جگہ اپنے قدم جمائے اور قوم کی منتخبہ مجلسوں پر مضبوطی کے ساتھ اس کی بنیاد رکھی گئی۔

لیکن جمہوریت بھی ایسی ہی محدود قومیت تھی جیسے کہ خود مختاری شہنشاہیت کی طرف قدیم جمہوریتوں کے میلان کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ جدید یورپ میں بھی آزاد شدہ قوموں کی اس سے زیادہ اور کوئی تمنا نہیں کہ موقع ملے تو وہ دوسری قوموں پر حکومت کریں۔ انقلابی فرانس نے پہلے تو اپنے انقلاب کے آتشیں عقیدوں کو تلوار کے زور سے پھیلانا اور پھر اس کے بعد اپنی شہنشاہی غفلت کے لیے یورپ کو فتح کرنا چاہا، اس کے بعد جب ہنگری نے اسٹریا کے استبداد سے اپنی گلو خلاصی کر لی تو اس نے خود اپنی محکوم قوموں کی قومی تمناؤں کو سختی کے ساتھ دبائے کی پالیسی اختیار کی۔

حالیہ واقعات ہی کو لیجیے۔ یہ سیاسی فیصلے کے لیے بہت ہی تازہ ہیں۔ لیکن ان کے متعلق یہ دکھانے کے لیے بہت کچھ کہا گیا ہے کہ خود مختاری سے جمہوریت میں تبدیلی نے متحارب قومیت کے میلان کو روکنے میں بہت کم کام یا بالی حاصل کی ہے۔

قومیت کے نتائج کئی طرح تباہ کن ثابت ہوئے۔ قومیت کے اثرات | یکے بعد دیگرے مسلسل بین الاقوامی جھگڑے اٹھ

کھڑے ہوئے، اور یہ وہ جھگڑے ہیں جو بڑے پیمانے پر نہ صرف اور جانی نقصان کو بڑھا رہے ہیں۔ خود ہمارے زمانے میں یہ بات واضح ہو گئی ہو کہ قومی جنگ اب سائنس کی ایجادوں اور اس کی بے پناہ طاقتوں سے کام لے کر تہذیب کو تباہ و برباد کر دینے کی دھمکی دے رہی ہے۔ جرمین جنگ اپنے مختلف نتائج کے علاوہ دو کروڑ جانوں کی قیمت ادا کر چکی ہے اور تجارت اور صنعت و حرفت اور انسانیت کی فلاکت اور فساد کشی میں اس کے پورے پورے اثرات ابھی تک اچھی طرح محسوس نہیں کیے گئے ہیں۔

اس طرح انسانیت کے مفاد کے لیے ضروری ہو کہ پُرانی طرز کی قومیت یعنی ایسی قومیت کا خاتمہ ہو جائے جس کے معنی یہ ہیں کہ اقوام عالم انتہائی خطرناک ہتھیاروں کے ساتھ لیس منظم فوجوں کے ساتھ ایک دوسرے سے مصروف پیکار ہوں، ان فوجوں کو ریاست کی طرف سے مالی اور جانی امداد حاصل ہے۔ ایک لمحے کی اطلاع پر (معمولی سے معمولی وجوہ کی بنا پر) خوں ریز معرکوں میں مصروف ہو جائیں۔ ان معرکوں کے دوران میں ریاست کے مقابلے میں فتح حاصل کرنے کے لیے جو وقتی طور پر قومی دشمنی سمجھی جاتی ہے، ہر چیز یہاں تک کہ ناپیدائشوں کی بقا کے امکانات تک قربان کر دیے جاتے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح قرون وسطیٰ میں تہذیب نے جاگیر نظام کی روک تھام کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی طرح آج بھی اس سے بڑے پیمانے پر ضرورت ہے کہ تہذیب کی بقا کے لیے قومیت کی روک تھام کی جائے۔

صحیح طور پر قومیت کے روکنے کے مسئلے کے لیے ضرورت ہے کہ لوگوں کی وفاداری اور ایثارش خدمت گزاری کو ایک ایسے مقصد تک وسعت دی جائے جو قوم کے خیال سے بہت دور ہے، ”حب وطن کافی نہیں“۔ بلکہ ہمیں ایک عالمی

وفاداری اور ایک عالمی خدمت گزاری کی ضرورت ہے۔ اگر لوگ اپنی قوم کے سوا آزادی اور خوشی کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتے تو یہ ڈر ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ خوفناک تباہی ہوگا، کیوں کہ قوموں سے قومیں دست و گریباں ہوتی رہیں گی اور جنگ میں جسے سائنس بہت جلد اس قدر خطرناک بنا دے گی کہ لڑنے والے اور نہ لڑنے والے سب یکساں طور پر عام تباہی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ایسی جنگ دوسری قوموں کو بھی جنگ میں گھسیٹی رہے گی، یہاں تک کہ ساری دنیا خود اپنے ہاتھوں خود کشتی کرنے لگے گی کیوں کہ انسانیت آپس میں اس طرح مربوط ہے کہ کسی بڑی قوم کے لیے زیادہ دنوں تک غیر جانبدار رہنا ناممکن ہے۔ یہ بات جنگ عظیم میں اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے۔

لیکن اگر دوسری طرف وفاداری اور آزادانہ خدمت گزاری کے جذبے کو قومی حس وطن سے آگے عالمی حس وطن تک وسعت دی جائے۔ اور اگر انسانی جذبہ جنگ کو امراض، افلاس، عدم مساوات اور نا انصافی کے خلاف جنگ کرنے میں لگا دیا جائے تو امید ہوتی ہے کہ دنیا نہ صرف تباہی سے بچالی جائے گی بلکہ انسانی سلامتی، خوش حالی اور آزادی کو بھی بے پایاں اور عظیم الشان وسعت دی جاسکے گی۔

تاریخ کے دورِ حاضر کے دوران میں دنیا کے موجودہ دنیا کا مسئلہ

سائے جو مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک تنگ اور جارحانہ قومی حس وطن کی بجائے، وسیع وفاداریوں کو اس کا بدل بنایا جائے۔ ایسی وفاداریوں کا رخ بڑھتے ہوئے انسانی اجتماعات کی طرف ہونا چاہیے

(صفحہ ۱۶۸ کا حاشیہ)۔ زس کے دل کے آخری الفاظ جو خود بھی ایک زبردست حس وطن انگیز عورت تھی اور جنگ عظیم میں قومیت کا شکار ہوئی۔

جو دنیا کے وسیع سے وسیع رقبوں میں بستے ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہ مسئلہ نہ تو داخلی جمہوریت سے حل ہو سکتا ہے اور نہ ایسی آزادی سے جو بیرونی شہنشاہیت کے زیر اثر ہو۔ یقیناً تاریخ بتاتی ہے کہ جدید یورپ میں قدیم یونان کی طرح آزاد اداروں اور خود مختاری کا حصول قوموں میں دوسری قوموں کی آزادی کو محدود کر دینے کا دلی شوق پیدا کرتا جا رہا ہے تاہم ایسی صورت میں صاف ظاہر ہے کہ ایک ایسی ریاست کی ہمالگی جس پر ایک مطلق العنان بادشاہ یا ایک فوجی طبقہ حکم ران ہو، آزاد اور مہذب قوم کی دولت عامہ کے لیے بے ضرر بھی نہیں ہو سکتی۔ ایسے مطلق العنان بادشاہ، یا ایسے فوجی طبقے کے لیے بیرونی جارحانہ کارروائیوں کے ذریعے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی ہوس ہوتی ہے۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ مہذب قوموں کی دولت عامہ میں ایسی ریاستوں کا وجود ناممکن ہو گا جو دوسری ریاستوں کے زیر اقتدار ہوں کیوں کہ شہنشاہی قومیت ایک طاقت ور قوم کو دوسری کم زور قوم پر غلبہ اور استحصال کی اجازت دیتی ہے، اس کا وجود خود اس بات کا ثبوت ہے کہ جارحانہ قومیت کی ابھی روک تھام نہیں کی گئی اور آزادانہ تہذیب حاصل نہیں ہوئی ہے۔

لہذا اس حل طلب مسئلے کو اس طرح سلجھانا چاہیے کہ جمہوری اور خود مختار سلطنتوں کو کسی ایسے معاہدے کے ذریعے متحد کیا جائے، جو جارحانہ اور شہنشاہی قومیت کو زیادتیوں سے باز رکھے۔

قومیت کے فائدے | قومیت کے جذبے نے اپنے خطرات اور ناگوار یوں کے باوجود انسانیت کو بہت سے

فائدے پہنچائے ہیں۔ مثلاً موجودہ دنیا میں حکومت خود اختیاری کے یونانی تصور

(یعنی ایک چھوٹی سی قوم کا حق خود اختیاری ہر قسم کے شہنشاہی غلبے اور استحصال کی بنیادی نا انصافی کو واپس لانے میں یہی سب سے بڑا عامل تھا) اس سے ہم بعد میں بحث کریں گے۔ قومیت نے شاعروں، خطیبوں اور مصوروں کے لیے بے شمار موضوع اور جذبات کا کبھی نہ خشک ہونے والا چشمہ ہتیا کر کے ادب اور فنون لطیفہ کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ اس نے تعلیم کی اشاعت اور تمام دنیا میں جدید تمدن کے مادی فوائد مثلاً ریلوے، ٹیلی گراف اور زندگی کے اعلیٰ معیار کی توسیع میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی قوموں میں ایسی کارگزار یوں میں مسابقت کے لیے غرض آئند رقابت پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے بے شمار جاں بازانہ ایثار کیے ہیں۔ جن میں سیکڑوں بہادروں نے اپنی قوموں کے لیے جانیں دے دی ہیں۔ اس نے ایک ایسے طریقہ کار کو ترقی دی جس کے ماتحت فرداً فرداً ہر شہری کی جبلتیں اور سرگرمیاں زیادہ سے زیادہ مکمل طور پر مملکت کے اغراض کے تابع کر دی گئی ہیں۔

تاہم ان تمام برکات کے باوجود جنگ عظیم نے واضح کر دیا کہ تا وقتے کہ قومی وفاداری کو وسعت نہ دی جائے اور حب وطن میں پوری انسانیت کو شامل نہ کیا جائے قومیت انسانیت کو بالکل برباد کر دینے کا خطرہ اس سے پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کون قوتیں ہیں جو اس بے لگام قومیت کو روکنے اور انسانی وفاداریوں کو وسعت دینے کے لیے گزشتہ زمانے میں استعمال کی گئیں اور جو شاید مستقبل میں بھی کام آسکیں؟

توازن قوت کا خیال غالباً اطالیہ میں پیدا ہوا
اور وہاں سے سوٹھویں صدی کی ابتدا میں تمام
یورپ میں پھیل گیا۔ انگریزوں کے مطلق العنان

قومیت کی روک تھام
(۱) توازن قوت

بادشاہ ہنری ہشتم (۱۵۰۹ء - ۱۵۴۷ء) کے طاقت ور اور الو العزم وزیر کارڈنیل ولزی کے متعلق بہت سے مورخوں کا خیال ہو کہ اس نے انگلستان کے تعلقات خارجہ کو اسی اصول پر چلایا تھا۔ اس کے زمانے میں فرانس شہنشاہ چارلس نجم سے جو اسپین کا بھی بادشاہ تھا، اطالیہ پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے لڑ رہا تھا۔ انگلستان کو اطالیہ کے مسئلے سے کوئی براہ راست دل چسپی نہیں تھی لیکن اتحاد میں عیارانہ تبدیلی کے ذریعے ولزی نے ان جنگوں میں انگلستان کو ایک اہم شریک بنا دیا۔ اتحادوں میں عیارانہ تبدیلی اس طرح کی کہ پہلے تو اسپین سے اتحاد کیا پھر فرانس سے، پھر دوبارہ اسپین سے اور پھر مکرر فرانس سے اتحاد کیا۔ ولزی نے کچھ ایسی ترکیب کی کہ براعظم یورپ کے ان دونوں بڑے بڑے حکمرانوں نے اس کے آقا کے ساتھ برابری کا ہوتاؤ کیا اور اس کو اپنا مد مقابل سمجھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی جانب سے بھی ایسے فوق کو ناراض نہیں کیا جاسکتا تھا، جو ایک مخالف یا ایک حلیف کی حیثیت سے طاقت ور بن سکتا تھا۔ ہنری کے تلون اور ولزی کی عیارانہ حکمت عملی نے ستھارین میں ایک سرسری توازن قائم کر دیا۔ اور دونوں طرف سے کوئی بھی اتنا قوی نہ ہو سکا کہ وہ شاہ انگلستان اور اس کے وزیر کو نظر انداز کر سکتا۔

اس الذمہ اور ذلیل سی حکمت عملی کو ملکہ الزبتھ نے خود اپنی شادی کے معاملے میں مختلف حالات کے ماتحت جاری رکھا۔ فرانس اور اسپین دونوں اپنے شاہی خاندان کے کسی رکن کے ساتھ اس انگریز ملکہ کی شادی کے تہمتی تھے اور اس طرح انگلستان سے اتحاد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود مختاری کے اس عہد میں جیسے جیسے واقعات گزرتے گئے، یہ بات مناسب اور قدرتی سمجھی جانے لگی کہ پوری قوم کو اس کے فرماں روا کے کسی خاندانی معائنہ

پر قربان ہو جانا، یا جنگ میں کود پڑنا چاہیے۔ الزبتھ نے اپنی شادی کے معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اور اپنے متعدد خواست گاروں میں سے کسی کا بھی انتخاب نہیں کر سکی۔ اسی چیز نے اسپین اور فرانس دونوں کو ساہا سال تک اس کا دوست بنائے رکھا۔

آخر کار جب اسپین نے ندرلینڈ میں اپنی پروٹسٹنٹ رعایا پر بے دردی سے مظالم ڈھائے اور اپنے امریکی مقبوضات کو بے رحمی کے ساتھ لڑٹنا شروع کیا تو اس کا وجود بقیہ دنیا کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی الزبتھ نے اپنے آپ کو اس زبردست معرکے میں مبتلا کر لیا، جس کا خاتمہ اسپینی آرمیڈا کی شکست پر ہوا۔ اس طرح یورپ کی دائمی بھلائی کے لیے انگلستان نے توازنِ قوت کو ٹھیک کر دیا، کیوں کہ یہ اسپینی غلبے کی وجہ سے خطرے میں پڑ گیا تھا۔

ترہویں صدی کے آخر میں فرانس نے اسپین کی طرح اتنی قوت حاصل کر لی کہ اس سے دوسروں کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان اور ہالینڈ نے ولیم آف آرنج (انگلستان کا ولیم ہو) کی دُور اندیشانہ اور مصمم تیار میں، دوزبردست لڑائیاں توازنِ قوت ٹھیک کرنے کے لیے لڑیں، کیوں کہ وہ اس وقت خطرے میں تھا۔

اٹھارہویں صدی کے دوران میں توازن کا خیال یورپی سیاست کا ایک مسئلہ اور بنیادی اصول بن گیا۔ اس زمانے کے مطلق العنان بادشاہوں کی ذاتی خصوصیتوں اور الجھی ہوئی حکمت عملیوں نے توازنِ قوت کو بہت تغیر پہنچ کر دیا تھا۔ چنانچہ توازن ہمیشہ خطرے میں رہتا تھا اور متعدد بڑی بڑی جنگیں اسی کا نتیجہ تھیں۔ ان جنگوں میں سات سالہ جنگ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۳ء) جس

میں برطانیہ اور پرویشیا فرانس کے خلاف متحد ہو گئے تھے، اور انقلابی اور
 نپولینی فرانس کی کشمکش جو ۱۷۹۲ء سے ۱۸۱۵ء تک جاری رہی، سب سے
 زیادہ اہم ہیں۔ پھر ایک بار انگلستان نے فرانس کی جارحانہ کارروائیوں کے
 خلاف زبردست حصہ لیا اور اس طرح آخر کار توازن قائم کر دیا۔

اس کے بعد انیسویں صدی میں یہی حکمت عملی جو روس کے بڑھتے ہوئے
 اقتدار کے خلاف استعمال کی گئی، جنگ کریمیا کا باعث ہوئی۔

آخر کار بیسویں صدی میں جرمنی کے عزائم سب سے عظیم ترین جنگ کا
 باعث ہوئے۔ یہ لڑائی اس لیے لڑی گئی تھی کہ توازن قوت کو پھر ایک بار
 محفوظ اور یورپ کو جرمن قومیت کے گھمنڈ اور اس کی دست برد سے بچا
 لیا جائے۔

اس طرح چار سو سال سے انگلستان اور بڑی حد تک یورپ کی
 دوسری حکومتوں کی مستقلاً یہی پالیسی رہی ہو کہ ایسی انفرادی قوم کی مخالفت
 کی جائے جو ناجائز دباؤ یا جارحانہ کارروائیوں کے ذریعے سے وقتی طور پر
 یورپ کی دوسری قوموں کو غلام بنانے کی دھکی دیتی ہو۔ اس ذریعے سے
 قومی خود غرضی کو روکنے کی ایک حد تک کوشش کی گئی۔

لیکن توازن قوت کا تصور ہی بجائے خود غیر مستقل اور خطرناک ہے۔ سلطنتوں
 کو کم زور یا طاقت ور بنانے والے ہزاروں عامل ہوتے ہیں، ایسے ہی ایک
 عامل کی حیثیت سے توازن قوت کا خیال ناکام ثابت ہو چکا ہے خصوصاً
 ایسی صورت میں جب کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتوں میں بے شمار سازشیں
 جھگڑے اور رشک و حسد یہ سب باتیں موجود تھیں، یہ خیال عرصہ دراز تک
 کم زور سا توازن برقرار رکھنے اور کسی ایک ریاست کو ناجائز غلبہ حاصل کرنے

سے روکنے میں بالکل ناکام رہا۔ دولت کی فراوانی اور سائنس کی ایجادات، یا اتحاد اور حکومت کی کارکردگی، خود مختاری، یا جمہوریت کے لیے دستور میں تبدیلی یہ دونوں جارحانہ ہو سکتے تھے، ہمسایہ ریاستوں کے حالات یا طرز حکومت میں تغیر اور ایسی ہی تمام دوسری قوتوں نے ثابت کر دیا کہ وہ کسی وقت بھی ایک قوم کو ناجائز غلبہ دلانے کے لیے توازن کو درہم برہم کر سکتی اور یورپ کو جنگ میں گھسیٹ لے سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی توازن کی حکمت عملی کا مطالبہ ہو کہ ایسی متوقعہ جنگ کی تیاری کے لیے اتحادوں میں مسلسل کانٹ چھانٹ اور رد و بدل کیا جائے۔ ایسے اتحاد قائم کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اتحاد کا ہر رکن اپنے اتحادیوں سے کیے ہوئے معاہدے کی رڈ سے مجبور ہو کہ اپنی فوجی اور بحری قوتوں کو انتہائی ممکنہ حد تک ترقی دے۔ اس طرح بڑا عظیم یورپ کی قوموں نے منظم اور وسیع لشکر گاہوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ قومیں مستحکم قلعہ بند سرحدوں پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہیں۔ سال بہ سال یہ جبراً بھرتی شدہ زبردست فوجوں اور انتہائی سائنسی فنک اور گراں خرچ بحریوں کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے زیادہ سے زیادہ آدمی اور زیادہ سے زیادہ پُر لگائے پر مجبور ہوتی جا رہی ہیں۔ اس طرح توازن کی حکمت عملی نے بعض وقت بے لگام قومیت کی بڑائیوں کو روکنے کی بجائے انھیں اور تقویت دی ہے۔ غرض اس حکمت عملی کے متعلق سب سے اچھی بات جو کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہو کہ ایک دفعہ صحیح توازن کے درہم برہم ہوجانے کے بعد اسے دوبارہ قائم کرنے کا یہ ایک بھڑا، ناکارہ گراں خرچ اور غریب طریقہ ہے۔ توازن کی حکمت عملی کو برقرار رکھنے کی کوشش میں نتیجہ

(۲) اتحادات

جو بڑے بڑے اتحادات مختلف وقتوں میں ہوئے، وہ اس لائق ہیں کہ ان کا ذکر تفصیل سے کیا جائے۔ سترھویں صدی کے آخری زمانے

میں ایسے اتحادات مسلسل ہو رہے تھے اور ان کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ ان اتحادوں میں خاص طور پر ولیم آف آرنج نے ان تھک کوشش کے ساتھ حصہ لیا تاکہ فرانس کے کوئی چہار دہم کے عزائم کی روک تھام کی جاسکے۔ ان اتحادوں کو قائم رکھنے میں ولیم کو بے انتہا مشکل پیش آئی، تاہم اس کے مرنے کے بعد اسپینی وراثت کے لیے جو زبردست جنگ ہوئی (۱۷۱۳ء-۱۷۱۴ء) اس میں ولیم کی حکمت عملی نے بڑا فائدہ پہنچایا۔ اس جنگ میں انگلستان، ہالینڈ اور آسٹریا کوئی کی جارحانہ کاروائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو گئے تھے لیکن یہاں بھی انگلستان کے مشہور سیاست دان سپہ سالار رابرٹ ہوو کو اپنے حلیفوں کے اتحاد کو برقرار رکھنے میں انتہائی دشواری پیش آئی۔

اٹھارھویں صدی کے دوران میں پردیش کے خلاف اتحادات قائم کیے گئے کیوں کہ پروٹیشا فریڈرک اعظم کے ماتحت جارحانہ میلانات کو ترقی دے رہا تھا۔ اس صدی کے اختتام پر زبردست انگریز ماربر ولیم پیٹ خاص طور پر ان اتحادوں کا ذمہ دار ہے جو فرانسیسی جمہوریہ اور نپولین سے لڑائیوں کے باعث ہوئے۔ نپولین کے فرانس کی آخری شکست کے بعد آسٹریا اور روس کے شہنشاہوں اور پروٹیشا کے درمیان ایک اتحاد قائم کیا گیا۔ اور اس میں فرانس کا بحال شدہ بادشاہ اور دوسرے حکمران بھی شریک کیے گئے۔ بظاہر اس اتحاد کا مقصد یورپ میں امن قائم کرنا تھا، لیکن اس کا اصل مقصد جمہوریت کو مضحک اور خود مختاری کے تحفظ کے ساتھ ساتھ برعزت قوموں اور ان کے حکمرانوں کی جارحانہ کاروائیوں کی روک تھام کرنا تھا۔ چنانچہ آزادانہ خیالات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ اس کی قوت میں بھی زوال آنے لگا۔

آخر میں حالیہ جنگ عظیم میں دنیا کی تمام بڑی اور بہت سی چھٹی قوتیں

غلبہ عالم کے لیے جرمنی اور اس کے اتحادی آسٹریا، بلغاریہ اور ترکی کی کوششوں کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو گئیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایسے تمام اتحادوں کو توازنِ قوت کی حکمتِ عملی سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ان میں قومیت کی زیادتیوں کو روکنے کی بہت کم قوت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ اس قوت کو استعمال کریں تو جبری مداخلت کے علاوہ خوف ناک غور ریزی اور بے حساب رپڑے سے کام لیا ہو گا۔ اس کے علاوہ ایسے اتحادوں پر قابو رکھنا اور ان کو متفقہ طور پر قائم رکھنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ اتحادیوں کو جب کبھی صلح کر لینے میں سہولت نظر آتی ہے، وہ اپنے دوستوں کو پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر علیحدہ صلح کر لیتے ہیں۔ اسی طرح حملہ آور قوم میں متحدہ کمال اس کے لیے فوجی استبداد کے زبردست مواقع پیدا کر دیتی ہے۔

جارحانہ قومیت کی بڑائیوں کو روکنے کی ایک اور (۳) معاہدے | کوشش یورپی معاہدوں کا طویل سلسلہ ہے۔ یہ معاہدے مختلف وقتوں میں ایک جنگ کے بعد صورت حال کو ٹھیک کرنے اور آئینہ دار لڑائیوں کو روکنے کے لیے ترتیب دیے گئے تھے۔ پہلا کل یورپی معاہدہ، وسٹ فالیہ کا معاہدہ تھا، جس نے ۱۶۴۸ء میں تیس سالہ جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ انگلستان کے سوا یورپ کی تمام بڑی اور بہت سی چھوٹی سلطنتیں اس معاہدے میں شریک تھیں۔ اس سے جرمن رئیسوں کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ آزادی مل گئی، کیوں کہ اس معاہدے کی رو سے وہ جرمن شہنشاہ کی اجازت کے بغیر صلح یا جنگ کر سکتے تھے۔ اسی نے فرانس، سویڈن اور برانڈن برگ (پروشیا) کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے

سوئزر لینڈ اور ہالینڈ کی قومیت کو باضابطہ تسلیم کر دیا۔ کیوں کہ سوئزر لینڈ نے آسٹریا اور ہالینڈ نے اسپین کی شہنشاہیت کے خلاف کام یاب بغاوت کی تھی۔
 لوچی چہار دہم کے خلاف بڑی بڑی لڑائیوں کے بعد متعدد اہم عہد نامے مرتب کیے گئے۔ ان عہد ناموں میں سب سے آخری عہد نامہ یوٹ ریح کا عہد نامہ ہے۔ جنگ میں مارکیٹرو کی شان دار فتوحات کے باوجود فرانس کے ہوشیار بادشاہ نے اپنے مخالف زبردست اتحاد کی کم زوریوں اور لنفاق سے فائدہ اٹھا کر اس طرح مرتب کیا کہ یہ خود بھی اس کی فتح سے کچھ کم نہ تھا۔ چنانچہ لوچی نے اسپین کا تاج اور اس کا بڑا علاقہ اپنے خاندان کے لیے حاصل کر لیا۔ جرمن شہنشاہ نے جو دراصل ۱۶۴۸ء کے بعد سے آسٹریا کا شہنشاہ بن گیا تھا، اطالیہ اور مدر لینڈ کے بڑے بڑے علاقے حاصل کر لیے۔ اس طرح جو ملک حاصل ہو وہ فرانس سے نہیں بلکہ اسپین سے لیا گیا۔ اسی معاہدے کی رو سے پروشیا کا ملک ایک سلطنت بن گیا اور سیوائے کا علاقہ صقلیہ کے عطیے سے شاہ راو ترقی پر کام زن ہو گیا۔ یہی وہ علاقہ ہے جو ڈیڑھ سو سال بعد سلطنت متحدہ اطالیہ کا مرکز بننے والا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے بقیہ حصے میں کل یورپی تین معاہدے اور ہوئے۔ آسٹریا کی جانشینی کی لڑائی (۱۷۴۰ء) اور سات سالہ جنگ (۱۷۴۰ء) کو ختم کر دینے والے معاہدوں کے بعد سے پروشیا نے ایک حریف اور دست دراز قوت کی صورت اختیار کر لی۔ یورپ اس کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے سے عاجز تھا۔ اور ادھر انگلستان کی نوآبادیاتی ریاستوں کو مستقل طور پر عروج ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی جنگ کے اختتام پر (۱۷۸۳ء) ممالک متحدہ نے اپنی آزادی حاصل کر لی۔

نپولینی جنگوں کے اختتام پر ویانا کی کانگریس (۱۸۱۴ء - ۱۸۱۵ء) نے گزشتہ تیس سالہ جنگ و جدل اور مصیبتوں کے بعد دائمی امن کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی۔ بعض لحاظ سے اس کا کام اطمینان بخش رہا۔ فرانس کی غلط کاریوں کے باوجود اس سے ناواقف سختی کا برتاؤ نہیں کیا گیا، اور اس کو اپنی قدیم سرحدوں کو برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے علاوہ پروشیا کی یہ تجویز کہ فرانس کو آئیس اور لوئر پاؤں کے علاقوں سے محروم کر دیا جائے مسترد کر دی گئی۔ بروہ فروشی کو ممنوع قرار دیا گیا۔ سوئٹزرلینڈ کے علاقے میں توسیع کی گئی اور اس کی دائمی غیر جانب داری کی ضمانت دی گئی۔ توازن قوت کو جسے نپولین نے بڑی طرح درہم برہم کر دیا تھا، اتنی اچھی طرح پھر قائم کیا گیا کہ وہ مزید پالیس سال تک برابر باقی رہا۔ لیکن متعدد طریقوں سے بڑی شہنشاہی ملکوں کے لیے کم زور قومیتوں کے حقوق کی بھیٹ دی گئی۔ پلینڈ کو آسٹریا اور روس کے درمیان تقسیم کر دیا گیا، اور روس کو اس کا بڑا حصہ ملا۔ فن لینڈ کو بھی روس کے حوالے کر دیا گیا۔ روس اب فرانس کے بعد یورپی آزادی کا سب سے بڑا دشمن اور توازن قوت کو درہم برہم کرنے والا بن گیا تھا۔ پروشیا کو بڑے بڑے اور اہم علاقے دیے گئے۔ اور اس سے وہ جرمنی میں کامل برتری حاصل کرنا گیا۔ اطالیہ کا جنوبی علاقہ آسٹریا کے حتمے میں آیا جہاں اس کی حکومت غیر مقبول تھی اور جہاں وہ اطالوی مزاحمت کی وجہ سے مظالم ڈھاتا رہا تھا۔ بلجیم کی گردن پر ہالینڈ کے ناگوار اتحاد کا جھوٹا رکھ دیا گیا، جسے ولندیزیوں کے خلاف ایک بلجیمی بغاوت نے ۱۸۳۰ء میں ختم کر دیا۔ اس کے بعد شہور انگریز ہتھیار شکن کو اس شہور کاغذ کے پرزے کے متعلق سلسلہ جنابی میں کام یابی ہوئی۔ جس میں بلجیم کی غیر جانب داری کی ضمانت دی گئی تھی، اور جس کو چپاک

کر دینے کی وجہ سے ۱۹۱۴ء میں جرمنی کے خلاف برطانیہ عظمیٰ نے جنگ میں شرکت کی تھی۔

انیسویں صدی کے بقیہ حصے میں بہت سی لڑائیاں اور بہت سے معاہدے ہوئے لیکن ان میں ایک بھی کل یورپی اہمیت رکھنے والا نہیں کہلایا جاسکتا۔ جنگ کوسمیا (۱۸۵۴ء - ۱۸۵۶ء) جس نے روس کی وجہ سے توازن پھر قائم کر دیا، نسبتاً ایک چھوٹا سا معاملہ تھا۔ یہی حال ان جنگوں کا تھا، جن میں اطالیہ نے اپنی قومیت حاصل کر لی۔ جرمن سلطنت، آسٹریا کے ساتھ ایک مختصر جنگ (۱۸۶۶ء) اور نپولینی سلطنت سے کم درجے نئی فرانسیسی سلطنت کے ساتھ نسبتاً ایک زیادہ اہم جنگ (۱۸۷۱ء) کے بعد اپنی جدید اور اعلیٰ درجے کی منظم شکل میں قائم ہو گئی۔ اس عہد نامے سے جس پر جنگ ختم ہوئی، جدید جرمنی کے اس جذبے کو ظاہر کر دیا جس سے وہ مغلوب ہو رہا تھا۔ فرانس سے دو بڑے بڑے صوبے چھین لیے گئے اور فرانس کو آتش انتقام میں جلنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

انیسویں صدی کے آخری حصے کے دوران میں یورپی معاملات کی راہ نمائی اور توازنِ قوت کی حمایت بڑی

(۴) یورپی سنگت

بڑی سلطنتوں کے ایک فضول سے راضی نامے سے کی گئی تھی۔ یہ راضی نامہ بعض وقت "یورپی سنگت" کہلاتا ہے۔ جرمنی، روس، آسٹریا، فرانس، انگلستان اور اطالیہ (اگرچہ یہ کم اہمیت رکھتا تھا) تمام اہم مواقع پر کم و بیش دوستانہ مفاہمت پر راضی ہو گئے تھے۔ اس سنگت کا سب سے اہم کارنامہ برلن کی کانفرنس ہو جس نے روس اور ترکی کی جنگ (۱۸۷۷ء - ۱۸۷۸ء) کو بند کر دیا۔ دوسری سلطنتوں نے مل کر ترکوں پر رویوں کی کامل فتح کے ثمرات سے

روس کو محروم کر دیا۔ روس کو یورپ میں ترکی سلطنت کا خاتمہ کر دینے اور اس کی جگہ اس سے زیادہ وسیع بلغاری سلطنت بنانے سے باز رکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ بلقان میں آذربائیجان آزاد ریاستیں قائم کی گئیں، لیکن ملک کے بڑے حصے پر ترکی ہی کا قبضہ رہا۔ اس انتظام میں، اور ایسے ہی متعدد دیگر مسائل کے حل کرنے میں یورپی سنگت نے ایک عام اتفاق پر پہنچنے کا ایک بھونڈا سا طریقہ استعمال کیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ان بڑی بڑی سلطنتوں درمیان تازک اختلاف کے رونما ہونے کا اندیشہ تھا۔ بہر حال انیسویں صدی کے انتظام اور بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں رفتہ رفتہ یہ بھونڈا سا یورپی سنگت ناپید ہو گیا۔ اور اس کی جگہ دو جماعتیں — جرمنی، آسٹریا اور اطالیہ کا اتحادِ ثلاثہ اور روس، فرانس اور انگلستان کا ایتلافِ ثلاثہ — پیدا ہو گئیں۔ اس کے بعد جنگِ عظیم شروع ہوئی، اس میں اطالیہ نے بے حد پس و پیش کے بعد اپنے اتحاد میں تبدیلی کر لی۔ اور ایتلافِ ثلاثہ کا شریک ہو گیا۔

جنگِ عظیم کے خاتمے پر ۱۹۱۹ء میں دنیا کی از سر نو تعمیر کے لیے دنیا کی سب سے بڑی صلح کانگریس منعقد ہوئی۔ اس پیرس کانفرنس کے نتیجے کے طور پر جو مسلسل معاہدات کیے گئے، ان میں تمام قوموں کی خود مختاری کے حق کو تسلیم کیا گیا، چاہے ایسی قومیں کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہوں۔ بعض لحاظ سے اس میں خطرناک غلطیاں ہوئیں، لیکن اس کے ساتھ ہی آئندہ کے لیے قومیت کی بدعنوانیوں کو روکنے کے لیے کافی غور و فکر کے بعد مجلسِ اقوام مرتب کی گئی۔

(۵) بین قومی ثالثی | گزشتہ صدی کے دوران میں جنگ کے موقعوں کو کم کرنے کی کوشش میں تھوڑی بہت کامیابی ضرور

حاصل ہوئی ہو۔ بعض سلطنتوں نے باہمی اتفاق سے آپس کے متنازع مسائل کو ثالثی کے لیے ایک غیر جانبدار عدالت میں پیش کرنے کی پابندی قبول کر لی۔ اس قسم کا پہلا اہم راضی نامہ ۱۹۲۲ء میں برطانیہ عظمیٰ اور ممالک متحدہ امریکہ کے درمیان ہوا تھا۔ یہ معاہدہ، معاہدہ جسے کہلاتا ہے۔ اس کے بعد سے اسی قسم کے متعدد معاہدے مرتب ہوئے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ایسے معاہدوں کے قوت کی جگہ انصاف کے ذریعے سے جنگ و جدل کے مواقع کو روکنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن ریاستیں اپنے متنازع مسائل کو اس قسم کی ثالثی عدالتوں میں پیش کرنے کو اپنی عزت اور اپنی آزادی کو متاثر کرنے والی چیز سمجھتی ہیں اس لیے وہ ایسی ثالثی عدالتوں سے نفرت کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ نفرت خاص طور پر ۱۹۹۷ء سے ۱۹۰۶ء کی ہیگ کانفرنسوں میں بہت نمایاں ہو گئی۔ اس سے اگرچہ بین قومی ثالثی نظری طور پر کتنی ہی قابل تعریف نہ بن گئی ہو، لیکن بین قومی بے اعتمادی اور دشمنی کے امراض کے علاج کے لیے یہ عملاً بہت ناموزوں ہو۔

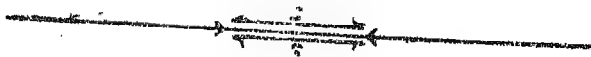
مذکورہ بالا اعتراضی جو ثالثی معاہدوں کے

بین قومی اقتدار کی ضرورت | ساتھ مخصوص ہوئے اس کے علاوہ ان تمام معاہدوں کی کم زوری یہ ہو کہ وہ جارحانہ کاروائیوں کو روکنا تو چاہتے ہیں، لیکن ان پر عمل کرائے میں انھیں بڑی دشواری پیش آتی ہو۔ معاہدے کے فریقین کے اذپر کوئی ایسا اعلان اقتدار نہیں ہو جو معاہدے کے شرائط کو مخصوص فائدے کے لیے توڑنے سے موثر طور پر باز رکھ سکے۔ ۱۹۱۲ء میں جرمنی نے "کانڈکے پرنس" کو چاک کر دیا، حالانکہ اس پر خود جرمنی نے اپنے دستخط کیے تھے اور الجیم کی غیر جانبداری کی ضمانت دی تھی۔ جرمن کا یہ فعل مشرف اس حقیقت کی ایک مثال ہو کہ جب کوئی قوم لڑنے پر تیار ہوتی ہو یا اسے مہیب

فوجی ضرورت پیش آتی ہے، تو اس کو اپنی عزت کا بھی خیال نہیں رہتا۔ اس کو ان معاہدوں کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا جن کی ترتیب خود اس کی مدد سے ہوئی تھی اور جن کے احترام کا اس نے وعدہ کیا تھا۔

جس طرح توازن قوت ایک ناقابل اعتماد انتظام ہے اور اس کے ہر لمحہ درہم برہم ہو جائے گا، وہی جس طرح اتحادات کسی غلط حکمت عملی کو درست کرنے کی بے ڈھنگی اور گراں خرچ کوششیں ہیں، جس طرح بڑی بڑی سلطنتوں کی سنگت خود غرض شہنشاہیت سے دنیا کو زیادہ دنوں تک نہ بچا سکی، بالکل اسی طرح معاہدات بھی ناکام رہے ہیں۔ یہ معاہدے بڑی محنت اور جاں فشانی کے ساتھ مرتب اور بنجیدگی کے ساتھ منظور بھی کیے گئے ہوں تو بھی ایک ایسی بین قومی قوت کی غیر موجودگی میں جو معاہدوں کی پابندی پر مجبور کر سکے، بالکل بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ کوئی قوم اپنی سر بلندی یا اپنی جان بچانے کے لیے جی توڑ کر لڑ رہی ہو تو وہ ان سے دفعتاً بے التفاتی برتی اور ان سے دست بردار ہو جاتی ہے۔

پس اس سے ظاہر ہے کہ قومیت کے ہاتھوں تہذیب کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے ایک ایسے بین قومی ادارے کی ضرورت ہے جو ایک انفرادی قوم سے برتر ہو۔ اب ہمیں ان کوششوں اور ان خطوطِ عمل کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اس قسم کے اقتدار کے قائم کرنے کے لیے کی گئی ہیں اور جن سے ایسی کوششوں میں کام یابی کے حصول کو بہت زیادہ امید ہے۔



آٹھواں باب

بین قومیت

۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۶ء میں ہیگ میں صلح کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس زائرؤس کی کوششوں کی رہنمائی تھیں۔ ان کانفرنسوں نے قومی اسلحہ سازی پر تحدید عائد کرنے کی کامیابی کی۔ بین قومی ثالثی کی مستقل عدالتیں قائم کی گئیں تاکہ ایسی نزاعوں کا تصفیہ کیا جائے جو عوامی سے ان کے سپرد کی جائیں۔ اس کے ساتھ ہی دورِ حاضر کی جنگی دہشتوں کو کم کرنے کے لیے قواعد بھی مرتب کیے گئے۔

لیکن جنگِ عظیم کے چھڑنے ہی جنگ میں زہریلی گیس بے روک ٹوک استعمال ہونے لگی۔ ہوائی جہازوں سے شہروں پر بم باری کی گئی۔ اور آب و ہوا کشتیوں سے ہسپتالی اور تجارتی جہازوں کو تباہ کیا جانے لگا۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ جنگ سے بچنے یا اگر جنگ چھڑ جائے تو اس کو مہذب بنانے کی جو کوشش ہیگ یا دوسرے مقاموں پر کی گئی تھیں، وہ سب بے سود ثابت ہوئیں۔

پیرس کی صلح کانفرنس ۱۹۱۹ء کے دوران میں مسٹر ولس صدر جمہوریہ امریکہ نے دنیا کے امن اور تہذیب کی ترقی کی ضمانت کے لیے مجلسِ اقوام کی تخلیق کو اپنا اصلی مقصد قرار دیا تھا۔ پرسڈنٹ ولسن اور انگریز سیاست

لارڈ سیل کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ آخر کار مجلسِ اقوام قائم ہوئی اور اس میں چالیس سے زیادہ قوموں نے شرکت کی۔ اس کے لیے ایک مستقل انتظامی محکمہ قائم کیا گیا اور لیگ کا صدر مقام جنیوا قرار پایا۔ ”لیگ کا کام ایک مجلس کے ذریعے سے انجام پاتا ہے اور اس مجلس میں ہر مملکتی نمائندہ مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ایک کونسل بھی ہوتی ہے جو پانچ بڑی متحدہ سلطنتوں اور چار دوسری ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ ان نمائندوں کا انتخاب مجلس کیا کرتی ہے۔“ اس طرح یہ انتظام ایک حقیقی بین قومی حکومت کا ڈھانچا پیش کرتا ہے۔ یہی حکومت دنیا میں اسن قائم کرے گی اور ہر ایسی ریاست کے خلاف جو جنگ کی ابتدا کرتی ہے، جارحانہ کاروائیوں کو روکنے میں تہذیب کے تمام موثر اور ازخود کام کرنے والے ذرائع استعمال کرے گی۔ مجلس کے آگے اب تک بہت سے پیچیدہ بین قومی مسائل پیش کیے جا چکے ہیں۔

لیگ کی مشکلات | اس قاعدے کی رو سے کہ لیگ کے فیصلوں کو موثر بنانے کے لیے کونسل کا متفق ہونا ضروری ہے، لیگ بڑی مشکل میں پڑ گئی ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس وقت مجلس میں روس، جرمنی اور ڈول متحدہ امریکہ شریک نہیں ہیں، اس لیے ان بڑی قوموں کی شرکت کے بغیر اس کی سرگرمیاں اور فیصلے دنیا کی حقیقی نمائندہ رائے ہونے کا دعوا نہیں کر سکتے۔ ڈول متحدہ امریکہ کا اس میں شرکت سے انکار اس امر کی روایتی خطرے کا نتیجہ ہے کہ اس طرح امریکہ اپنے آپ کو یورپ کے پیچیدہ مسائل میں الجھالے گا۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ افسوس ہے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ جنگِ عظیم کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس نے ڈول متحدہ کو دنیا کی سب سے زیادہ زبردست اور دولت مند قوم بنا دیا ہے۔ مجلس اس وجہ سے بھی بڑی

مصیبت میں ہو کہ اس کے پاس اپنے فیصلوں کو جبراً نافذ کرنے کے ذرائع ناپید ہیں۔ لے دے کہ اس کے پاس بس یہی حق یہ ہو کہ لیگ کے اراکین ضرر رساں فروقی پر معاشی دباؤ ڈالیں۔

اس طرح اس وقت مجلس ایک کم زور اور محفل حالت میں ہو۔ تاہم امید ہو کہ خود یہی لیگ یا اسی قسم کی کوئی اور مجلس جس میں دنیا کی تمام قومیں شریک ہوں گی، انسانیت کی رائے عامہ کو قطعی طور پر اس طرح ظاہر کر سکے گی کہ جارحانہ قومیت کی دست درازیوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ اس دوران میں ہر وہ کوشش جو تخفیفِ اسلحہ کے لیے کی جائے، وہ دلی خیر مقدم کی مستحق ہو۔ اس سے یورپ کی جنگِ عظیم سے پہلے کی حالت کے پھر دوبارہ رونما ہونے کا امکان کم ہو جائے گا۔ اس وقت یورپی قومیں بڑی بڑی میدانی اور بحری فوجوں کے بوجھ سے دبی جا رہی تھیں۔ یہ فوجیں ایسی تھیں کہ ان کے وجود ہی نے اسلحہ کی عظیم صنعت کی مدد سے عالمی جنگ کے جلد چھڑ جانے کو ناگزیر بنادیا تھا۔ ان میں کسی طرح تخفیف کی ہی نہیں جاسکتی تھی، سوائے اس کے کہ ایسی قومیں جن کے قبضے میں یہ اسلحہ تھے، اپنے ہمایوں اور حریفوں کے برابر کم زور کر دی جاتیں۔

برطانوی دولت عامہ اقوام | مجلس اقوام اس چیز کا ایک جزو ہے جو کسی روز ترقی کر کے ایسا اقتدار

بن جائے گی جو بین قومی جنگ کے چھڑ جانے کو روک سکے گی۔ تاہم دنیا

لے آرمستان اور حکومتِ برطانیہ کے درمیان ۱۹۱۴ء میں جو معاہدہ ہوا تھا، اس میں یہ اصطلاح استعمال کی گئی تھی۔ "سلطنتِ برطانیہ" کی قدیم مہلار سے زیادہ موزوں ہو

کی وجہ سے ہم نے اب یہاں استعمال کیا ہے۔

میں اس وقت حقیقتاً دو ایسی بین قومی مجلسیں موجود ہیں جو ریاستوں اور عوام کی خواہش آزادی کو برقرار رکھ کر ایک با اثر کل میں متحد کرنے کے دو مختلف طریقوں کی عملی مثال پیش کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک برطانوی دولتِ عامہ اور دوسری ڈول متحدہ امریکہ ہے۔

دنیا کے آئندہ وفاق میں ہر فرد اور ہر ریاست کو تمام انسانیت کے مفاد کے لیے آزادانہ خدمت گزاری کا پورا پورا موقع ملے گا۔ اس وفاق کو زبانِ قومی رقابت اور عملی انتظامات میں برطانوی دولتِ عامہ اور ڈول متحدہ کو جو دشواریاں پیش آچکی ہیں، ان سے کہیں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن ان مجلسوں کے سرسری مطالعے سے ہمیں ترقی کی بعض ایسی شاہ راہوں کا پتا چلے گا، جن کے ذریعے تہذیب کو بچالیا جاسکے گا اور دنیا کو متحد کیا جاسکتا ہے۔

برطانوی دولتِ عامہ اقوام کا آغاز سوٹھویں صدی

تجارتی نوآبادیاں

میں ہوا جب کہ مہات پندی، نئے ملکوں کی دریافت کا جذبہ اور بیرونی نوآبادیاں قائم کرنے کی آتش شوقِ ہسپانیوں، پرتگالیوں، ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کی طرح انگریزوں کے دلوں میں بھی خوفِ ناک طور پر بھڑکنے لگی۔ سمندر پار کے اس میدانِ ترقی میں انگلستان نسبتاً دیر سے آیا۔ لیکن تجارتی ہمیں مشرق اور غرب میں بھیجا جا چکی تھیں۔ بہت سے تجارتی مقامات اور کئی "ٹیکٹریاں" قائم ہو گئی تھیں۔ خاص طور پر ہندستان میں دوسری یورپی قوموں سے کامِ یاب سابقہ انگریزی تجارت اور اثر کی توسیع کی قدرتی خواہش اور ملک میں طویل بد امنی کے دوران میں (جس نے سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ کر دیا) تحفظ کے حصول کی ضرورت نے اٹھارھویں صدی کے اختتام پر برطانوی اقتدار قائم کر دیا۔ پہلے پہل ہندستان میں حکومتی اقتدار قدیم تجارتی

کمپنی کے ہاتھوں میں رہا، لیکن ۱۷۵۹ء میں تاجِ برطانیہ کو منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد نظم و نسق ایک دائرے کے ذریعے اور پبلک خدمات کا انتظام انگریز اور ہندوستانی عہدے داروں کے ذریعے سے کیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں ایک اصلاحی ایکٹ نافذ کی گئی، جس نے حکومت کے مختلف شعبوں کو ہندوستانی وزیروں کے حوالے کر دیا۔ یہ وزیر اسمبلیوں کو منتخب کرنے کے ذمے دار ہیں۔ اس طرح اختیارات میں آئندہ جو وسعت دی جائے گی اس کا انتہا برطانوی دولتِ عامہ اقوام کے ماتحت ہندستان کی حکومت خود اختیاری ہوگا۔

امریکی نوآبادیاں | تجارتی نوآبادی (جس کی سب سے زیادہ قابلِ لحاظ مثال ہندستان میں برطانوی حکومت ہر ایک بالکل آباد کار نوآبادی ہے۔ اس طرح کی نوآبادیوں کی ترقی نے برطانوی دولتِ عامہ اقوام کو ایک نمایاں خصوصیت عطا کی ہے۔

سولہویں صدی میں اسپینی باشندے وسطی اور جنوبی امریکہ میں خوشحال نوآبادیاں قائم کرنے میں کام یاب ہو گئے تھے۔ سترھویں صدی کے ابتدائی زمانے میں انگریزوں نے ان کی تقلید کی اور جنوبی امریکہ کے مشرقی ساحل پر اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ شمال میں جو نوآبادیاں تھیں ان کا انتظام زیادہ تر دولت مند درباریوں اور اشرافیہ کے ہاتھوں میں تھا اور ان کے ادارے اور مقاصد بھی یہی تھے۔ ان کا دار مدار پیش تر روئی کی کاشت پر تھا جس میں افریقہ سے ناروا طریقے پر لائے ہوئے غلام مزدوروں سے کام لیا جاتا تھا۔ دوسری طرف شمال میں انگلستان سے بھاگے ہوئے مذہبی پناہ گزینوں نے نوآبادیاں قائم کی تھیں۔ ان میں زیادہ تر انتہا پسند پروٹسٹنٹ یعنی پیورٹن تھے۔ یہ نوآبادیاں زرعی تھیں اور بعد میں صنعتی جماعتیں بن گئیں۔ ان کے ادارے

اور مقاصد جمہوری تھے۔ ان کی گزیر کا انحصار آبادکاروں کی محنت شاقہ پر تھا۔ یہاں اس سے پہلے خوفِ ناک جنگل تھے اور ان میں خوں خوار وحشی بستے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ منتشر نوآبادیاں خوش حال اور وسیع ہوتی گئیں، یہاں تک کہ دریائے سنیکٹ لارنس کے دہانے سے لے کر فلوریڈا کی سرحد تک برطانوی نوآبادیوں کی ایک مسلسل قطار بن گئی۔ اب تک آبادکاراندریون ملک میں دور تک نہیں بڑھے تھے، اور انگریزی نوآبادیوں کے مغرب اور سنیکٹ لارنس اور مسسپلی کی وادیوں پر فرانسیسی عرصہ دراز سے قابض تھے۔ تاہم سات سالہ جنگ کے نتیجے کے طور پر فلوریڈا اور کنیڈا انگلستان کے سپرد کر دیے گئے (۱۷۶۳ء) اس کے بعد برطانوی حکومت نے آبادکاروں کی بڑھتی ہوئی دولت پر محصول اور ناواجبی تجارتی پابندیاں عائد کرنے کی تباہ کن کوشش کی۔ برطانوی آزادی کا یہ نعرہ کہ ”نمائندگی کے بغیر کوئی محصول ادا نہیں کیا جائے گا“ منشورِ اعظم کے زمانے سے چلا آتا تھا۔ اب اس کو نوآبادیوں نے پُر جوش طریقے پر اختیار کر لیا، جن کے پارلیمنٹ میں کوئی نمائندے نہیں تھے۔ مادی انگلستان اور امریکیوں کے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ نوآبادیوں کو وسیع ترین مراعات دے کر ہی جنگ سے بچنے کی صورت نکالی جاسکتی تھی۔ لیکن برطانوی حکومت نے (جو اس وقت نااہل اور خود پرست شاہِ جارج سوم کی غلام وزارت کے زیرِ اقتدار تھی) وسیع پیمانے پر ایسے مراعات دینے سے انکار کر دیا۔ ”حکومتِ برطانیہ نے مساوی حصہ نہیں دیا جو اس مسئلے کو حل کرنے کی ایک ہی تدبیر تھی۔ اس کے برخلاف اس نے امریکہ کے ساتھ ایک ماتحت ریاست کا سا سلوک کیا۔“

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ جنگی شروع ہو گئی، جو آٹھ سال (۱۷۷۵ء-۱۷۸۳ء)

تک جازی رہی۔ اس خانہ جنگی میں تیرہ نوآبادیاں اپنے آپس کے اختلافات اور رقابتوں کو پیچھے ڈال کر برطانیہ کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آگئیں۔ جارج واشنگٹن نے قابل تعریف طور پر ان کی قیادت کی۔ ہالینڈ، فرانس اور اسپین نے انھیں مدد دی اور انگریزوں کو کوئی اتحاد نہ مل سکا۔ آخر کار انگریزوں کو شکست ہوئی اور امریکی نوآبادیوں نے ڈول متحہ امریکہ کی صورت میں اپنی آزادی حاصل کر لی۔

لیکن اس سبق سے رفتہ رفتہ برطانوی حکومت کی آنکھیں
مقبوضات کھل گئیں، اور جب انیسویں صدی میں کنیڈا اور دوسری نوآبادیوں کی طرف سے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ ہوا، تو ان مطالبوں کو پوری طرح تسلیم کر لیا گیا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جنوبی افریقہ کی بوئر حکومت کے ساتھ بھی یہی کیا گیا، حالانکہ اس سے کچھ ہی سال پہلے بوئر اپنی آزادی کی ایک جان توڑ کوشش میں ہزیمت اٹھا چکے تھے۔

غرض اس طرح کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ میں مقبوضاتی خود اختیاری حکومتیں قائم ہو گئیں۔ یہ مقبوضات مادر وطن انگلستان سے صرف محنت اور ہم مددی کے رشتے میں منسلک اور عام اطاعت کے ذریعے برائے نام تاج برطانیہ کے زیر اقتدار ہیں۔

لیکن ایک طرف اگر یہ مقبوضات اتنی مکمل حکومت خود اختیاری رکھتی ہیں کہ ۱۹۱۹ء کی صلح کان فرانس اور مجلس اقوام میں ان کا شمار علیحدہ ریاستوں کی حیثیت سے ہوا اور اب بھی ہوتا ہے تو دوسری طرف معاملات خارجہ اور ایسے امور میں جو برطانوی دولت عامہ کے آپس کے تعلقات کو متاثر کرتے ہیں، وہ ان مسائل کو ایک متحدہ جماعت کی حیثیت سے حل کرتے ہیں۔ ان کا

ایسا کرنا بالکل اختیاری ہوتا ہے۔ کیوں کہ دستور میں اس کی کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ جرمنی کی جنگِ عظیم میں مقبوضات نے انتہائی وفاداری کے ساتھ مادرِ وطن کا ساتھ دیا۔ اس کے علاوہ اہم اور کامیاب شہنشاہی کانفرنس میں جو حال ہی میں منعقد ہوئی تھی، ایسے ہر انجم پائے گئے جن سے قریبی تعلقات کے التوا ہونے اور پوری دولتِ عامہ کی حکمتِ عملی اور انتظام پر ایک زیادہ مفید مرکزی اقتدار کے پیدا ہونے کی توقع ہوتی ہے۔

۱۹۲۱ء میں آئرلینڈ کو حکومتِ خود اختیاری عطا کی گئی۔ اور وہ **آئرلینڈ** ایک نوآبادی کی حیثیت سے نہیں بلکہ برطانیہ عظمیٰ کے مساوی ایک قدیم مادرِ وطن کی حیثیت سے برطانوی دولتِ عامہ اقوام کا رکن بن گیا۔ آئرلینڈ نے ایک نئی مثال قائم کر دی ہے کہ قومیں کس طرح آپس میں متحد کی جاسکتی ہیں۔ یہ قومیں اپنی طرز پر زندگی بسر کرنے، اپنے معاملات کا آپ انتظام کرنے اور تمدن کو ترقی دینے میں آزاد ہوں گی، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کامل علیحدگی کے ساتھ انفرادی طور پر کبھی بھی جدا نہ ہوں گی۔ ان کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ بڑے سوانح میں شرکت کریں اور اپنے خیالات اور تجربے سے ایک بڑے ادارے کو فائدہ پہنچائیں، اور یہ ادارہ رفتہ رفتہ پوری انسانیت کو اپنی آغوش میں لے لے گا۔

اس طرح برطانوی دولتِ عامہ، عالمی ریاست کے قیام میں مجلسِ اقوام کے اختیار کردہ راستے سے الگ ایک دوسری راہ سمجھاتی ہے۔ آخر الذکر انگلستان کے خلاف جنگ میں امریکی نوآبادیوں کے اتحاد سے مشابہ ہے۔ یہ مساوی رتبہ ریاستوں کی ایک انجمن ہے، جو اس خاص مقصد کے لیے بنائی گئی ہے کہ جارحانہ قومیت کی روک تھام کی جاسکے۔ دوسری طرف، برطانوی دولتِ عامہ اقوام قوموں کا اتحاد ہے جو تاریخی حالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے منسلک

اور ایک مرکزی مملکت کے گرد ایک مشترک مقصد کے ماتحت جمع ہو گئی ہیں۔ ان کو مقاصد اور روایات کے ایک مجموعے نے متحد کر رکھا ہے۔

برطانوی دولتِ عامہ اقوام کی مثال ایک خاندان کی سی ہے۔ اس کی جذبات اور اس کے مشترک اغراض و مقاصد خاندانی زندگی جیسے ہیں۔ لیکن تعلقات کے لیے کوئی مقررہ قواعد نہیں ہیں، اور اس کے ہر انفرادی رکن کو پوری پوری آزادی عطا کی گئی ہے۔ دوسری طرف مجلسِ اقوام چند خاندانوں کے سرداروں کی ایک مجلس ہے جس میں ہر سردار اندرونی طور پر رشک و حسد اور اپنے عزائم کی پرورش کرتا ہے۔

اس طرح برطانوی دولتِ برطانوی دولتِ عامہ اقوام کا دستور

کی ایک مجلس ہے۔ یہ طور ایک متحدہ جماعت کے کام کر سکتی ہے، اور اس کے باوجود ہر حصے کی آزادی کو انتہائی درجے تک محفوظ رکھ سکتی ہے۔ "سلطنت" کی قدیم اصطلاح ایسی دو تاء جماعت کے لیے ناموزوں ہے جو باہمی امداد کے لیے بنی ہو اور جبری بندشوں سے نہیں بلکہ ولی جذبے سے اتحاد میں شلک ہوئی ہو کیوں کہ واقعی سلطنت میں مرکزی حکومت اپنے ماتحت ریاستوں کو اپنے ذاتی نفع کے لیے بے رحمی کے ساتھ لوٹتی ہے۔

سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز برطانوی دولتِ عامہ اقوام کی یہ ہے کہ یہ دستور لوحِ دار اور غیر معین ہے۔ اس کے متعلق یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ کسی ایسی دستاویز پر لکھا نہیں گیا ہے جس میں اس کے اور ماتحتی ریاستوں کے تعلقات کا صراحت کے ساتھ ذکر ہو۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ریاست دولتِ عامہ سے علیحدہ ہونا چاہے تو اس میں کوئی چیز مانع نہیں۔

تجربے نے ثابت کیا ہر مقررہ دستور واضح اور معین ہونے کے باوجود سخت ہونے کی وجہ سے بڑی طرح ناکام ہو جاتے ہیں۔ ایسے دستور ضرورت سے زیادہ سخت قواعد اور تحفظات سے جو صرف ماضی کے مختلف حالات میں قابلِ عمل ہوتے ہیں مستقبل میں بڑی پریشانی کا باعث ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ایک ریاست، یا ریاستوں کی ایک مجلس، کسی زبانی اور لوح دار دستور کے ساتھ متقل طور پر آسانی کے ساتھ ترقی کر سکتی ہو اور جدید مسائل کی ضروریات کے مناسب حال نئے قانون مرتب کر کے باقاعدہ اور قدرتی طریقے پر ارتقا اور وسعت کو جاری رکھ سکتی ہو۔ مجموعی طور پر انگلستان اور برطانوی دولت عامہ اقوام نے اسی طریقے پر ترقی کی ہو۔ مختلف ملکوں کی تاریخ نے ثابت کر دیا ہر کہ ایک مقررہ دستور کا وجود سخت خطرے کا موجب ہوتا ہو، جبکہ تبدیل شدہ حالات کے ماتحت اس میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہو۔ ایسی تبدیلیاں صرف ایک اچانک انقلاب یا خانہ جنگی ہی کے ذریعے کی جاسکتی ہیں۔ ۱۸۹۶ء سے فرانس میں جو واقعات پیش آ رہے ہیں، ان سے یہ خطرہ روز روشن کی طرح واضح ہوتا جا رہا ہو۔

برطانوی دولت عامہ میں محنت، اغراض اور آزادی کے اصولوں کی عام اطاعت کے رشتے دولت عامہ کو بیرونی خطرے کے دقت ایک ٹھوس ادارہ بنانے ہی میں مضبوط ثابت نہیں ہوئے ہیں بلکہ سیاسی میاں روی کی روح کو پرورش دینے اور اقلیت کو اکثریت کے فیصلوں پر غرضی سے رضامند بنانے میں بھی (اگرچہ کہ وہ انتہائی ناپسند ہوں) بہت کام یاب رہے ہیں۔ یہی آخر الذکر خصوصیت غالباً ایک کام یاب اور منظم جمہوریت کے لیے اور تمام دوسری ضروریات میں سب سے زیادہ ضروری ہو۔ ہم دیکھ چکے

ہیں کہ اسی فقدان نے یونانی جمہوریت کو تباہ کر دیا تھا۔

اس میں کسی کو شک نہیں کہ انگلستان کی طرف سے مادرِ وطن کی مرضی کو مقبوضات سے جبراً منوانے کے لیے ناوا جی دباؤ کا نتیجہ دولتِ عامہ کی تباہی ہو گا۔ اس بات کا علم ایک طرف تو مقبوضات کی آزادی کی ضمانت کرتا ہے اور دوسری طرف مرکزی حکومت پر سنجیدگی اور اعتدال کی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔ اس طرح خاندانی محبت کا تعلق برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ ایسا تعلق سب سے زیادہ قوی ہوتا ہے کیوں کہ اس کی بنیاد نہ جبر پر ہوتی ہے اور نہ مقررہ قوانین پر۔ دولتِ عامہ کے

برطانوی دولتِ عامہ کے مختلف عناصر | اندر ایسی ریاستوں

کے علاوہ جنہوں نے ایک طرف قدیم تجارتی نوآبادیوں سے اور دوسری طرف قدیم لاطینی نوآبادیوں سے ترقی کی تھی، ایک تیسری قسم کی ریاست بھی ہو اس تیسری قسم میں وسطی افریقہ اور دوسرے مقامات کے بڑے بڑے علاقے شامل ہیں۔ ان علاقوں کی وحشی قومیں جنگوں یا شہنشاہی توسیع کے نتیجے کے طور پر انیسویں صدی کے آخر میں انگلستان کے ماتحت ہو گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپی قومیں دنیا کے ان حصوں پر جو اب تک یورپی اقتدار کے ماتحت نہیں آئے تھے، قبضہ کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں مبتلا تھیں۔ اس دوڑ میں انگلستان سب سے آگے نکل گیا۔ اس نے اپنے لیے اہم علاقے حاصل کر لیے۔ ان علاقوں میں اور بھی وسعت ہوئی جب کہ جنگِ عظیم کے نتیجے کے طور پر ایشیا اور افریقہ کے وہ بڑے بڑے علاقے جو پہلے ترکی یا جرمن حکومت کے ماتحت تھے، اتحادیوں کے ہاتھ آئے۔

مجلس اقوام کے اقرار نامے میں ان آخر الذکر مقبوضات کا ذکر ”تہذیب کی ایک مقدس امانت“ کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور ”احکام“ کے ذریعے ان کے باشندوں کو بدسلوکی اور لوٹ مار سے بچانے اور ان میں تہذیب کے عناصر کو ترقی دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہ احکام مجلس کی طرف سے بعض قوموں کے نام کمیشن ہوتے ہیں جو اسی طرح ان علاقوں کا انتظام اور نگہداشت کی ذمے دار قرار دی گئی ہیں۔ حکم ملے اپنا اقتدار مجلس اقوام کی قوت پر چلاتے ہیں، اور مجلس اقوام یہ اقتدار غیر متحد قوموں کی امین کی حیثیت سے استعمال کرتی ہے۔ مجلس اس اقتدار کو جو درحقیقت غیر متحد قوموں کا اقتدار ہے، اس وقت تک استعمال کرتی رہے گی، جب تک وہ خود اس کو استعمال کرنے کے قابل نہ ہو جائیں گی۔ یہ بات صاف طور پر کہی جاسکتی ہے کہ برطانیہ عظمیٰ جن مسئلہ اساس پر منطقہ حارہ کے افریقی مقبوضات اور اسی طرح عراق اور فلسطین پر قابض ہے، چاہے وہ کسی حکم نامے کے ماتحت ہوں یا نہ ہوں، یہ مالک اسی قسم کی امانت ہیں۔ ان ملکوں کی سیاسی منزل مقصود وہی ہے جو اس سے پہلے مقبوضات نے حاصل کر لی ہے۔ یعنی حکومت خود اختیاری۔

برطانوی دولت عامہ میں ایک دوسرا عنصر بعض اہم فوجی نقاط کا ہے۔ مثلاً جبل الطارق، مالٹا، عدن، ہانگ کانگ۔ ان مقاموں پر اس لیے قبضہ رکھا گیا ہے کہ یہ بڑے بڑے بحری راستوں پر جو دولت عامہ کے دور دراز مقاموں کو ملاتے ہیں، کوٹے کے اسٹیشن ہیں۔

اس طرح برطانوی دولت عامہ اقوام میں بہت سے مختلف اور متضاد عناصر ہیں۔ اس کے اندر ہندستان کی قوموں کی طرح قدیم اور بڑی قومیں ہیں۔ یہ قومیں ابتدا میں تجارتی اسباب کی بنا پر برطانوی

اقتدار کے ماتحت آئیں اور اب بہت تیزی کے ساتھ خود مختاری کی طرف قدم بڑھا رہی ہیں۔ دولتِ عامہ کے اندر کنیڈا اور آسٹریلیا جیسی حکومت خود اختیاری رکھنے والی مقبوضات ہیں۔ اس میں غیر متمدن وسیع علاقے ہیں، جن میں بہت کم تہذیب یافتہ قومیں بستی ہیں۔ اس میں چھوٹے چھوٹے لیکن رسل و رسائل کے نہایت اہم فوجی مقامات نہیں۔ اس کے اندر ایک حصہ سلطنت آئرستان ہی جو خود برطانیہ عظمیٰ کا برابر کا حصہ دار ہے۔

بعض ایسی ہی خاندانی قومیں جو مصنوعی اور سخت پابندیوں میں جکادی ہوئی نہیں ہیں، بلکہ امن و عافیت کے ساتھ مل جل کر رہتی ہیں، ان کے متعلق مختلف نقاط نظر سے یہ نتیجہ نکالنے میں ہم زیادہ غلطی پر نہ ہوں گے کہ یہ قومیں اقوامِ عالم کے آگے آپس کے تعلقات کی ایک بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔ اگرچہ اس طرح عالمی دولتِ عامہ کو عملاً قائم کرنے کا امکان اب تک بہت کم نظر آتا ہے۔ تاہم بہت ممکن ہے کہ یہی ایک صحیح دستور کے ساتھ پوری نفع انسانی کی آزادانہ خدمت کے لیے ہر فرد اور ہر قوم کو سب سے زیادہ اطمینان بخش ذرائع مہیا کرے گی۔

دولتِ متحدہ | مختصر طور پر ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح انگلستان کی امریکی نوآبادیاں آپس میں متحد ہو کر اپنی آزادی کے لیے ”مادرِ وطن“ سے دست و گریباں ہوئیں۔ اس نئی قوم کو بہت سے مشکل مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ شمال اور جنوب دو الگ الگ دنیا میں تھیں۔ جن تیرہ ریاستوں سے پہلے پہل اتحاد ترتیب پایا تھا، ان میں سے ہر ایک کو اس کی سخت فکر تھی کہ مرکزی حکومت ان کے اختیارات میں زرا سا بھی تصرف نہ کر سکے۔ ان ریاستوں کا وہی حال تھا جو سرحدوں پر ہوا کرتا تھا۔ لوگ

اجڈ، غیر منظم، جاہل اور قانون کے احترام سے ناواقف تھے اور رسل و رسائل کا ان کے پاس فقدان تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود امریکی قوم کی عقل سلیم اور ان کی طبیعت کا جوہران رکاوٹوں پر بہت جلد فتح پاتا گیا۔

ان کی پہلی اور سب سے بڑی کامیابی غالباً ۱۷۸۷ء کا دستور وفاق ہو، جو اب تک نافذ ہے۔ حکمراں ریاستوں کے ”غیر فانی اتحاد“ کے اصول وفاق کو ایک نئے معنی اور نئی قدر و قیمت دے دی۔ اس اتحاد میں شریک ہونے والی ریاستیں پہلے تیرہ تھیں، اب تعداد میں اڑتالیس ہیں۔ یہ اپنی پسند کی اور خود منتخب کی ہوئی حکومتیں رکھتی ہیں، کارخانوں کی تنقیح، حفظِ صحت کا انتظام، فوج داری قانون اور اسی طرح کے دوسرے امور کی ذمہ دار ہیں۔ یہ حکومتیں ایسی ہیں کہ ان میں اوسط درجے کا شہری عام طور پر شریک ہوتا رہتا ہے۔ وفاقی حکومت کو بعض مخصوص اختیارات دیے گئے ہیں۔ جیسے جنگ اور صلح، ڈاک کا انتظام، ریکہ، انتظام تجارت اور ایسے امور جن کے متعلق تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ انھیں ریاستیں اپنے طور پر اچھی طرح انجام نہیں دے سکتیں۔ مجلس اقوام کا اقتدار متعدد قوموں کی رضامندی پر موقوف ہے۔ لیکن اپنے قوانین نافذ کرنے میں وفاقی حکومت کے اقتدار کا انحصار ریاستوں کی رضامندی کا محتاج نہیں ہے۔ جیسا کہ جیس میڈیسن دستور کے اصل مصنف نے کہا ہے: یہ ہر انفرادی شہری پر خود اس کے جہدے داروں اور عدالتوں کے ذریعے ایک ”کمل اور جبری عمل“ ہے۔ ”ڈول متحدہ کی کانگریس (سینٹ اور ایوانِ نمائندگان) اتحاد کے قوانین مدون کرتی ہے۔ رائے عامہ سے چار سال کی مہقات کے لیے ایک صدر منتخب کیا جاتا ہے اور وہی قوانین کو نافذ کرتا ہے۔ مالکِ متحدہ کی اعلیٰ عدالت متعدد ریاستوں

کے آپس کے نزاعوں کا تصفیہ کرتی ہو اسے قدیم ترین بین قومی عدالت کہا جاتا ہے یہی عدالت ریاستوں اور وفاقی حکومت کے درمیان اختیارات سے متعلق متنازعہ مسائل طر کرتی ہو اور جب کانگریس اپنے دستوری اقتدار سے ہٹ کر کسی قانون کو منظور کرتی ہو تو یہ اسے منسوخ کرتی ہو۔

دوہل متحدہ جیسے وسیع اور پیچیدہ مفاد رکھنے والے ملک کو صرف ایک وفاقی حکومت ہی کے ماتحت متحد کیا جاسکتا ہو۔ اسی وفاقی حکومت کے ذریعے سے ملک کا مغربی جانب پھیلاؤ روکا جاسکتا ہو۔ جب کبھی کانگریس نے کوئی ایسا قانون منظور کیا جس نے اقلیت کو نقصان پہنچایا تو اس نے وفاقی حکومت کے خلاف ریاستوں کے جذبات حقوق کو بھڑکایا ہو۔ اس کی ایک مثال حفاظتی محصول ہو۔ پریسٹنٹ انڈریو جیکسن نے ۱۸۳۲ء میں اسی قسم کی ایک تحریک کو نہایت سختی کے ساتھ دبا دیا، لیکن وہ اسے بالکل فنا نہ کر سکے۔ ۱۸۶۱ء میں جب جمہوری پارٹی نے حبشی غلاموں کی تجارت کو مسدود کرنے کا عہد کیا تو اس کے لیے ابراہم لنکن کو صدارت کے لیے منتخب کیا گیا۔ غلام رکھنے والی ریاستیں اتحاد سے علیحدہ ہو گئیں۔ ابراہم لنکن دراصل ایک سرحدی، میدھا سادا آدمی تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک آہنی ارادے کا قائد ثابت کر دکھایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قابل تعریف رحم دلی اور فرزانی کا ثبوت دیا۔ کیوں کہ غلاموں کی آزادی اور پھوٹ سے اتحاد کو بچانا اسی کی تدبیر کا نتیجہ تھا۔ اس کی وجہ سے ۱۸۶۰ء کے اتحاد کو عام اعتماد حاصل رہا۔

ایک مرتبہ جب کہ خانہ جنگی اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ لنکن نے گیسٹبرگ کے میدان جنگ میں ایک قومی قبرستان کی تعمیر کے موقع پر

ہمارے آگے ہو۔ اس پرستہ قربان ہو جائیں۔۔۔ ان محترم
جاں نثاروں نے جس مقصد کے لیے آخری اور مکمل قربانی
پیش کی ہو، اس سے ہمارے مقصد میں ہمارے حوصلے اور بڑھ
جاتے ہیں۔ یہاں ہم مصمم عزم کرتے ہیں کہ ان مرستہ والوں
کی موت کو بے سود نہیں بنائیں گے۔ خدا کا فضل شامل ہو تو
یہ قوم آزادی کا نیا جھم لے گی اور عوام کی حکومت، عوام کے
لیے، اور عوام کے ذریعے، روئے زمین سے فنا نہ ہو سکے گی۔“

جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد پریسٹنٹ ولسن کی جو حکمت عملی رہی اس کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنا بہت ہی قبل از وقت ہو گا۔ ۱۹۱۹ء کی صلح کانفرنس میں اگرچہ ان کی بہت سی خوبیوں کا کام نہیں، لیکن آخر کار وہ مجلس اقوام کی تخلیق میں کامیاب ہو گئے۔

ٹرسٹ | دول متحدہ کو متعدد اہم مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بڑی بڑی تجارتی جماعتوں یا ٹرسٹوں کو کس طرح قابو میں رکھا جائے۔ یہ جماعتیں ملک میں ہر طرف پیدا ہو گئی ہیں اور بہت بڑی حد تک اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ دول متحدہ کے پاس کامیاب طور پر استعمال کرنے کے لیے عظیم الشان قدرتی ذرائع موجود ہیں۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ بڑا عظیم کے وسیع رقبے کے اندر محصول درآمد اور پابندیوں کے بغیر تجارت کی جاسکتی ہے۔ محصول درآمد بڑھا دیے جانے کی وجہ سے غیر ملکی مسابقت بھی بے اثر ہو گئی ہے۔

یہ ٹرسٹ نہ صرف چھوٹے چھوٹے کاروبار اور ان قیمتوں پر جو عوام سے خرید و فروخت میں لی جاتی ہیں، ظالمانہ طور پر اپنا اقتدار استعمال کرتے ہیں بلکہ واقعتاً دولت مندوں کی حکومت قائم کرنی چاہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی قومی حکومت ہے جس میں صرف دولت مند شہری ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ ٹرسٹوں نے یہ اقتدار جمہوری اداروں اور خصوصاً ریاستی سیاست میں ساد باز اور رپڑی کے ناجائز استعمال سے حاصل کیا ہے۔ موجودہ صدی کی ابتدا میں جفاکش اور لائق صدر روزولٹ نے ان ٹرسٹوں کے خلاف ایک سخت مہم کا آغاز کیا۔ کاروبار کو قابو میں رکھنے اور اس میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے متعدد قانون منظور کیے گئے۔ لیکن رپڑی کی قوت اب بھی امریکی جمہوریت کے لیے ایک شدید خطرہ بنی ہوئی ہے۔

تاریکین وطن | دوسرا اہم مسئلہ غیر ملکیوں کے سیلاب کا ہے جو دول متحدہ میں آباد ہونے کے لیے اُمتنا چلا آتا ہے۔ متعدد دسلوں سے یورپ سے امریکہ کو آبادی مستقل طور پر منتقل ہوتی چلی آرہی تھی۔ پہلے پہل

یہ داخلی توطن پرزیری پیش تر یورپ کے شمال مغربی ملکوں سے جو رہی تھی، اس طرح نئی آنے والی آبادی دول متحدہ میں پیدا شدہ لوگوں کی ہم نسل اور ہم زبان ہونے کی وجہ سے ان میں بغیر کسی غیر معمولی دشواری کے گھل مل گئی۔ لیکن اب ایک طرف تو مشرقی اور جنوبی یورپ سے بہت سے لوگ ایسے ہیں، اور دوسری طرف کچھ دنوں تک چین سے بھی لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ یہ نئے عناصر مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں اور عادات اطوار اور معیار زندگی میں اپنے جدید وطن والوں سے بے حد اختلاف رکھتے ہیں۔ جس نواح میں یہ آباد ہوتے ہیں وہاں یہ اپنے مخصوص گروہ یا نوا بادیوں بنانا چاہتے ہیں۔ بعض رقبوں میں انھوں نے امریکی آبادی کو پوری طرح اپنے میں ضم کر لیا ہے۔ تاہم داخلی توطن اختیار کرنے والوں میں زیادہ تر اہل حرفہ اور کان طباقوں کے جفاکش لوگ ہیں۔ اسی وجہ سے جن آبادیوں سے یہ لوگ آتے ہیں، اس کے سب سے زیادہ قابلِ قدر عنصر کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان کی اکثریت مضبوط اور توانا ہے، اور یہ خود اپنی کوششوں سے اس نئے ملک میں کامیابی حاصل کرنے کے آرزو مند ہیں۔

۱۸۲۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیانی سالوں میں دول متحدہ میں تیس لاکھ سے زیادہ آدمی داخلی توطن پرزیری کے لیے آئے، اور صرف ۱۹۱۴ء کے ایک سال میں ان کی جملہ تعداد ساڑھے بارہ لاکھ کے قریب تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ پریسکوپلہ جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے ساتھ ہی یورپ میں جو معاشی اور سماجی مصیبتیں تھیں، اس کی وجہ سے امریکہ میں حفاظتی داخلی توطن پرزیری کا قانون ۱۹۲۴ء میں نافذ ہو گیا۔ اس کی رو سے درآمد کو سالانہ پندرہ لاکھ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ ہر قوم کو اس میں جو حصہ دیا گیا ہے، اس میں شمالی یورپ کی قوموں کے ساتھ خاص رعایت (بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۲ پر)۔

کی اتنی زبردست تعداد کو ضم کرنے کا مسئلہ نہایت ضروری اور مشکل بن گیا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے سب سے بڑھ کر ایک سنجیدہ اور مرکب نظام کی تعلیم کی ضرورت ہے جس میں ان پریسیوں کے بچوں کو امریکہ کی زبان، تہذیب اور تصور میں ڈھالا جاسکے۔ اس خصوص میں شان دار کام کیا جا رہا ہے۔ بیرونی دنیا کی تقریباً تمام مختلف اور متضاد نسلوں سے بہترین عناصر لے کر ایک نئی امریکی قوم کا سانچہ تیار کیا جا رہا ہے۔ "مختلف عناصر کو بگھلا کر ایک کرنے کا جو عمل یورپ میں ایک ہزار سال کی سیاسی تجاویز اور قوت کے باوجود ناکام رہا، وہ ممالک متحدہ کی جامعات اور مدارس میں خاموشی اور تیزی کے ساتھ اپنا کام کر رہا ہے۔" یہ کام لوگوں کی بین قومی جماعت کی تخلیق سے انجام پا رہا ہے۔ یہ بین قومی جماعت ایک جدید بین النسلی قسم کی انسانیت پر مشتمل ہے اور اب تک اس کی تعداد دس کروڑ تک پہنچ چکی ہے۔

یہ واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ ممالک متحدہ میں نہ صرف ایک بین قومی تمدن پیدا کیا جا رہا ہے جس کی بنیاد انگریزی زبان اور جمہوریت کی عام اطاعت پر رکھی گئی ہے، بلکہ ایک حقیقی جدید قسم کی انسانیت یعنی ایک بین النسل امریکی

(صفحہ ۲۰۱ کا بقیہ نوٹ) ملحوظ رکھی گئی ہے، کیوں کہ یہی قومیں امریکی لوگوں کی ریڑھ کی

پڑی ہیں۔ لہ پر ونیسر جے ہالینڈ روز "کانٹیم پریس ریویو" نومبر ۱۹۱۲ء

۱۷ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ طریق انعام لاکھوں حبشیوں پر صادق نہیں آتا۔

یہ لوگ ان غلاموں کی اولاد ہیں جو غارتگری سے پہلے جنوبی امریکہ کے قبضے میں تھے۔ ان

ریاستوں کے سوا جہاں ان کی تعداد نسبتاً کم ہے امریکی حبشی قانون کے ماتحت نہیں بلکہ

رانے عامہ اور قبر عامہ کے تحت رکھے جاتے ہیں۔ یہ جس مال میں رکھے گئے ہیں، وہ زرعی

غلامی سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔

نسل بھی پھیل رہی ہے۔ ”یورپ کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے امریکی آبادکاروں سے متعلق پروفیسر لو آس نے حال میں بہت غور و فکر کے ساتھ بعض مشاہدے کیے ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ اس جدید ماحول میں بعض ناقابلِ صراحت طریقوں پر مسروں کی ساخت ظہیں تغیر ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً مشرقی یورپ کے یہودیوں میں، یورپ میں پیدا ہونے والے کاسٹر امریکی میں پیدا ہونے والے کے سر سے چھوٹا اور چوڑا ہوتا ہے۔ امریکہ میں پیدا ہونے والے کی دوسری نسل میں یہ فرق اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپی قوموں میں اور بھی تغیرات ہو رہے ہیں۔ یہ سب تغیرات ایک مخصوص امریکی قسم کی نسل پیدا کرنے کی طرف مائل ہیں۔ اس طرح ذیل متحدہ میں داخلی توطن سے ایک نسل پیدا ہو رہی ہے۔ اور اس کی تعمیر میں مغرب کی تمام بڑی بڑی نسلوں نے حصہ لیا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ایسا بنیادی بین قومی اور بین النسلی کام جو اتنے وسیع پیمانے اور ایسے بڑے ملک میں انجام دیا جا رہا ہے جو قدرت کی بے اندازہ دولت سے مالا مال ہے، انسانیت کے مستقبل کو پرامید بناتا ہے۔ ذیل متحدہ تمام مغربی قوموں سے بہت زیادہ دولت مند، طاقت ور اور خوش حال ہے۔ غالباً مستقبل میں وہ ماضی سے کہیں زیادہ داخلی توطن پر اثر انداز ہوگا۔ اس طرح حاصل کیے ہوئے انسانیت کے خام خمیر کو وہ ایک نئی اور متحدہ شکل میں ڈھالنا رہے گا۔ حال ہی میں شراب کی تجارت کو روکنے کی جو کوشش کی گئی ہے، وہ آئندہ چل کر فضیلت اور برتری کی طرف ایک زبردست قدم ثابت ہوگا۔

لہٰذا سر کی ساخت عام طور پر مختلف قوموں میں فرق کرنے کے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ اقتباس مہاریٹ کی کتاب ”علم الانسان“ ص ۵۷ سے لیا گیا ہے۔

یہی چیز پہلے زمانے میں ایک ناقابل بیان مصیبت بربادی اور ناکامی بھی جانتی تھی۔ پُر امن ترقی اور یورپ کی سیاسی پیچیدگیوں سے علیحدگی کی امریکی روایات اس بات کا یقین دلاتی ہیں کہ امریکی نسل کا غلبہ ٹھنشنا ہی اور جارحانہ نہ ہوگا، بلکہ بقیہ دنیا کے لیے سودمند بھی ثابت ہوگا۔

اس طرح تاریخ جدید کے اس اہم ترین مسئلے یعنی بد امنی اور جارحانہ قومیت کو قابو میں رکھنے کے مسئلے کا ہم نے مختصر سا جائزہ لے لیا ہے۔ ہم نے بعض ایسی تجویزوں پر بھی غور کیا ہے جو گزشتہ زمانے میں اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ناکام طور پر استعمال کی گئی تھیں۔ ہم نے زیادہ تفصیل کے ساتھ تین امید افزا جدید حل معلوم کیے ہیں۔ مجلس اقوام، قوموں کا خاندان، اور ایک جدید بین قومی قوم۔

اب ہمیں اور دوسرے عوامل کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو دورِ حاضرہ کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

نواں باب

یونانِ قدیم کا احیا اور نئی تحریکیں

۱۸۵۳ء میں جب ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کر لیا تو یونانی
نشاةِ ثانیہ | عالموں کی ایک بڑی تعداد نے بھاگ کر یورپ کے مغربی
 علاقوں میں پناہ لی۔ یہ اپنے ساتھ بیش بہا قدیم مخطوطے بھی لیتے گئے تھے۔

لیکن اس سے بہت پہلے ہی سے خاص طور پر اطالیہ میں قدیم یونانی اور رومی تہذیب سے بڑی گہری دل چسپی لی جا رہی تھی۔ آرٹ اور ادب کو ترقی دینے اور انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ مہذب اور پر تکلف بنانے کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ یونانی عالموں کی آمد نے اس تحریک میں جو ”ہیومنزم“ یا مسک انسانیت بھی کہلاتی ہو، بڑی جان ڈال دی۔ دنیائے قدیم کی حکمت، شاعری اور فنون لطیفہ، مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ تصورات کا مطالعہ اور ان کی نقل بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کی جانے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جاگیری نظام کے طول طویل زمانوں کی موت کے بعد تہذیب و تمدن نے ایک نیا جنم لیا ہو۔ یہی وجہ ہو کہ یہ درختاں دور ”حیات نو“ یا نشاۃ ثانیہ کے نام سے مشہور ہو گیا ہو۔

اس نشاۃ ثانیہ میں ایک حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت ہر طرف پھوٹ پڑی تھی۔ بیسویں مشہور مصوروں میں رافیل اور مائیکل انجلو، اور بیسویں سائنس دانوں میں لیونارڈو ڈاؤنسی سب سے زیادہ نام ور تھے۔ اس عہد کے بہت سے بڑے بڑے عالموں میں ہالینڈ نے اس مس کی ذات میں سب سے بڑا عالم اور بڑے بڑے شاعروں میں انگلستان نے شکسپیر کی ذات میں سب سے بڑا شاعر پیدا کیا۔ شکسپیر صبح معنی میں نشاۃ ثانیہ ہی سے تعلق رکھتا ہو کیوں کہ ایک صدی بعد نشاۃ ثانیہ کا اثر اطالیہ سے زیادہ انگلستان پر پڑا۔

لیکن اگر پندرھویں صدی کے وسط میں چھاپے خانے کی ایجاد نہ ہو گئی ہوتی تو نشاۃ ثانیہ کا عمل ناممکن ہو جاتا۔ اس ایجاد نے جدید قارئین علوم کی نشو و نما کے لیے ایک وسیع دائرہ فراہم کیا۔ اس نے جدید قارئین علوم کی نشو و نما کے لیے ایک وسیع دائرہ فراہم کیا۔ اس نے جدید قارئین علوم کی نشو و نما کے لیے ایک وسیع دائرہ فراہم کیا۔

اشاعت میں زبردست حصہ لیا ہے اور بعد میں اس عالم گیر تعلیمی توسیع کو ممکن بنا دیا ہے جو انسانیت کی ترقی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

اطالوی نشاۃ ثانیہ میں یہی نہیں کہ قدیم فنون اور تفکر کی طرف از سر نو توجہ کی گئی۔ بلکہ یہ قرون وسطیٰ کی ہر چیز کے خلاف، نظام جاگیری، جہالت اور رہبانیت کے خلاف حتیٰ کہ اخلاقی روک تھام بلکہ خود عیسائیت کے خلاف ایک زبردست بغاوت تھی۔ اسی وجہ سے اس میں فرض اور کردار کے اعلیٰ تصورات کا فقدان پایا جاتا تھا، اور شرم ناک عیاشی، بدکاری اور اوباشی کی طرف رجحان ہو گیا تھا۔ سیاسی طور پر اس کا اظہار جمہوریت کے احیاء کی صورت میں نہیں ہوا بلکہ اس ظالم کے قالب میں جنم لیا جو ہر خدائی اور انسانی قانون سے بالاتر ہے اور جس کی جھلک میکیاولی کی کتاب ”پرنس“ میں نظر آتی ہے۔

پاپائی نظام، جس نے روم میں نشاۃ ثانیہ کی تخلیقی صلاحیت کو ابھارنے میں بڑا حصہ لیا تھا، اور اس طرح مصوری اور فنِ تعمیر کے کارناموں کے ذریعے سے شہر روم کو شہرۂ آفاق بنا دیا تھا، وہ بھی عیاشی اور بدکاری کے گڑھے میں جا پڑا۔ پوپ اپنے ذاتی اغراض اور دنیوی مقاصد کے لیے اس روحانی فضیلت اور اقتدار کو صرف کرنے لگا جو رومی کلیسا کو یورپی عوام کے دلوں پر حاصل تھا۔ ایک نئی بیداری کا وقت آچکا تھا۔ یونان کے فنون اور یونان کے حسن کا تصور پھر سے زندہ ہو گیا تھا اس کی شدید ضرورت تھی کہ یونانی تہذیب کی گہرائیوں پر بھی نظر کی جاتی۔

اصلاح | پاپائی نظام کے اختلال نے اولاً سخت نکتہ چینی اور بے پناہ استہزاء کے دروازے کھول دیے۔ فرانس، جرمنی، ہالینڈ اور انگلستان میں روشن خیال لوگوں کی زبردست جماعت کلیسا میں اصلاح کا

مطالبہ کر رہی تھی، ارا اس س اس کالیڈر بن گیا۔ ان ملکوں میں بھی قدیم علوم کی اشاعت کا احیا ہو رہا تھا اور لوگوں کو خود اپنے طور پر سوچنے، حکومتی اقتدار پر تنقید کرنے اور خواہش آزادی کا اظہار کرنے کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ اطالیہ کی بہ نسبت شمالی یورپ زیادہ منجیدہ، زیادہ بااخلاق اور کم جو شیلا اور فنون لطیفہ سے کم مس رکھتا تھا۔ خصوصاً جرمنی میں ایک وسیع اور عمیق اخلاقی جذبہ پایا جاتا تھا اور یہاں بد اخلاقی کا استیصال اور نیکی کے قیام کا عزم پیدا ہو گیا تھا۔ جان ہس نامی ایک شہید ولی نے خاص طور پر لوگوں کو اس مطالبے پر گسیا کہ حضرت عیسیٰ کی اصل تعلیمات - یعنی اخوت مساوات اور خدا پر اعتماد کے مذہب کی طرف واپس جانا چاہیے جو کیتھولک کلیسا کے اضافہ کیے ہوئے عقائد سے پاک ہو۔

اس طرح جرمنی میں ایک حقیقی مصلح مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء - ۱۵۴۶ء) کی آمد کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ پاپائی نظام پر حملہ کرنے میں یہ ارا اس سے بھی بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ اس نے نہایت جرأت کے ساتھ کلیسا اور شہنشاہ کی تمام قوتوں کے مقابلے میں مطالبہ کیا کہ اصلاح پسند جماعت رومی کیتھولک نظام سے اپنے آپ کو بالکل طاحہ کر لے۔ لوتھر کی تحریک کا جرمنی کے بہت سے سرکش رئیسوں اور جاگیر امیروں نے شوق سے خیر مقدم کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اس نئی پرائنٹ تحریک کے ذریعے سے شہنشاہ کے مقابلے میں اپنے

لے جان ہس ایک زچک عالم تھا۔ چودھویں صدی کے اختتام اور پندرھویں صدی کی ابتدا میں یہ شخص پراگوئے کے مقام پر تقریریں کیا کرتا تھا۔ اس کو کلیسائی حقوق سے محروم کیا گیا، اور ۱۵۱۵ء میں زندہ جلادیا گیا۔ اس نے اپنے پیش تر خیالات چودھویں صدی کے ایک انگریز مصلح جان وی کلف سے حاصل کیے تھے۔

اقتدار کو بڑھانے کا ایک نادر موقع ہاتھ آیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ لوٹھر ایک زبردست مذہبی پیشوا تھا، لیکن تنظیم سے وہ واقف نہ تھا۔ لوٹھر نے اس نئے کلیسا کے (یہ کلیسا اسی کے نام سے موسوم ہوئی) بیش تر اختیارات قومی یا ریاستی کلیسا کے صدر کی حیثیت سے رئیس یا بادشاہ کو دے دیے۔ اس طرح لوٹھر کے نظام میں مذہب سیاسیات کا تابع ہو گیا۔ لیکن سویٹزر لینڈ میں پروٹسٹنٹ نظام کی ایک دوسری صورت نے استحکام حاصل کر لیا، اور جان کال (۱۵۰۹ء-۱۵۳۶ء) نامی ایک فرانسیسی شخص نے اس کو منظم کیا اور اس کی بنیاد جمہوری اور نمایندہ کلیسائی حکومت پر رکھی۔ کال ویسی نظام بڑی تیزی کے ساتھ فرانس میں پھیل گیا۔ فرانس میں بھی جرمنی کی طرح یہ نئی تحریک کچھ عرصے تک جاگیر کی نظام کے امیروں کو مرکزی حکومت کے خلاف تقویت پہنچاتی رہی۔ رفتہ رفتہ کال ویسی نظام اسکاٹ لینڈ اور شمالی ندر لینڈ کی مخصوص عیسائیت بن گیا۔

انگلستان میں ہنری ہشتم نے اپنی اسپینی ملکہ سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے پوپ کو آمادہ کرنے میں ناکام رہا۔ اس پر ہنری نے انگریزی کلیسا کو دوسرے علیحدہ کر دیا، اور خود اس کا صدر بن بیٹھا۔ اس نے خانقاہوں کو بند کر دیا، اور کلیسا کی بہت سی جائیداد ضبط کر لی اور اس کا صرف ایک حصہ مدرسوں کے قیام اور بحریہ کی تعمیر میں صرف کیا۔ انگلستان کو کم از کم کچھ عرصے کے لیے خانقاہوں کے بند کرنے سے سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔

زمینوں کے نئے مالک جنھوں نے بادشاہ سے کلیسا کی زمین خریدی تھی، بڑے لٹیرے اور ظالم تھے۔ انھوں نے اپنی جائیداد کے بڑے حصے کو زرعی زمین سے چراگاہ میں تبدیل کر کے بہت سے مزدوروں کو بے کار کر دیا۔ انھوں نے

دیہات کی مشترکہ عام زمینوں پر قبضہ کر کے انھیں محصور کر لیا۔ اس طرح ان لوگوں نے افلاس اور فلاکت پھیلانے میں بہت بڑا حصہ لیا اور انگلستان "ہٹے کٹے بھکاریوں" سے بھر گیا۔ یہ لوگ سخت سے سخت محنت کا کام کرنے کے قابل تھے لیکن کام حاصل کرنے کے ناقابل تھے۔ پچھلے زمانے میں خانقاہیں غریبوں میں بے حساب خیرات بانٹا کرتی تھیں، لیکن اب یہ ذریعہ معاش بند ہو چکا تھا۔

اس طرح بہت دنوں تک انگلستان میں تحریک اصلاح نامقبول رہی اور اس کے خلاف عام طور پر مسلسل بغاوت ہوتی رہی۔

جوابی اصلاح شہنشاہ چارلس پنجم (۱۵۱۹ء - ۱۵۵۶ء) نے اصلاح کی سختی کے ساتھ مخالفت کی اور اس کی وفات سے پہلے خود رؤمی کلیسا کے اندر ایک نئی تحریک پیدا ہو گئی۔ اس تحریک نے اصلاح کے کام کو روک دیا اور اس کو بے اثر کر کے یورپ کو روہن کیتھولک پروٹسٹنٹ فرقوں میں منقسم کر دیا۔ یہ دونوں فرقے آپس میں شدید مخالفت رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے حریف سمجھے جاتے تھے۔ یہ تحریک "جوابی اصلاح" کے نام سے مشہور ہو۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ رؤمی کلیسا کو بدنام کرنے والی اندرونی خرابیوں سے پاک کر کے اس کو مزید پروٹسٹنٹ حلوں کے مقابلے میں مستحکم بنا دیا جائے۔

اس جوابی اصلاح سے کلیسا کی بہت سی خرابیاں دور ہو گئیں۔ پاپائی نظام جو اطالوی نشاۃ ثانیہ میں دنیا دار اور ریاکارانہ تھا، اب سنجیدہ اور بااخلاق ہو گیا۔ اسی زمانے میں جسورسٹ کا زبردست مذہبی نظام قائم کیا گیا۔ جسورسٹوں کی یہ جماعت کلیسا کی املا تربیت یافتہ لیکن غیر مسلح

فوج بن گئی۔ لوگ اس کے مقصد کے حصول کے لیے افلاس کا حلف اٹھاتے اور ایک آہنی نظم کے ماتحت کامل فرماں برداری کے ساتھ اس کی خدمت بجالاتے تھے۔ جسور سٹوں نے رومن کیتھولک سحیت کے پیغام اور نظم کو دوردور تک جدید دریافت شدہ براعظموں اور ملکوں میں مشرق سے مغرب تک پہنچا دیا۔ یورپ کے ایسے ملک جو پراٹسٹنٹ ہو گئے تھے، ان میں کلیسا کی حیثیت کو پھر قائم کرنے، اور ایسے ملک جو ابھی تک زیادہ تر کیتھولک ہی تھے، انھیں محفوظ رکھنے کے لیے ہر قسم کی کوششیں عمل میں لائی گئیں۔

یورپی رومن کیتھولک دنیا کے طویل و عرض میں مذہبی عدالتیں قائم کی گئیں اور پراٹسٹنٹ نظام کی سیخ کنی کرنے میں اذیت رسانی اور زندہ جلا دینے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ یہ عدالتیں مختصر علاقوں میں وسیع اختیارات کے ساتھ قائم کی گئی تھیں کہ رومن کیتھولک نظام کے سوا تمام دوسرے مذہبوں کا استیصال کر دیا جائے۔

اسپین کے زبردست کیتھولک شاہی خاندان کا بادشاہ اپنے آپ کو کلیسا کا ایک ادنا خادم تصور کرتا تھا۔ یہ خاندان کلیسا کے مقاصد کے لیے امریکہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے کے لیے بے شمار ذرائع بڑی فیاضی کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔

کچھ عرصے کے لیے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پروٹسٹنٹ نظام بہ زور قوت فنا کر دیا جائے والا ہو۔ لیکن اسپینی غاصبوں کے خلاف ندر لینڈ کے لوگوں کی مردانہ وادبغاوت اور انگریزوں کے مقابلے میں اسپینی آرمیڈڈ کی شکست نے ان مذاہب کے درمیان ایک توازن قائم کر دیا، جو سترھویں صدی تک باقی رہا۔ تیس سالہ جنگ میں کیتھولک نظام کی ناکامیوں اور لوی چہار دہم کے

ماتحت اس کی کام یابیوں کے باوجود یہ توازن برابر برقرار رہا۔ کوئی اپنے آپ کو نہ صرف فرانسیسی قومیت بلکہ کیتھولک عیسائیت کا بھی ایک زبردست حامی سمجھتا تھا۔

آخر کار اٹھارھویں صدی میں مقبولیت اور مذہبی رواداری کی روح کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قومی جنگوں میں یورپ کی بڑھتی ہوئی دل چسپی اور سمندر پار کی نوآبادیاتی و تجارتی کاروبار کی توسیع نے تلخ مذہبی رقابت اور کیتھولک اور پراٹسٹنٹ فرقوں کی باہمی نزاع کا خاتمہ کر دیا۔

اطالیہ میں قدیم علوم کے از سر نو
نشأۃ ثانیہ اور اصلاح کا اثر | اچیاں صرف یہی نہیں کیا کہ یونانی

فنونِ لطیفہ اور یونانی ادب میں دوبارہ جان ڈال دی بلکہ اس سے بڑھ کر کام اس نے یونان کی آزادانہ تحقیق اور آزادانہ تنقید کو بھی زندہ کر دیا، جو انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر کارنامے پر حاوی تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ انسان کی تمام فطری خوبیوں کی فراخ دلی اور روشن خیالی کے ساتھ تربیت دی جائے تاکہ انسان کے وجود کا ہر رخ اپنی انتہائی قابلیت تک ترقی کر جائے۔ اور شہری کو اپنی تمام جسمانی اور دماغی قوتوں کو انتہائی مفید بنانا سکھایا جائے۔ اس طرح اطالوی نشأۃ ثانیہ میں آزادی خیال کا یونانی جذبہ پھر ایک بار زندہ ہو گیا۔ لوگوں کو وہی تعلیم دی جائے لگی جو دو ہزار سال پہلے سقراط نے دی تھی۔

یعنی آزاد تفکر اور کسی اعلیٰ اقتدار یا تفضل یا تقدس کے دعوے کو بلا دلیل نہ تسلیم کرنا بلکہ تمام اشیاء کی تہ تک روشن خیالی اور تعمیری تنقید سے جانچنا۔ دوسری طرف شمال میں مذہبی اصلاح کا یہ مفہوم تھا کہ یہ خیال اور تنقید میں آزادی کی نئی روح (جو اطالیہ میں خود غرضی کی طرف لیے جا رہی

تھی، انتہائی اخلاقی شغف کے ساتھ مذہبی آزادی اور روحانی صداقت کی طرف رہ نمائی کرے جو انفرادی زندگی کے اغراض سے بالاتر ہو۔ اس کے بعد کی مذہبی لڑائیاں خوف ناک اور خوں ریز ہونے کے باوجود کم از کم یہ تو ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کسی چیز پر جیسے وہ اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں اس پر سے اپنی ہر چیز قربان کر کے اس کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ اصلاح نے سب سے زیادہ نمایاں کام جو انجام دیا ہے وہ ضمیر کی آزادی کے سلسلے میں آزادی کی یونانی اسپرٹ کا زندہ کرنا ہے۔ پاپائی نظام کی بدکاریوں کے خلاف لو تھر کے غیظ و غضب اور اس کا بے خوف دعوہ کہ اسے اپنے طریقے پر خدا کی عبادت کرنے کا حق حاصل ہے، گویا سقراط ہی کی صدائے بارگشت تھی جو ایتھنز کے جوں کے آگے تلاش حق سے دست بردار ہونے کے مقابلے میں اپنی موت کو ترجیح دے رہا ہے اور ان پر ظاہر کر رہا ہے کہ بندوں کی نہیں بلکہ خدا کی اطاعت کرنی چاہیے۔

پروٹسٹنٹ نظام کے بڑے بڑے انقلابی رہ نما یعنی ہالینڈ میں ولیم دی سائیلنٹ (صوفی کا حاشیہ دیکھیے) اور انگلستان میں آئیور کراموں اس اعتبار سے لو تھر سے بھی زیادہ دُور اندیش نکلے۔ ان کے ہم عصروں میں رواداری کا فقدان ہونے کے باوجود انھوں نے نہ صرف اپنا اور اپنے ہم خیال لوگوں کا حق منوایا کہ وہ اپنے طریقے پر خدا کی عبادت کر سکتے ہیں، بلکہ ان لوگوں کا بھی حق تسلیم کیا جن کے خیالات ان کے خلاف تھے۔ اس طرح انھوں نے حقیقی مذہبی رواداری کا اصول قائم کر دیا۔

یونانی علوم کے احیاء کے ساتھ ساتھ دنیا کے متعلق انسانی زاویہٴ

دریافت | نظریں وسعت پیدا کرنے کے کام میں ایک دوسری زبردست

قوت اپنا کام کر رہی تھی۔ یہ قوت اس بات کا انکشاف تھا کہ دنیا اس سے بہت زیادہ بڑی اور اس سے بہت زیادہ دل چسپ مقام ہو جتنی کہ وہ اب تک سمجھی جاتی تھی۔

تیرھویں صدی کے اختتام پر مارکوپولو نامی وینس کے ایک تاجر نے چین کا ایک دلیرانہ سفر کیا۔ یہاں وہ شہنشاہ چین کی خدمت میں بیس سال تک ایک اہم خدمت پر مامور رہا۔ واپسی کے بحری سفر میں اس نے ہندستان کی بندرگاہوں اور مشرق کے دوسرے مقاموں کی سیر کی۔ اس نے اپنی ہمت کے متعلق جو کتاب لکھی وہ پورے یورپ میں انتہائی دل چسپی کے ساتھ پڑھی گئی۔

چودھویں اور پندرھویں صدی میں ترکوں کی فتوحات ان قدیم بری راستوں کو بند کر رہی تھیں جن کے ذریعے سے ایشیا اور یورپ میں تجارت ہوتی تھی۔ نئے رستے دریافت کرنے کی کوشش میں پرتگالی ملاح اپنے تحقیقاتی بحری سفر جنوب میں ساحل افریقہ کے کنارے کنارے بڑھتے جا رہے تھے۔ آخر کار ۱۴۸۶ء میں ڈیاز اس امید تک پہنچ گیا۔ اور اس کے چند سال بعد ۱۴۹۸ء میں واسکو ڈی گاما ہندستان کے جنوب مغربی ساحل پر کالی کٹ جا پہنچا۔ اس وقت سے مشرق میں دریافت کا سلسلہ اور آگے بڑھتا ہی گیا۔

۱۴۹۲ء میں مسلمان توروں کا آخری قلعہ غرناطہ فتح کرنے کے بعد اپنی حکومت مستحکم ہو گئی تھی۔ اسی سال کرسٹوفر کولبس نامی ایک جینیوزی ملاح جو شاہ اسپین کا ملازم بھی تھا، تین چھوٹے جہاز لے کر سمندر میں مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سفر سے اس کا مقصد ہندستان کا ایک مغربی راستہ دریافت کرنا تھا۔ تاکہ اس کے ذریعے سے اسپینی بادشاہ مشرق کی دولت بخش تجارت سے

فائدہ اٹھا سکیں۔ اس زمانے میں لوگوں کو حال ہی میں معلوم ہوا تھا کہ زمین گول ہے۔ اور ابھی تک ان کا بھی خیال تھا کہ اس کے قطر کا فاصلہ حقیقی فاصلے سے بہت ہی کم ہے۔

بہت سی بالویسیوں اور واپسی کے لیے اپنے ملاحوں کے عذر کی دھکیوں کے باوجود آخر کار کوئٹس جزائرِ مغرب الہند تک پہنچ ہی گیا۔ ان جزائر کو کوئٹس نے چین کے ساحلی جزیرے سمجھے۔ کیونکہ وہاں ہٹی کے جزیرے دریافت کرنے کے بعد وہ اسپین واپس ہوا لیکن دوسرے سال پھر وہ اپنے سفر پر روانہ ہوا، اور کئی جزیرے دریافت کیے، اور چند سال بعد جنوبی امریکہ کے ساحل کا ایک حصہ دریافت کر لیا۔

سولھویں صدی کے اوائل میں پال بونا نامی ایک اسپینی پناہ کی خاکدانے پار کر کے بحرِ اوقیانوس میں پہنچ گیا۔ اس کے چھو سال بعد میاگے لان نے دنیا کے اطراف کا پہلا بحری سفر کیا۔ اسی زمانے میں مکسکو کی اموی ہندی سلطنت کو کارٹز نے اسپین کے لیے فتح کر لیا۔ ۱۵۳۱ء میں پی زارو، ہیر وینچا جہاں قہمتی دھاتیں اتنی عام تھیں کہ ”سونا چاندی بھی تنہا ایسی چیزیں معلوم ہوتی تھیں کہ ان کو دولت میں شمار نہیں کیا جاسکتا تھا۔“ یہاں کی پیروویں قوم کافی تمدن تھی، اور زراعت، آب پاشی اور تعمیرات میں بڑی مہارت رکھتی تھی۔ ان لوگوں کی حکومت استبدادی مگر دراصل بہت ہی خیر اندیش تھی۔ ولادت سے لے کر وفات تک رعایا کی زندگی کے ہر شعبے میں باقاعدگی اور نظم پیدا کیا گیا تھا۔ ان میں ذات بندی کا ایک سخت نظام بھی رائج تھا۔ جس کی رُو سے کوئی شخص اس ذات سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا جس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ حکومت ہر شہری کا کام، اس کی تعطیلات، اس کی غذا، اس کے کپڑے

اس کی قیام گاہ، اور یہاں تک کہ اس کی شادی اور تقریب تک کا انتظام کرتی تھی۔ پیرو کے ہر باشندے کو حکومت کی طرف سے ایک مکان اور اتنی زمین ملتی تھی جو اسے اور اس کے خاندان کو فلاکت سے محفوظ رکھ سکے۔ "فتوحات کے ذریعے سے سلطنت میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ مگر یہ قاعدہ کبھی بدلا نہیں جاتا تھا کہ مفتوح قبیلوں کو پورے شہری حقوق دیے جاتے تھے۔ انھیں ہر طرح ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ سکونت اختیار کر لیں اور اپنے نئے آقاؤں کی وفادار رعایا بن جائیں۔"

پیرازاؤ نے اس زبردست اور انتہائی منظم سلطنت پر ۱۶۸۷ء میں ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ حملہ کیا اور اسے زیر کر لیا۔ اس کا یہ حملہ دنیا کی تمام تادمخی معرکہ آرائیوں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ہو۔ اہل اسپین نے اپنے وسیع مفتوحہ علاقوں پر بہت بری طرح حکومت کی۔ ان ملکوں کے باشندوں کو غلام بنایا اور ان کی ساری دولت لوٹ لی۔ سترھویں صدی تک یہی حال رہا۔ یہاں تک کہ انگریزوں نے نیو انگلینڈ میں اور فرانسیزیوں نے کنیڈا میں حقیقی نوآبادیاتی بستیاں قائم کیں۔ آباد کاروں نے ان کا ابتدائی کام نہایت جان فٹانی کے ساتھ کیا تھا۔ یہ نوآبادیاں دولت مند بھی ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن ان کی دولت لوٹ کھسوٹ کا نہیں بلکہ ان کی محنت شاقہ کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، انگلستان کی امرو کی نوآبادیوں کا دار مدار غلاموں کی محنت اور مشقت پر تھا۔ ان حبشیوں کو افریقہ میں ان کے گھروں سے پکڑا جاتا تھا۔ پھر انھیں وحشیانہ اور ظالمانہ شرائط کے ماتحت جہازوں میں لادے اور بحر اوقیانوس پار کر کے امریکہ میں فروخت کر ڈالتے تھے۔ یہ سلسلہ انیسویں صدی کی ابتدا تک جاری رہا۔ اور اس کا خاتمہ زیادہ

ولیم ولبر فورس جیسے زبردست ہم درِ خلافت کی کوششوں سے ہوا۔
دریافت کا یہ سلسلہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی تک جاری رہا۔
سترھویں صدی میں روسی، ساہریا کے اطراف سے بحرِ نجد شمالی میں گھس
پڑے اور اٹھارھویں صدی میں گلک نامی ایک مالی ہمت انگریز ملاح
نے سواحلِ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، شمالی مغربی امریکہ اور بحرِ نجد کے بہت
سے جزیروں کی پیمائش کر ڈالی۔

انیسویں صدی کے دوران میں بہت سے من چلے بہادروں نے
افریقہ کے اندرونی علاقوں کی دریافت میں حصہ لیا۔ ان میں سب سے زیادہ
مشہور ڈیوڈ لیونگ اسٹون نامی ایک شخص ہے۔ یہ حبشی قوم کا بڑا دوست اور
ہم درد تھا۔ اور اس نے حبشی قوم کے تمام دشمنوں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا۔
بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں پیری نامی ایک اہلِ دریافت
کنندہ قطبِ شمالی پر پہنچ گیا اور ناروے کا باشندہ امنڈسن اور اسکاٹ نامی
انگریز قطبِ جنوبی پر پہنچے۔ آخر الذکر کو کامیابی کے ساتھ ساتھ اپنی جان بھی
دینی پڑی۔ واپسی کے سفر میں محفوظ خطے تک پہنچنے کے لیے صرف گیارہ
میل رہ گئے تھے کہ سردی کی شدت نے اس کی جان لے لی۔

اس طرح تاریخ کے دورِ جدید کے مخصوص خط و خال میں سے ایک اہم
ترین خصوصیت "توسیعِ یورپ" یعنی دریافت، تجارت، اور آباد کاری کے
ساتھ ساتھ تمام دنیا میں یورپی تہذیب و تمدن اور اقتدار کو پھیلانا ہے۔ یہ پوری
تحریک ایک وسیع پیمانے پر آغازِ تاریخ کے وقت کی اس تاریخ سے مشابہ

۱۸۳۳ء میں برطانیہ میں ۱۸۳۳ء میں برہہ فروشی ممنوع قرار دی گئی۔ انسانیت کی یہ غوثِ نصیبی ہے
کہ اس وقت سے یہ بُری رسمِ افریقہ کے اندرونی حصوں اور خصوصاً حبش کو چھوڑ کر ہر جگہ ختم ہو چکی ہے۔

ہو جس نے یونانی تمدن، آباد کاری اور اقتدار کے جذبے کو اکسایا تھا۔ موجودہ تحریک میں بھی مہات پندی کی وہی روح کار فرما ہو اور دریافت، تجارت اور آباد کاری کے وہی محرکات اپنا کام کر رہے ہیں جو کسی وقت بحیرہ روم کی قدیم دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنا اثر دکھا رہے تھے۔

سائنس | نشاۃ ثانیہ میں یونانی علوم کے احیا نے اشیاء کی ماہیت اور ان کے اسباب و علل کی آزادانہ یونانی طریقہ دریافت کی روایتوں کو پھر زندہ کر دیا۔

قرون وسطیٰ میں ان مقامات کے سوا جہاں روشن خیال عرب مفکروں کے اثر نے نمود اس کو محسوس کرایا تھا، کلیسا کے اقتدار نے کچھ تو عام جہالت اور کوتاہ بینی اور کچھ تنقید سے بالا قدیم نظریوں کے ٹھکانہ استعمال سے نامتی فک خیال کو کچل ڈالا تھا۔ لوگ جب مظاہر قدرت کا مطالعہ کرتے تو حقائق کے مشاہدے کی راہ میں یہ سب شکلیں اکھڑی ہوتی تھیں۔

لیکن نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ہی کلیسا اور روایتی نظریوں کے اقتدار کو دھوٹ مقابلہ دی جانے لگی۔ پھر ایک بار لوگوں میں یونانیوں کی طرح حقیقت کی تہ تک پہنچنے، حقائق کو جانپہنچنے، تفصیلات کی صحیح تفتیش و تحقیق اور تقابل اور عملی تجزیوں کے ذریعے تکمیل علم کا شوق پیدا ہو گیا۔ مثلاً قرون وسطیٰ کے فلسفیوں میں اس بارے میں کبھی نہ ختم ہونے والی بحثیں ہوتی رہیں کہ اپنے وزن کے لحاظ سے اجسام جلد یا دیر سے کیوں گرتے ہیں۔ اس کو اصول موضوعہ کے طور پر مان لیا گیا تھا کہ یہ بس یوں ہی گرتے ہیں۔ جب نشاۃ ثانیہ نے نامتی فک روح میں ایک حقیقی بیداری پیدا کر دی تو اس مسئلے کا تصفیہ ہو گیا۔ گیلیلیو پنی سا کے برج پر چڑھا اور اس پر سے اس نے دو غیر مساوی وزن کی چیزیں

گرائیں، دونوں ایک ہی وقت میں زمین پر پہنچیں۔ وہ مسئلہ جو نظریہ سازوں کے پاس اتنا زیر بحث تھا، اور جس کی بنیاد از سر تاپا اتنی غلط رکھی گئی تھی، ایک سائنس دان کے معمولی سے تجربے سے ہمیشہ کے لیے حل ہو گیا۔

قرون وسطیٰ میں سائنسی فکر روح پیدا کرنے میں راجر بیکن انگریز کا بھی بہت بڑا حصہ جو تیرھویں صدی میں گزرا ہے۔ اس کو عملی تجربوں پر بڑا اصرار تھا۔ اس نے دغائی جہازوں اور طیاروں کے متعلق بھی غور کیا تھا، اور بارود کے متعلق تجربے کیے تھے۔ مگر کلیسا نے اس کو اپنے آزادانہ ذاتی تجربوں کی بنا پر بدعتی قرار دے کر قید کر دیا۔ اس کی وجہ تھی کہ کلیسا اپنے آپ کو سائے علم کا سرچشمہ تصور کرتا تھا۔

پندرھویں صدی کے اختتام پر اطالوی نشاۃ ثانیہ کے سائنس دانوں میں سب سے زیادہ قابل ذکر لیونارڈو ڈاونسی تھا۔ ایک نہایت ہی ماہر مصور ہونے کے علاوہ اس نے طبیعی تاریخ اور علم تشریح الابدان کے متعلق نہایت صحیح مشاہدے کیے تھے۔ اس نے ریکارڈ کی اصلی ماہیت دریافت کی تھی۔ اور ایک قابل انجینیر بھی بن گیا تھا۔

قریب قریب اسی زمانے میں کوپرنیکی کس نے ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے بعد گیلیلیو نے دُور بین ایجاد کی، اور اس کے ذریعے سے سورج کے دھبے اور مشتری کے چاند دریافت کیے۔ کائنات کی ماہیت اور نظام شمسی کی وسعت کے متعلق ایسی اور اسی قسم کی دریافتوں نے ذہن انسانی کو وسیع کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ انسان اب اپنے آپ کو زمانہ قدیم کی طرح ایک ایسی دنیا کے باشندے نہیں سمجھتے تھے جو ہر چیز کا مرکز ہے اور نہ وہ یہ سوچتے تھے کہ تارے خاص طور پر ان کی سہولت اور آرام کے لیے

ہیتا کیے گئے ہیں۔

سترھویں صدی کے اوائل میں فرانسیسی بے کن نے سائنسی فنک تحقیق کے قواعد مدون کیے۔ اس نے صحیح اور تفصیلی مطالعہ اور محتاط عملی تجربے کی بنیادی اہمیت پر بہت زور دیا۔ ”تمام نظریوں اور عام قیاسوں کو دؤر کر دو، اور اپنی سمجھ سے کام لو، اس طرح سب سے پاک اور الگ ہونے کے بعد تفصیلات کا بالکل نئے سرے سے جائزہ لو“ اسی طرح بیکن کے ان اصولوں کو جنہیں اس کے ہم نام نے اس سے ساڑھے تین سو سال قبل مرتب کیا تھا، منضبط کر کے انہیں جاری کیا۔

اس وقت سے اب تک سائنسی فنک دؤر اپنی اور اس کی فتوحات کا سلسلہ کبھی بند ہونے نہیں پایا۔ سترھویں صدی کے وسط میں سائنسی فنک حقائق کے مطالعے کے لیے انگلستان میں رائل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی سرپرستی میں نئے نئے انکشافات اور فطری قوانین کی تدوین کا کام مستقل طور پر آگے بڑھتا گیا۔ اس صدی کے اختتام پر ایک نیوٹن نے کشش ثقل کے کلیے اور سائنسی فنک مسائل کے حل کرنے کے لیے جدید ریاضیاتی قاعدے دریافت کیے۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں سائنس کو صنعت و حرفت میں عملی طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعت و حرفت میں نہایت وسیع اور دؤر رس تغیرات رونما ہونے لگے۔

پہلے پہل شیشیں سوئی اور اڈنی سامان کی صنعت کو بڑھانے کے لیے استعمال کی گئیں، اور اس کے بعد ہر قسم کی صنعتوں میں استعمال ہونے لگیں جیسے ویٹ لے دھانی انجن کو ترقی دے کر اسے قوت کا ایک ذریعہ بنادیا، اور

اس سے صنعتی دنیا کی حالت میں بڑا زبردست انقلاب پیدا ہو گیا۔ پہلے پہل اس کو کارخانوں میں مشینوں کے چلانے میں استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد یہ دغانی جہازوں کو چلانے اور ریلوں کو کھینچنے میں استعمال ہونے لگا۔

فرانس کے مشہور عالم ڈیڈی راس کی مشہور انسائیکلو پیڈیا ۱۷۵۲ء میں شائع ہوئی شروع ہو گئی۔ اس میں سائنس کے کارنامے، سائنٹی فک خیالات اور اس تاریخ تک کی صنعت و حرفت کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا تھا۔ اس نے سیاسی اصلاح کے ساتھ ساتھ سائنٹی فک اور صنعتی کاروبار کو بڑی تقویت بخشی۔

جدید کارخانوں نے سابقہ گھریلو صنعت و حرفت کے نظام کارخانہ داری کے نظام کو تقریباً پوری طرح بٹھا دیا۔ اس کے متعلق ڈی فونے اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں لکھا تھا :-

”انگلستان کے ایک شمالی ضلع کے ایک بڑے گھر میں ایک ایک کارخانہ ہوتا تھا۔ تمام گھر محنتی اشخاص سے بھرے ہوتے تھے۔ کچھ آدمی رنگ کے حوضوں پر کام کرتے تھے۔ کچھ کرگے کا کام دیکھتے تھے اور کچھ کلف دیتے تھے۔ عورتیں اور بچے روئی دھونکے، کپڑا سینے میں لگائے جاتے تھے۔ غرض چھوٹے بڑے سب ہی مزدوری کرتے تھے۔ جس کی عمر چار سال سے زیادہ ہو جاتی اس کو اپنی مزدوری آپ کمانے کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ نہ کوئی بھکاری نظر آتا تھا، نہ کوئی بے کار۔ عام طور پر لوگوں کی عمر زیادہ ہوتی تھی۔ ان کو اچھی ہوا ملتی تھی۔ ان حالات میں سخت محنت کا نتیجہ اگر دولت نہ بھی ہوتا تو صحت مندی ضرور ہوتا تھا۔“

ان صحت مند گھریلو صنعتوں کی جگہ اب بڑے بڑے صنعتی شہر پیدا ہوئے

لگے۔ ان شہروں میں ہر طرف بلیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس لیے صنعتی شہروں کی طرف صنعتی آبادی کا اتنا تباہ بندہ گیا۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی کا ماحول بہت ہی بگڑ گیا۔ لوگ جانوروں کے گلوں کی طرح غلاظت اور بیماری کے درمیان بڑی تنگی سے بسر کرتے ہیں۔ ان کو بہت دیر تک حقیر معاوضے کے لیے بہت ہی غیر محنت بخش ماحول میں کام کرنا پڑتا ہے۔ عورتوں اور بچوں سے کارخانوں اور کانوں میں اس طرح کام لیا جاتا ہے جو غلاموں سے کم نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کارخانہ داری نے صنعتی پیداوار میں زبردست اضافہ کر دیا۔ کارخانے کے مالکوں کے ہاتھ میں کثیر دولت دے دی اور دنیا میں ارزاں مصنوعات کی وسیع پیمانے پر ترسیل کا سبب بنا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ پوری تحریک جسے ”حرفتی انقلاب“ کہا جاتا ہے، انگلستان، ممالک متحدہ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ اور بلجیم کی تجارت، اقتدار، اور مال دولت میں زبردست اضافے کا باعث ہوئے۔ ان ملکوں میں اس نئے نظام کو جاری کرنے کے لیے حالات مصلحت تھے۔ کوئلہ اور لوہا ان کے پاس بہت تھا۔ لیکن ایک عرصے تک اس کا نتیجہ مزدور طبقے کے لیے خوف ناک افلاس اور فلاکت ہی رہا۔

انیسویں صدی کے دوران میں کچھ تو بے غرض حامیوں کی کوششوں سے اور زیادہ تر مزدوروں کی ٹریڈ یونینوں کے ذریعے سے مزدور اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے اور ان پر عمل کرانے کے قابل ہوئے۔ ان سے صنعت و حرفت کے مرکروں میں اصلاح ہوئی اور نظام کارخانہ داری کی بدترین خرابیوں کو روکنے کے لیے قوانین منظور کیے گئے۔ مگر سرمایہ داروں کی دولت اور مزدوروں کی غربت میں جو واضح فرق ہو وہ ابھی تک جاری ہے، اور کسی اعتبار سے صنعت و حرفت کا مابقتی نظام تباہی اور بے مہارتی کی طرف لیے جا رہا ہے۔

چنانچہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے تعلقات اور سابقہ نظام کی اصلاح ایسے اشد ضروری مسائل ہیں جن سے انسانیت کو دو چار ہونا پڑ رہا ہے۔ ان کو حل کرنے کے لیے مختلف طریقے تجویز کیے گئے ہیں۔ اشتراکی سمجھتے ہیں کہ پیدائش دولت کے ذرائع کی مالک ریاست ہے۔ ریاست سے ان کی خواہش ہے کہ وہ صنعت و حرفت کا اس طرح انتظام کرے کہ اس میں پوری جماعت کے مفاد کا خیال رکھا جائے۔ سابقہ نظام کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے جب وسیع پیمانے پر ریاستی انتظام کرنا پڑا تو جنگ عظیم کے دوران میں یہ تجربہ ہوا کہ صنعتی مسئلے کا یہ حل حکومت پر ایک وسیع اور گراں خرچ محکمے کا بار ڈال دینا ہے، جسے تجارت اور صنعت و حرفت پر پورا اختیار دیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی زیر بحث ہے کہ مابقت سے جو سرگرمی پیدا ہوتی ہے، اب اس کے نہ ہونے سے دریا اور تحقیقات کی روح مڑھ ہو جائے گی۔

ایک دوسرا حل جو آج کل بار بار پیش کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک صنعت کی نگرانی اس کے کارکن خود اپنے مفاد کے لیے کیا کریں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے شدید صنعتی اور سیاسی بے نظمی بلکہ بد امنی پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ ایک انتہائی قہم کا خیال انیسویں صدی میں جرمنی کے اشتراکی کارل مارکس نے پیش کیا ہے۔ اس نے "جامعی جنگ" کی تلقین کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ جنگ متوسط طبقوں کو سرمایہ داری کے خلاف لڑنی چاہیے۔

"پرولتاری" یہ عوام کے ذریعے سے عوام کے لیے صنعت و حرفت کے انتظام میں کارل مارکس کے تبیین نے ایک نہایت ہی وسیع اور بے حد دل چسپ تجربہ کیا ہے۔ ان لوگوں نے ۱۹۱۷ء سے قدیم تباہ کن استبداد کے خاتمے کے ساتھ ہی روس پر اپنا اقتدار جمایا ہے۔ بعض لحاظ سے روسی مارکسوں

یا بالشوکوں کے اس تجربے نے نہایت اہم نتائج پیدا کیے ہیں۔ لیکن یہ دونی مداخلتوں، زمین کے لیے کسانوں کی حرص اور روسی رعایا کے بہت بڑے حصے کی جہالت و غفلت نے اسے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس کے علاوہ انتہائی سختی اور تشدد نے یورپی رائے عامہ کو اس کا مخالف بنا دیا ہے۔ اگر اسے خارجی معیاروں سے جانچا جائے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے روس کی خوش حالی اور شادمانی میں کوئی اضافہ کیا ہے۔ ۱۹۲۱ء سے پیٹر و گراڈ کی آبادی تقریباً بیس لاکھ سے شتر ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ شہر میں سالانہ اموات کی شرح دہشت ناک طور پر فی ہزار انتہائی تک جا پہنچی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۱ء میں روس کے مشرقی اضلاع میں خوف ناک قحط پڑا، اور دو کروڑ کے قریب آبادی کو فاقہ کشی کی مصیبت اٹھانی پڑی۔ اس قحط میں اتنی زیادہ شدت پیدا ہونے کے کئی اسباب تھے، ایک تو یہ کہ بالشوک غلے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ دوسری طرف وسائل حل و نقل شکست ہو گئے تھے جس کی وجہ سے غذائی رسد کی تقسیم ناممکن ہو گئی تھی، اور ایک وجہ یہ ہوئی کہ خانگی تجارت کو بالشوکوں نے ممنوع قرار دے دیا تھا، اس کی وجہ سے غذا کے پیدا کرنے میں سرگرمی کم ہو گئی تھی۔ صنعتی مسئلے کو حل کرنے کے لیے غالباً سب سے زیادہ امید افزا حل ”اتحاد باہمی“ کے نظام میں پایا جاتا ہے۔ یہ نظام بہت تیزی سے ملکوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔ اسی کی وجہ سے سینکڑوں اتحادی کارخانے تقسیم کرنے والے مخازن، ڈائریاں، بنک، تعمیری سوسائٹیاں قائم ہو گئی ہیں۔ اس نظام کے

۱۵ کم از کم حل و نقل کے وسائل کا انقطاع ایک حد

تک ممالک غیر اور روس کے باہمی تجارتی تعلقات کے منقطع ہونے سے ہے۔ اس لیے کہ وہ خود ٹھیک طور پر ریلوے سامان کی سربراہی نہیں کر سکتا تھا۔

ماتحت سامان کے بنانے اور تقسیم کرنے کے لیے متحدہ طور پر تیار کر لے، خریدنے اور فروخت کرنے کی وجہ سے، بنانے اور نکاسی کرنے والے آپس میں متحد ہو جاتے ہیں۔ یا (زرعی اتحاد) باہمی میں سود پر قرض لینے سے، نکاسی کرنے والے بنانے والے بن جاتے ہیں۔ منافع میں شرکت یا تو بالادست منافع کو آپس میں تقسیم کر کے کی جاتی ہو، یا اغراض مشترکہ میں صرف کرنے سے۔ تنہا انگلستان ہی میں تحریک اتحاد باہمی کے چالیس لاکھ سے زیادہ اراکین اور سالانہ تینتیس کروڑ پونڈ سے زیادہ کی داد دستہ ہوتی ہے۔

سائنس کی برکتیں | اگرچہ صنعت و حرفت کی تنظیم جدید کے نتیجے کے طور پر ایسے نازک مسائل پیدا ہو گئے ہیں لیکن اس میں زراشبہ نہیں کہ سائنسی فکر تحقیقات کی رُوح کے احیا اور عملی زندگی میں اس کے استعمال نے انسانیت کو بے شمار فوائد پہنچائے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں زراعت، بافندگی، لہاری، اور مغربی یورپ کے ذرائع حمل و نقل ابھی تک اسی حالت میں تھے، جیسے کہ رؤیوں کے زمانے میں بلکہ بعض لحاظ سے اس سے بھی بُری حالت میں تھے۔ پھر چند نسلوں کے بعد ایجادوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس نے انسانی زندگی کے حالات میں انقلاب پیدا کر دیا۔ سائنسی فکر طریقہ تحقیق نے قوانین قدرت کے جو قاعدے مرتب کر دیے تھے، وہ اب وسیع پیمانے پر استعمال کیے گئے۔ گزشتہ دو صدیوں کے دوران میں انسان نے سائنس کے ذریعے سے قدرت پر عام فتح حاصل کر لی ہے، اور اب وہ اپنے ماحول کا غلام بننے کی بجائے اس کا آقا بن گیا ہے۔ اس نے ریل اور دخانی جہاز بنانا سیکھ لیا ہے، جن سے دنیا کے دُور دست حصوں سے غذائیں جاسکتی ہیں۔ قوط کا انہراد ہو گیا ہے اور ایسے ملکوں کی وسعت

آبادی خوش حالی میں زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گئی ہر جن کی تنہا زراعت ان کی گزر بسر کے لیے قطعی ناکافی تھی۔ اس نے معلومات میں بے انتہا اضافہ کر لیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے انسانی جسم کی ساخت اور اس کی تاریخ معلوم کر لی ہے۔ امراض کی ماہیت اور اس کے خلاف جنگ کرنا سیکھ لیا ہے۔

سترھویں صدی کی ابتدا میں ہاروے نے دریافت کیا کہ خون جسم میں گردش کرتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں سنٹر نے چیچک کا ٹیکہ دریافت کیا۔ ۱۷۶۲ء میں بے ہوش کر کے پہلا اہم ترین عمل جراحی کیا گیا۔ اس سے پہلے ایسے جراحی عمل شاذ و نادر ہی کیے گئے تھے۔ ایک مشہور دوا خانے میں اسی عمل بے ہوشی کے انکشاف سے پہلے بہ مشکل سالانہ تیس آدمی عمل جراحی کے لیے راضی ہوئے تھے۔ پچاس سال بعد اسی دوا خانے کا سالانہ اوسط ۲۰۰ تھا۔ یہ صرف ایک مثال ہے اس حیرت انگیز طبی سائنس کی ترقی کی جس کا نتیجہ تکلیف میں قابل قدر تخفیف اور تحفظ جان ہے۔

۱۸۵۹ء میں چارلس ڈارون کی معرکتہ لار اکتاب "اور فجن آف اسپیسز" منظر عام پر آئی۔ جس طریقے سے ارتقاء کے ماتحت حیات ادا ناما اقسام سے اعلیٰ اقسام میں راست انسان تک نشوونما پاتی گئی ہے اس کے متعلق لوگوں کے خیالات میں اس کتاب سے ایک سر تبدیلی پیدا ہو گئی۔

اسی زمانے میں فرانسیسی سائنس داں اس دشوار ترین تحقیقات میں مصروف تھا کہ کس طرح بہت ہی چھوٹے چھوٹے جراثیم یا جراثیموں کے ذریعے سے مختلف امراض پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایسے طریقوں کے ایجاد کرنے میں بھی مصروف تھا جن کے ذریعے سے ان جراثیم کے برباد کن عمل کا خود

انہی جراثیم کے مرکب ٹپکے کے ذریعے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔
 سائنس دانوں کی طویل طویل فہرست میں ہم نے ان پر صرف دو نام
 مرمری طور پر لے لیے ہیں۔ یہ ان بہت سے سائنس دانوں میں سے صرف
 دو نام ہیں جنہوں نے امراض پر فتح پانے اور اپنے ہم جنسوں کو تکلیف
 اور بے وقت موت سے بچانے کے لیے اپنے علم و فطرت و حیات کو استعمال
 کیا ہے۔

سائنس نے تباہی کے خوف ناک آلات پیدا کیے ہیں۔ طویل زندگی
 تو ہیں، دھماکوئل، زہریلی گیس، آب و دو کشتیاں، یہ سب اسی کے کرشمے ہیں۔
 صنعت و حرفت میں ان کے استعمال نے خطر ناک افلاس اور مصیبتیں پیدا کر دی
 ہیں لیکن اس نے دنیا کی آبادی میں زبردست اضافے کو ممکن بنا دیا ہے۔ سائنس
 نے انسانی زندگی کو طویل کر دیا ہے۔ اموات کی شرح گھٹادی ہے اور انسان کو قدرت
 کی پوشیدہ قوتوں اور خود اپنی قسمت پر ایک نیا اقتدار عطا کیا ہے۔

قرون وسطیٰ میں، بیرونی شہنشاہیت اور جاگیر نظام کے امیرین
خود مختاری کے خلاف کسانوں اور شہریوں کی بغاوتوں کو چھوڑ کر، یونانی
 روح خود مختاری (یعنی ایک قوم کا حکومت خود مختاری و آزادی کے حق) کے

سال ۱۸۰۰ء میں یورپ کی آبادی کا تخمینہ پچاس ملین کیا گیا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں یہ آبادی
 بڑھ کر دوسو اکیس ملین، ۱۸۸۲ء میں تین سو اٹھائیس ملین اور ۱۹۰۰ء میں چار سو پانچ ملین
 ہو گئی۔ (اسکلیو پیڈیا برٹانیکا) ایک اور تخمینے کی روش سے (اسٹینس مانیس ریڈیک) یہ ۱۹۱۸ء میں
 پان سو تین ملین تک پہنچ جاتی ہے۔ امریکہ کی آبادی ۱۸۹۹ء میں ۶۸ ملین تھی جو بڑھ کر ۱۹۰۰ء میں
 ایک سو پچاس ملین ہو گئی۔ یہ اضافہ زیادہ تر جدید صنعت و حرفت اور ذرائع حمل و نقل کی وجہ سے
 چھوٹے سے علاقے میں۔ یعنی وال کثیر آبادی کو ضروریات زندگی ہم پہنچانے کا نتیجہ ہے۔

اجیا کی ابتدا سولہویں صدی کی اس جان توڑ بغاوت سے ہوتی ہے جس میں ہالینڈ نے ظالم اسپینی حکومت سے اپنا حق آزادی منوایا اور اسے حاصل کر لیا۔

اس بغاوت (۱۵۶۸ء - ۱۶۰۹ء) کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ایک چالیس سالہ جنگ میں ایک چھوٹی سی قوم نے جس میں زیادہ تر کسان اور دیہاتی تھے، اور جو ایک ایسے دلدلی ملک میں رہتی تھی جس کا طول ایک میل اور عرض تیس میل سے زیادہ نہ تھا۔ دنیا کی سب سے طاقت ور سلطنت کا کام پانی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اس عظیم الشان سلطنت کے پاس امریکہ کی دولت، اس زمانے کے بہترین سپہ سالار اور بہ ظاہر کبھی نہ ختم ہونے والی یورپ کے بہترین سپاہیوں سے مرتب عظیم الشان فوجیں تھیں۔ ولندیزی جن کے پاس ایسے اتحادی ملک نہ تھے جن کا نام لیا جاسکتا۔ انتہائی ذردناک مصیبتوں اور اذیتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے نہ صرف اپنی آزادی ہی حاصل کر لی بلکہ اس کے حصول کے دوران میں اپنے محصور شہروں کے پیچھے اور اپنے براد شدہ ملک کے بازو پر یورپ میں درجہ اول بھر پور تعمیر کر لیا اور ساری دنیا میں اپنی تجارتی برتری قائم کر لی۔

یہ حیرت انگیز استقلال جس کی بدولت ایسی زبردست فتح حاصل ہوئی، زیادہ تر ایک شخص کے ایقان، اس کی ہمت اور اس کے مغلوب نہ ہونے والے ارادے کا نتیجہ تھا۔ ابھی آدھی جنگ بھی ختم ہونے نہ پائی تھی کہ اس کے ملک کے دشمنوں نے اسے دھوکے سے قتل کر دیا۔ یہ شخص جس نے انفرادی طور پر سب سے بڑھ کر لوٹاں روج آزادی کو دنیا میں پھر زندہ کر دیا تھا، ولیم دی سائلٹ تھا۔ اٹھارویں صدی میں امریکی نوآبادیوں نے واشنگٹن کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ عظمت کے لحاظ سے ولیم دی سائلٹ کے

بعد اسی قائد کا درجہ ہو جس نے پھر ایک بار اسی روح کو زندہ کر دیا تھا۔ ایک نسل کے گزر جانے کے بعد پوئین کی استبدادی شہنشاہیت کا ظہور ہوا۔ کچھ عرصے تک تو اس نے رومی سلطنت میں جس عالمی سلطنت کا وجود تھا اس کے تصور کو بعض لحاظ سے پھر زندہ کر دیا۔ پوئین کی عالمی سلطنت اگرچہ خود مختار مرکزی حکومت تھی مگر اس میں انسان انسان کے درمیان مساوات، روشن خیال نظام قانون اور ایک آزاد و شایستہ تمدن کے اصولوں پر اس کی تنظیم ہونی باقی تھی۔ لیکن انیسویں صدی کی ابتدا میں ایسا تصور ایک شدید موجد غلطی تھی۔ پوئین کو اسی قومیت نے تباہ کیا جس کے ساتھ اس نے اور اعتبار سے بے اعتنائی برتی تھی۔ لیکن ایک لحاظ سے پوئین نے اسی قومیت کا مظاہرہ انتہائی جارحانہ اور خطرناک طور پر کیا تھا۔ روس، اسپین اور جرمنی میں قومیت نے زور پکڑا اور اسے کچل کر رکھ دیا۔ انگلستان میں قومیت اپنے جارحانہ پہلو سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہی۔

پوئین کی شہنشاہیت کی شکست نے خود بخود یونانی روح خود مختاری کے احیا کا کام کیا۔ نصف صدی کے گزرنے کے بعد دورِ حاضرہ میں ان عجیب و غریب سلسلہ واقعات کے دوران میں یہ روح اپنے درخشاں منتہائے کمال کو پہنچ گئی جو جن سے اطالیہ غیر ملکی حکومت اور استبدادیوں سے نجات پا کر میدانِ ٹ کی دستوری حکومت کے حلقے میں متحد ہو گیا۔ اطالیہ کی غداری کی "قیامتِ اخیر" داستان ۱۸۴۸ء سے لے کر ۱۸۴۹ء تک جاری رہی۔ پٹانٹ کے دلیر بادشاہ وکٹر امائیول کے علاوہ مازی نی کیور اور گرے ہالڈی اس کی سہ فرانس میں ایک حد تک اس کا انحصار عام مہم پر تھا، اور یہ رے عام کے ذریعے حاصل کی جاتی تھی۔

اہم شخصیتیں ہیں۔ ماری ٹی جہوریت کا فلسفی تھا۔ اس نے اطالیہ کو اتحاد اور آزادی کا معتقد بنایا اور ۱۸۴۹ء میں رومی جہوریت کے چند مہینوں کی مختصر مدت میں اس بات کی غالباً سب سے نمایاں مثال دنیا کو دکھا دی کہ کس طرح ایک فلسفی علمی حاکم بن سکتا ہے۔ کپور پڈرانت کا بہت زبردست اور دانش مند مدیر تھا۔ اس نے بے نظیر صبر و استقلال کے ساتھ آسٹری شہنشاہیت کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ گرے بالڈی ایک دلیر کان کپتان اور اطالوی مجاہد وطن کا معبد تھا۔ اس نے دشمنوں کے خلاف کئی مایوسانہ مہموں کی قیادت کی۔ اس کی مختصر سی سرخ قبضہ رضا کار فوج نے فینیکل کی استبدادی فوجوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ مجروحانہ طور پر شکست دی اور یوں اس نے فینیکل کے علاقے کو آزاد شدہ اطالیہ کے ساتھ متحد کر دیا۔

دستوریت ہم یہ بتا چکے ہیں کہ مسلسل اصلاحات کے ذریعے سے جس کی ابتداء منشورِ اعظم سے ہوئی تھی۔ کس طرح انگلستان میں پارلیمانی حکومت کا آغاز ہوا۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ کس طرح بادشاہت کو حکومت کے دستوری طریقے اختیار کر لے پر مجبور ہونا پڑا۔

سولہویں صدی کے دوران میں ٹیوڈر خاندان کی طاقت ور اور خود مختار بادشاہت پارلیمنٹ کے دباؤ سے مخلصی پانے میں کامیاب ہو گئی لیکن سترھویں صدی میں کم زور اور ضعیف رستوارٹ بادشاہوں کی ایسی ہی کوششیں پہلے تو موجب نزاع بنیں، پھر انگلستان کی قدیم دستوری آزادیوں کے مطالبے اور آخر کار بادشاہ اور پارلیمنٹ میں ایک عظیم خانہ جنگی کا باعث ہوئیں۔ اس جنگ میں بادشاہ کو شکست فاش اٹھانی پڑی۔ یہ زیادہ تر اولیور کرامول کی دانش مندانہ انتظامی قابلیت کا نتیجہ تھا۔ اولیو

کرامول خود بعد میں ایک فوجی حکومت کا صدر بن گیا۔ اس کی یہ فوجی حکومت بادشاہت سے بھی کہیں زیادہ غیر دستوری ثابت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ کا اقتدار اور دستوری بادشاہت پھر سے قائم ہو گئی۔ اس صدی کے اختتام تک پارلیمنٹ نے بادشاہ کو معزول کر لے اور بادشاہ کے تمام کاموں پر ایسے وزیروں کے ذریعے سے جو اس کے سامنے جواب دہ تھے انگریزی کرنے کا اختیار کام یابی کے ساتھ استعمال کیا۔

اٹھارھویں صدی کے دوران میں پارلیمانی حکومت کو اور بھی زیادہ عروج حاصل ہوا۔ پارٹی سسٹم کا طریقہ مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گیا۔ اس کے ماتحت جب ایک حکومت بے اقتدار ہو جاتی تو بجائے اس کے کہ اراکین قانون باہر ہو جائیں یا نکال دیے جائیں، اخلاقی اراکین کی حیثیت سے پارلیمنٹ ہی میں رہنے لگے۔ اس اصول پر بھی عمل کیا جانے لگا کہ کابینہ میں تمام وزیر و وزیر اعظم کی رہنمائی میں متحدہ طور پر کام کریں۔ کابینہ کے تمام وزیر بطور ایک جماعت کے مقرر ہوں اور اسی طرح علیحدہ کیے جائیں، اور پوری کابینہ اپنے اراکین کی حکمت عملی اور طریقہ کار کی ذمہ دار ہوگی۔ لیکن اس کا حلقہ انتخاب نہایت محدود تھا، اور بڑے بڑے زمین داروں کی ریشہ دوانیوں کا راستہ خطرناک طور پر کھلا تھا۔

انیسویں صدی کے دوران میں حلقہ ہائے انتخاب کو کئی اصلاحی قوانین کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ وسعت دی گئی۔ ان میں سب سے زیادہ اہم قانون ۱۸۳۲ء میں اشرافیہ کے ساتھ ایک شدید لیکن دستوری کش کش کے بعد منظور کیا گیا تھا۔ پارلیمانی انتخاب کی شنری پر اب تک زیادہ تر یہی جماعت حاوی تھی اور اس کے ذریعے سے ملک کی حکومت

پر اس کا قبضہ تھا۔ ۱۹۱۸ء میں عورتوں کو اس میں شریک کر لیا گیا۔ قوم کی مرضی جو دارالعوام کے ذریعے سے ظاہر کی جاتی تھی، اس کو نامنظور کرنے کا جو اختیار دارالامرا کو حاصل تھا، اس میں چند سال ہوئے اچھی طرح کاٹ چھانٹ کی گئی ہو۔ چنانچہ اس وقت جمہوری طور پر مرکب دارالعوام انگلستان میں کامل شاہی اقتدار استعمال کرتا ہو۔ اگر کا بینہ دارالعوام کا اعتماد کھو دیتی ہو، یعنی اکثریت اس کی حامی نہیں رہتی تو اس کے اراکین کو یا تو مستعفی ہونا اور دوسری جماعت کے لیے جگہ خالی کرنا ہوتا ہو، جسے اکثریت حاصل ہوتی ہو، یا اسے بادشاہ سے درخواست کرنی پڑتی ہو کہ وہ پارلیمنٹ کو برخاست کر دے اور ایک نئے انتخاب کا حکم دے۔ تازہ انتخاب کی درخواست اس موقع پر ہوتی ہو کہ ممکن ہو قوم ان کی حکمت عملی سے اس کے حامیوں کے انتخاب کے ذریعے سے پندیدگی کا اظہار کرے۔ یہ حقیقت کہ کسی نزاعی موقع پر پارلیمنٹ کو توڑ دینا، اور جدید انتخاب کا عمل میں لانا، اور دوسری جمہوری دستوروں کے مقابلے میں انگریزی وضع قانون کے کام کو بہت زیادہ رے عامہ کا لحاظ کرنے والا اور بہت زیادہ عوام کی مرضی کا خائندہ بنادیتا ہو۔ دوسری جمہوری دستوروں میں دونوں قانون ساز مجلسوں کے اراکین مقررہ سالوں کی ایک میقات کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی غیر معمولی مسئلہ درپیش ہوتا ہو تو اس کو ایسے لوگ حل کرتے ہیں جن کا انتخاب اس مسئلے میں ان کے نقطہ نظر سے نہیں کیا گیا تھا۔

اس طرح برطانیہ عظمیٰ کے جدید دستور نے بادشاہ اور امرا کی قوت کو پوری طرح قوم کے اقتدار کے ماتحت کر دیا ہو۔ یہ اقتدار قوم دارالعوام میں اپنے خائینوں کے ذریعے سے استعمال کرتی ہو۔ اس دستور کی بنیادی

خصوصیات کی دُنیا بھر میں نقل کی گئی ہو۔

جمہوریت میں عموماً دستوری بادشاہت کی بہ نسبت صدرِ جمہوریہ کو بادشاہ سے زیادہ اختیار دیا جاتا ہے۔ مقننہ کا دوسرا چمبر (پاسینٹ) عموماً انگریزی دارالامرا سے بہت زیادہ مقتدر ہوتا ہے، اور ایک جداگانہ اقتدار (یعنی ممالکِ متحدہ میں سپریم کورٹ آف بوڈی کیچر) اس کی نگرانی کے لیے قائم کیا جاتا ہے تاکہ حکومت کے مختلف شعبے اپنی مقررہ حدود سے متجاوز نہ ہونے پائیں۔

اس طرح دستوری قانون کے بنیادی اصولوں کا احترام کرنے کی یونانی روحِ آزادی، جمہوریت کی پناہ گاہ کی حیثیت سے دُنیا میں پھر زندہ ہو گئی۔ اس میں زیادہ تر برطانوی پارلیمنٹ کی تدبیر بھی ترقی، اس کے قوانین کی تدبیر، اس کے پارلیمانی اداروں کے قیام اور دُنیا کی روشن خیال قوموں نے جو اس کی نقل کی ہو، ان سب چیزوں نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ بہت سے ملکوں میں مکتوبی دستور کے ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس میں خطرہ ہے کہ یہ بے روح اور بے لوج ہونے کی وجہ سے بعض اوقات ترقی کے راستے میں روڑا نہ ثابت ہو، لیکن یہی چیز نئے قائم شدہ جمہوری اداروں کو منظم اور مستحکم کرنے میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسا دستور اکثر ایک احترامِ آمیز شیفتگی کا سبب بن جاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے قدیم یونانی شہری اپنی شہری ریاست کے بنیادی قوانین کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔

اگرچہ اٹھارویں صدی کے دوران میں انگلستان کی حکومت

جمہوریت

ایک دستوری بادشاہت تھی، تاہم رائے دہی کا حق اتنا محدود تھا اور اشرافیہ نے اصلی اقتدار کو اتنی تنگ دلی کے ساتھ اپنے قبضے میں رکھا تھا کہ کسی معنی میں بھی یہ جمہوریت نہیں کہلا سکتی تھی۔
حاشیہ صفحہ ۲۳۲ پر دیکھیے

یورپ کے اور مقاموں پر اس صدی میں مطلق العنان ہی حکم رواں تھے جو کم و بیش نیک دل تھے اور مختلف اقوام کو اس طرح منظم کر رہے تھے یہ اپنی اصلاح کر دیں اور پھیلیں پھولیں۔ یہ تنظیم خود اصلاحی، توسیع اور باہمی مخالفت کے سلسلے میں بہت ہی معقول تھی اور ایک دوسرے کی رقابت پر مبنی تھی لیکن یہ لوگوں کے بے شمار گروہوں کو جاگیر کی نظام کی ظالمانہ باقیات سے نجات دلانے میں ناکام رہے۔

۱۸۳۷ء میں جب انگلستان نے امریکی نوآبادیوں کی آزادی تسلیم کر لی تو آباد کاروں نے اپنی نئی قوم کی تنظیم شروع کر دی۔ یہ تنظیم انتہائی جمہوری طریقوں پر ہوئی تھی۔ یہ طریقہ وہ تھے جو بڑے بڑے سیاسی مفکروں نے تجویز کیے تھے۔ اور ان میں سب سے بڑا فرانسیسی مفکر دسوتھوٹا۔ موروثی حقوق و مراعات منسوخ کر دیے گئے۔ قانون کو اتنا سادہ مساویانہ اور وسیع کر دیا گیا کہ عملاً تمام یورپی نسل کے بالغ مرد آبادی کو اس میں شریک کر لیا جاسکے۔ معاشی اور معاشی تئیرات نے جاہل کی عموماً اور زمین جاہل کی خصوصاً وسیع تقسیم کا آغاز کر دیا۔ چند سال بعد ان اصلاحوں کی عمدگی نے ایک انگریز بیاح و کیم کوٹ کے دل میں انٹرفیڈ کے خلاف غصے کی آگ بھڑکا دی۔ جنہوں نے اس کے ملک میں ۱۸۳۲ء کے فارم بل تک "بادشاہ اور رعایا دونوں کو یکساں پامال کر رکھا تھا" لیکن ان اصلاحوں کا سب سے زیادہ قابل لحاظ اثر خود مالکیت متحد سے باہر آزاد خیال اور سمجھ دار فرانسیسیوں پر پڑا۔

فرانس میں اٹھارویں صدی کے دوران میں کثرت سے سیاسی خیال

(۲۳۷ کا حاشیہ) ۱۷۹۲ء میں اندازہ کیا گیا تھا کہ کل ۴۰ لاکھ جن میں سے ۱۲۰ لاکھ اس سے

تھے، انگریز دارالعلوم کی اکثریت کے انتخاب کو خود غرضانہ چالوں سے اپنے قابو میں رکھتے تھے۔

آرمائیاں اور مباحثے ہوتے رہے۔ مان ٹیگولنے موجودہ سیاسی اداروں پر سخت تنقید کی۔ بہت سے روشن خیال مصنفوں نے جو ان سائیکلو پیڈیا کے نام سے مشہور ہیں، یہ اعلان کر دیا کہ موجودہ حالات اکثر پیش تر غیر منصفانہ ہیں۔ روسو (۱۷۱۲ء - ۱۷۷۸ء) نے اس عقیدے کا پرچار شروع کیا کہ انسان پاک باز اور شاداں ناقص معاشرتی اور سیاسی نظام کی وجہ سے اپنے اس مقام سے گر گیا ہے۔ اگرچہ اس کی تحریروں میں دلائل صحیح نہیں تھے۔ تاہم انھیں بہت بڑی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اس طرح جب ۱۷۸۹ء میں شاہ فرانس اپنی حکومت کے دوالیہ ہو جانے کی وجہ سے اسٹیٹ جنرل (فرانسی پارلیمنٹ) کے طلب کرنے پر مجبور ہو گیا جو ۱۷۹۲ء سے اب تک طلب نہیں کی گئی تھی۔ تو قوم جو ناپاک ظالمانہ سیاسی نظام کی گونا گوں خرابیوں سے نالاں ہو رہی تھی، یکایک جمہوری حکومت کے لیے آبل پڑی اور اس جوش کے سیلاب میں مطلق العنان بادشاہت اور جاگیرى مفاد دونوں تکیے کی طرح بہ گئے۔ انقلاب فرانس کی ایک بڑی اہمیت یہ ہو کہ وہ ایک حقوق مساوات اور جمہوری آزادی کی زبردست تحریک بھی یعنی یہ ایک ایسی سوسائٹی اور ایک ایسے نظام کی تحریک جس میں ہر شخص کو خواہ وہ کسی ذات یا خاندان کا ہو، اس کا سادی موقع حاصل ہو کہ وہ اپنی فطری بلندیوں کی آخری حد تک پہنچ سکے اور اپنی قوم کی رہ نمائی کر سکے۔ اس حیثیت سے انقلاب فرانس ایک ایسی تحریک تھی جو یونانی تصورات کے احیا میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ یورپی قوموں نے ایک ایسی قوم کو بیدار ہوتے دیکھا جو متحد و مستحکم خود مختار اور مساوات و اخوت میں متحد تھی۔ اس میں نہ قدیم رؤس کی طرح کوئی مخصوص حقوق کا حکم رہا، نہ طبقہ تھا، نہ امریکہ کی طرح اس میں ایسی قوم تھی جو غلامی

میں دینی ہوئی ہو۔ اور نہ جاگیریں اشرفیہ کی ظالمانہ باقیات تھیں جو انگلستان میں چلی آتی تھیں۔ لیکن بے رگام عوام کی دہشت انگیز حکومت ”تحفظ عامہ کی مجلس“ کے خوبی استبداد، جمہوریت کے بھیس میں جارحانہ قومیت کے خطرناک ہیجان، پولین کی فوجی شہنشاہیت اور آخر کار لومئی ہفت و ہم کی بحالی سے قدیم فاسد مطلق العنانی کا ردِ عمل، ان سب باتوں نے بہت جلد اس تصور اور اس خیال کو دھندلا کر دیا۔ تاہم کوئی چیز جمہوریت کی قیامت خیز یوں کو لوگوں کے دلوں سے محو نہ کر سکی۔ مقدس اتحاد کی تمام پیش بندیوں اور سختیوں کے باوجود آزاد خیالی کی روئے بہ تدریج زور پکڑا۔ اور ۱۸۷۱ء میں تقریباً تمام یورپی ملکوں میں پھر ایک انقلاب پھوٹ پڑا۔ اس ”حیرت انگیز“ سال کے بعد پھر ردِ عمل کا زمانہ آیا۔ لیکن اب دنیا میں کوئی جبروت شدہ انقلابی جمہوریت کی قوت کا مستقل طور پر مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یورپ کا ہر ملک یا تو ایک باقاعدہ دستوری تغیر یا فوری انقلاب کے ذریعے سے اشرفیہ کی مراعات کو منسوخ، استبداد کی قوت برباد اور حق انتخاب کو وسیع کر کے عوام تک پہنچانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ تجربے نے ثابت کر دیا کہ ایسے جمہوری اداروں کے صحیح عمل کا دار و مدار زیادہ تر ایک موثر اور لازمی نظام تعلیم کے اجرا پر ہے۔

اس طرح آزاد اور مساوات پسند جمہوریت کی یونانی روح — وہ روح جو انقلابِ فرانس کے نعرے ”حریت، مساوات، اغوت“ میں مجتمع ہو گئی تھی — دنیا میں واپس آگئی ہے، اور رؤس کے سوا ہر جگہ اس کا احترام اور عزت کی جاتی ہے۔ رؤس میں جمہوریت اور نمایندہ، حکومت کو (جیسا کہ اور مقاموں پر اس اصطلاح کے معنی لیے جاتے ہیں) اس بنا پر نامنظور کر دیا گیا

ہو کہ یہ لازمی طور پر بہت زیادہ قوت تعلیم یافتہ اور بے کار اوسط طبقے کے ہاتھ میں دے دیتی ہو۔ ایسے لوگوں کے مفاد بھی حرفتی سرمایہ دارانہ نظام کے جیسے ہی ہیں۔ اس نظام میں سرمائے دار جب کبھی کسی حرفت کا اہتمام اور انتظام کرتے ہیں تو اس سے خود ہی نفع پاتے ہیں یا نقصان اٹھاتے ہیں۔ مزدور بلا لحاظ نفع و نقصان مقررہ اجرت پاتے ہیں۔ نفع میں ان کو کوئی حصہ نہیں دیا جاتا۔

روس میں بالشویک حکومت ”پرولتاریوں کی آمریت“ کے قیام کی ایک کوشش ہو۔ یعنی خود مزدوروں کو حرفتی اور توہمی زندگی میں سب سے اعلیٰ و افضل قرار دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہو، وہ ہر حرفتی اور ملکی وحدت کے لیے کونسلوں کا (جو ”سویٹ“ کہلاتی ہیں) ایک پیچیدہ نظام ہو۔ اس نظام کے ذریعے سے مزدور اور کان خود ہی اپنے کارخانوں اور دیہاتوں کا انتظام کریں گے۔

لیکن سویٹ نظام نہایت بے ڈھنگا ہو۔ اس میں بے شمار کونسلیں ہیں، جن کے درجے، اختیارات اور حلقہ ہائے اثر مختلف ہیں۔ روس کے لاتعداد جاہل اور بے حوصلہ عوام میں لازماً اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ استبدادی اختیارات کا اجتماع چند قابل مگر بے لگام لیڈروں کی ذات میں ہو گیا ہو۔ ایک تازہ ترین کتاب میں ان لیڈروں میں سے ایک بڑے شخص نے اس حالت کو ذیل کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے: ”انقلاب، انقلابی جماعتوں سے چاہتا ہوں کہ تمام اختیاری ذرائع سے اس کا مقصد حاصل کیا جائے۔ اگر اس کے لیے ضرورت ہو تو مسلح بغاوت کی جائے یا بشرط حاجت دہشت انگیزی سے کام لیا جائے۔ ایک ایسی انقلابی جماعت جس نے حکومت پر لڑ کر فتح پالی ہو، اس پر مجبور ہو کہ

ان تمام کوششوں کو جو حکومت کو اس کے ہاتھ سے چھین لینے کے لیے کی جائیں، انہیں بندوبست کے زور سے دبائے۔ ”یہ الفاظ تقریباً وہی ہیں جو روسیئر نے اپنے اعلان میں کہے تھے، جو اس نے مجلس تحفظ عامہ کی حکمت عملی کے متعلق کیا تھا۔ اسی نے ۱۸۹۳ء سے لے کر ۱۸۹۴ء تک انقلابی فرانس کو خون میں نہلا دیا۔ ”ہماری حکمت عملی کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ قوم پر حکومت عقل و فہم کے ساتھ کی جائے اور قوم کے دشمنوں پر دہشت سے۔ دہشت محض ایک طرح کا انصاف ہے جو نوری شدید تر اور مضبوط تر ہے اس لیے انصاف سراسر شکی ہے۔

ٹراٹسکی نے جمہوریت کے متعلق اس سے بھی زیادہ صاف بیانی ہے کہا ہے: ”ہم ایسی جمہوریت سے جو پر دلتاریوں کے ہاتھ میں ساری قوت دے دیتی ہے، دست بردار ہوتے ہیں“ اس طرح اشتراکیت گویا ایک اور نعرہ جنگ ہے جو ایک مخصوص جماعت نے خود اپنے مطلقاً نہ اقتدار کے بل بوتے پر ہر شخص کے لیے مساوی حق کے یونانی تصور کے خلاف بلند کیا ہے۔

لے ٹراٹسکی کی کتاب ”دہشت انگیزی کی حمایت میں“

۱۸۹۱ء ایک بہت ہی لبرل خیالات رکھنے والے مصنف نے پیٹر و گراڈسکیٹ کو ۱۹۲۰ء میں بدعت شنش دیکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ”درحقیقت یہ ہٹ بھونگے عوام کا ایک اجتماع تھا جس میں کسی حقیقی قانونی سرگرمی کی اہلیت نہ تھی، زیادہ سے زیادہ اس میں اتنی ہی صلاحیت تھی کہ وہ پلیٹ فارم پر آنے والی برسر اقتدار حکومت کو منظوری دے یا اسے نامنظور کر دے۔ انگریزی پارلیمنٹ سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو اس میں اتنی ہی تنظیم، قابلیت اور کام کی صلاحیت تھی جتنی کہ مختلف پہلوؤں سے بھرپور ہے ایک بڑے تھیلے اور ایک پرائی، غلط، لیکن چلنے والی گھڑی میں ہو سکتی ہے۔“ (دلز روس ”سان لوہو“ صفحہ ۱۲۰)

خاتمہ اب ہم تمدن کے آغاز اور ارتقا کے اس مختصر مطالعے کے آخر میں پہنچ جاتے ہیں۔ حقیقی تہذیب ایک ایسی حالت ہو جس میں ہر شخص اپنی فطرت کے ہر پہلو کو پوری قابلیت، آزادی اور رضامندی سے انسانیت کی خدمت میں بطور کل کے صرف کر سکے۔ ہم اس کے بعض بڑے بڑے دشمنوں کو دیکھ چکے ہیں۔ یعنی خود غرضانہ خواہشات، خود غرضانہ ذات بندی اور جماعت بندی، خود غرضانہ نفاق، خود غرضانہ جاگیر کی نظام، خود غرضانہ قومیت۔ تہذیب کے یہ دشمن اس لیے خطرناک ہیں کہ یہ صرف ایک جماعت کے مفاد یعنی ایک شخص کے مفاد یا ایک جماعت یا ایک قوم یا ایک پارٹی یا ایک ملک کے مفاد کو تمام نوع انسانی کے مفاد سے بالاتر رکھتے ہیں۔

ہم نے ان بڑی بڑی قوموں کا مطالعہ کیا جو تہذیب کے لیے ان دشمنوں سے جنگ کر چکی ہیں۔ ان میں سب سے اول مذہبی قوتیں ہیں، جنہوں نے مشرق میں جنم لیا۔ مستقبل کے لیے خدمت کا چینی تصور، ذات اور نفس سے نجات کا ہندی تخیل، اخوت کا اسلامی مطالبہ، خدائی بادشاہت کا عیسائی غرور۔ وہ خدائی بادشاہت جس میں تمام انسان ایک الہی باپ کے بچوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے متحد اور باہمی محبت سے ایک دوسرے کی خدمت کریں گے۔ یہ سب نہایت اہم مذہبی عناصر ہیں۔

پھر ہم نے تہذیب کے اس منظر پر غور کیا جسے سب سے پہلے یونانیوں نے عملی اور کام کرنے والے اداروں کی صورت میں پیش کیا تھا، اور دستوری قانون خود مختاری، جمہوریت، فکر اور ضمیر کی آزادی، سائنسی فکر، تحقیقات اور ایک عالمی مملکت کے اصولوں پر اس کی تنظیم کی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عالمی مملکت کی عملی تنظیم اور ایک زبردست باقاعدہ دیوانی اور فوج داری قانون

کی تدوین میں کس طرح رؤیہ نے اپنا سبق ادا کیا، اور یہ قانون وہ ہی جو انسان انسان کے درمیان تعلقات کو باضابطہ بناتا ہے۔

اس کے بعد ہم نے وحشیوں کے حملوں کے ہیبت ناک نتائج، پھر جاگیرى نظام اور اس کے بعد جارحانہ قومیت کے عروج کا مطالعہ کیا۔ تہذیب کے ان دو بڑے دشمنوں کا جن قوتوں نے مقابلہ کیا، اور خاص کر ان عوامل کا جو موجودہ بین قومیت کے عروج کا سامان کر رہے ہیں، ان کا بھی ہم نے جائزہ لیا۔ یہ عوامل وہ ہیں جو ایک عالمی مملکت کی تعمیر کے لیے موثر طور پر بدامن قومیت کو دہائیں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہر قوم اور ہر فرد کو انتہائی آزادی عطا کریں گے۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک بین قومی مجلس ایک خاندان اقوام (برطانوی دولت عامہ اقوام) اور ایک نئی بین قومی قوم (ممالک متحدہ امریکہ) کے تصور کا مطالعہ کیا۔

سب کے آخر میں ہم نے یہ دیکھا کہ حقیقی تہذیب کے وہ عملی اصول اور وہ ادارے جنہیں مذہنوں پہلے یونانیوں نے قائم کیا تھا، اب کس طرح جدید دنیا میں پھر زندہ ہو گئے ہیں۔ کس طرح ان کا یہ دوسرا جنم انسانی نسل میں کثیر عددی نہایت اور بہت سے مختلف قسم کے میدانوں میں آزادی کی طرف زبردست ترقی کے ہم معنی ہو۔ اس طرح جو ترقی کی گئی ہو، وہ اس طریقے پر مبنی ہو جس پر ہماری موجودہ آزادی اور تہذیب کی بنیاد عمیق روحانی حقائق پر رکھی گئی ہو اور ان روحانی حقائق کا اعلان سب سے پہلے مشرق میں کیا گیا تھا۔ محبت، اخوت، مستقبل کی خدمت کے جذبے اور خود غرضانہ جذبات پر فتح پائے بغیر ہماری تہذیب حقیقی اور مستقل تہذیب نہ بن سکے گی، بلکہ ان چیزوں کے بغیر ہماری تہذیب ایک سطحی تمدن، یا ایک عبوری دور بن کر رہ جائے گی اور اس کا انجام وہی برائی

ہوگا جو رؤیہ پر ایک دفعہ آچکی ہو۔

بہر حال، اس سے پہلے انسانیت کی امید اتنی زبردست نہیں تھی، جتنی کہ آج ہو۔ یہ زبردست امید ہی تہذیب کی، یہ زبردست امید ہی خدایٰ بادشاہ^{ست} کی۔ یہ امید صرف اسی طرح پوری ہو سکتی ہو کہ تمام دلوں زمین پر ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی مرضی سے اپنی پوری زندگی اور اپنی تمام سرگرمیاں انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دے۔

تاریخی جدول

جاوے کا انسان	۵۰۰۰ ق۔ م کے قریب
ہائیڈل برگ کا انسان	۲۵۰۰۰ ق۔ م کے قریب
پلٹ ٹاؤن کا انسان	۱۵۰۰۰ ق۔ م کے قریب
تندر تھال کا انسان (پتھر کے آلات، آگ)	۵۰۰۰ ق۔ م کے قریب
کرومیناڈ کا انسان (غاروں کی تصویریں)	۳۵۰۰۰ ق۔ م کے قریب
جدید حجری عہد کا انسان (زراعت، چمک دار آلات، پالتو جانور)	۱۰۰۰۰ ق۔ م کے قریب
عراق میں سامری تہذیب	۶۰۰۰ ق۔ م کے قریب
مصری تہذیب	۵۰۰۰ ق۔ م کے قریب
بحریرہ کریٹ کی تہذیب (ملاحی)	۴۰۰۰ ق۔ م کے قریب

مصر میں عظیم اہرام کی تعمیر	۳۷۰۰ ق۔ م کے قریب
اکادی سلطنت عراق میں	۲۷۵۰ ق۔ م کے قریب
چین ایک متحدہ سلطنت کی صورت میں فنیقی تہذیب -	۲۰۰۰ ق۔ م کے قریب
آریا ہندستان اور یونان میں داخل ہوتے ہیں۔	۱۵۰۰ ق۔ م کے قریب
یہود فلسطین میں آباد ہو جاتے ہیں۔	۱۲۰۰ ق۔ م کے قریب
یونانیوں کے ہاتھوں کرپٹ کی سلطنت کا خاتمہ۔	۱۲۰۰ - ۱۱۰۰ ق۔ م کے قریب
حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی سلطنت۔	۸۵۰ ق۔ م کے قریب
قرطاجنہ کی بنیاد۔	۸۰۰ ق۔ م کے قریب
یونانی نوآباد کاری کا زمانہ۔	۸۰۰ - ۵۰۰ ق۔ م کے قریب
روم کی بنیاد۔	۵۳۷ ق۔ م
ایتھنز میں ڈراکو کے قوانین۔	۶۲۱ ق۔ م
کلڈانی سلطنت عراق میں۔	۶۰۶ ق۔ م
سولن کے قوانین ایتھنز میں۔	۵۹۲ ق۔ م
عراق میں یہودیوں کی غلامی۔	۵۵۷ - ۵۳۸ ق۔ م
یہودی پیغمبر حضرت اسحاق کی ولادت۔	۵۵۰ ق۔ م
ہاتما بدھ اور کنفوشش کا عہد۔	
ایرانی لیڈیا کی سلطنت کو زیر کرتے ہیں۔	۵۴۶ ق۔ م
ایرانی سلطنت عراق میں۔	۵۳۹ ق۔ م
رومی جمہوریہ کی ابتدا۔	۵۱۰ ق۔ م

ایٹھن میں کلینر تھینر کے قوانین۔
 می لی ٹس پر ایرانی قبضہ۔
 روہمی عوام کو مری مینوسوں کے تقرر کا حق۔
 مے تھان کے مقام پر ایرانیوں کو شکست۔
 تھرا پیلے اور سلاس پر ایرانیوں کی شکست۔
 پلے ثیا کے مقام پر ایرانیوں کی شکست۔
 سقراط۔
 پری کلینر کا اقتدار ایٹھن میں۔
 روہم میں قوانین کی تدوین۔
 روہمی عوام امیروں کے ساتھ شادی بیاہ
 کا حق حاصل کر لیتے ہیں۔
 مفکر افلاطون۔
 سائنس داں اور مفکر ارسطو۔
 روہم میں لی سی تین قوانین۔
 فلپ مقدونی یونان فتح کرتا ہے۔
 سکندر ایشیا میں۔
 سکندر فلسطین اور مصر میں۔
 ہندس اقلیدس۔
 کتاب یوحنا۔
 انجیل آرمیدس۔
 انجیل ہران۔

۵۰۸ ق۔ م۔
 ۴۹۴ ق۔ م۔
 ۴۹۴ ق۔ م۔
 ۴۹۰ ق۔ م۔
 ۴۸۵ ق۔ م۔
 ۴۸۴ ق۔ م۔
 ۴۶۱ ق۔ م۔
 ۴۶۱ ق۔ م۔
 ۴۵۸ ق۔ م۔
 ۴۴۵ ق۔ م۔
 ۴۲۹ ق۔ م۔
 ۴۲۲ ق۔ م۔
 ۴۱۶ ق۔ م۔
 ۴۱۲ ق۔ م۔
 ۴۰۸ ق۔ م۔
 ۴۰۴ ق۔ م۔
 ۴۰۲ ق۔ م۔
 ۴۰۱ ق۔ م۔
 ۴۰۰ ق۔ م۔
 ۳۹۹ ق۔ م۔
 ۳۹۸ ق۔ م۔
 ۳۹۷ ق۔ م۔
 ۳۹۶ ق۔ م۔
 ۳۹۵ ق۔ م۔
 ۳۹۴ ق۔ م۔
 ۳۹۳ ق۔ م۔
 ۳۹۲ ق۔ م۔
 ۳۹۱ ق۔ م۔
 ۳۹۰ ق۔ م۔
 ۳۸۹ ق۔ م۔
 ۳۸۸ ق۔ م۔
 ۳۸۷ ق۔ م۔
 ۳۸۶ ق۔ م۔
 ۳۸۵ ق۔ م۔
 ۳۸۴ ق۔ م۔
 ۳۸۳ ق۔ م۔
 ۳۸۲ ق۔ م۔
 ۳۸۱ ق۔ م۔
 ۳۸۰ ق۔ م۔
 ۳۷۹ ق۔ م۔
 ۳۷۸ ق۔ م۔
 ۳۷۷ ق۔ م۔
 ۳۷۶ ق۔ م۔
 ۳۷۵ ق۔ م۔
 ۳۷۴ ق۔ م۔
 ۳۷۳ ق۔ م۔
 ۳۷۲ ق۔ م۔
 ۳۷۱ ق۔ م۔
 ۳۷۰ ق۔ م۔
 ۳۶۹ ق۔ م۔
 ۳۶۸ ق۔ م۔
 ۳۶۷ ق۔ م۔
 ۳۶۶ ق۔ م۔
 ۳۶۵ ق۔ م۔
 ۳۶۴ ق۔ م۔
 ۳۶۳ ق۔ م۔
 ۳۶۲ ق۔ م۔
 ۳۶۱ ق۔ م۔
 ۳۶۰ ق۔ م۔
 ۳۵۹ ق۔ م۔
 ۳۵۸ ق۔ م۔
 ۳۵۷ ق۔ م۔
 ۳۵۶ ق۔ م۔
 ۳۵۵ ق۔ م۔
 ۳۵۴ ق۔ م۔
 ۳۵۳ ق۔ م۔
 ۳۵۲ ق۔ م۔
 ۳۵۱ ق۔ م۔
 ۳۵۰ ق۔ م۔
 ۳۴۹ ق۔ م۔
 ۳۴۸ ق۔ م۔
 ۳۴۷ ق۔ م۔
 ۳۴۶ ق۔ م۔
 ۳۴۵ ق۔ م۔
 ۳۴۴ ق۔ م۔
 ۳۴۳ ق۔ م۔
 ۳۴۲ ق۔ م۔
 ۳۴۱ ق۔ م۔
 ۳۴۰ ق۔ م۔
 ۳۳۹ ق۔ م۔
 ۳۳۸ ق۔ م۔
 ۳۳۷ ق۔ م۔
 ۳۳۶ ق۔ م۔
 ۳۳۵ ق۔ م۔
 ۳۳۴ ق۔ م۔
 ۳۳۳ ق۔ م۔
 ۳۳۲ ق۔ م۔
 ۳۳۱ ق۔ م۔
 ۳۳۰ ق۔ م۔
 ۳۲۹ ق۔ م۔
 ۳۲۸ ق۔ م۔
 ۳۲۷ ق۔ م۔
 ۳۲۶ ق۔ م۔
 ۳۲۵ ق۔ م۔
 ۳۲۴ ق۔ م۔
 ۳۲۳ ق۔ م۔
 ۳۲۲ ق۔ م۔
 ۳۲۱ ق۔ م۔
 ۳۲۰ ق۔ م۔
 ۳۱۹ ق۔ م۔
 ۳۱۸ ق۔ م۔
 ۳۱۷ ق۔ م۔
 ۳۱۶ ق۔ م۔
 ۳۱۵ ق۔ م۔
 ۳۱۴ ق۔ م۔
 ۳۱۳ ق۔ م۔
 ۳۱۲ ق۔ م۔
 ۳۱۱ ق۔ م۔
 ۳۱۰ ق۔ م۔
 ۳۰۹ ق۔ م۔
 ۳۰۸ ق۔ م۔
 ۳۰۷ ق۔ م۔
 ۳۰۶ ق۔ م۔
 ۳۰۵ ق۔ م۔
 ۳۰۴ ق۔ م۔
 ۳۰۳ ق۔ م۔
 ۳۰۲ ق۔ م۔
 ۳۰۱ ق۔ م۔
 ۳۰۰ ق۔ م۔
 ۲۹۹ ق۔ م۔
 ۲۹۸ ق۔ م۔
 ۲۹۷ ق۔ م۔
 ۲۹۶ ق۔ م۔
 ۲۹۵ ق۔ م۔
 ۲۹۴ ق۔ م۔
 ۲۹۳ ق۔ م۔
 ۲۹۲ ق۔ م۔
 ۲۹۱ ق۔ م۔
 ۲۹۰ ق۔ م۔
 ۲۸۹ ق۔ م۔
 ۲۸۸ ق۔ م۔
 ۲۸۷ ق۔ م۔
 ۲۸۶ ق۔ م۔
 ۲۸۵ ق۔ م۔
 ۲۸۴ ق۔ م۔
 ۲۸۳ ق۔ م۔
 ۲۸۲ ق۔ م۔
 ۲۸۱ ق۔ م۔
 ۲۸۰ ق۔ م۔
 ۲۷۹ ق۔ م۔
 ۲۷۸ ق۔ م۔
 ۲۷۷ ق۔ م۔
 ۲۷۶ ق۔ م۔
 ۲۷۵ ق۔ م۔
 ۲۷۴ ق۔ م۔
 ۲۷۳ ق۔ م۔
 ۲۷۲ ق۔ م۔
 ۲۷۱ ق۔ م۔
 ۲۷۰ ق۔ م۔
 ۲۶۹ ق۔ م۔
 ۲۶۸ ق۔ م۔
 ۲۶۷ ق۔ م۔
 ۲۶۶ ق۔ م۔
 ۲۶۵ ق۔ م۔
 ۲۶۴ ق۔ م۔
 ۲۶۳ ق۔ م۔
 ۲۶۲ ق۔ م۔
 ۲۶۱ ق۔ م۔
 ۲۶۰ ق۔ م۔
 ۲۵۹ ق۔ م۔
 ۲۵۸ ق۔ م۔
 ۲۵۷ ق۔ م۔
 ۲۵۶ ق۔ م۔
 ۲۵۵ ق۔ م۔
 ۲۵۴ ق۔ م۔
 ۲۵۳ ق۔ م۔
 ۲۵۲ ق۔ م۔
 ۲۵۱ ق۔ م۔
 ۲۵۰ ق۔ م۔
 ۲۴۹ ق۔ م۔
 ۲۴۸ ق۔ م۔
 ۲۴۷ ق۔ م۔
 ۲۴۶ ق۔ م۔
 ۲۴۵ ق۔ م۔
 ۲۴۴ ق۔ م۔
 ۲۴۳ ق۔ م۔
 ۲۴۲ ق۔ م۔
 ۲۴۱ ق۔ م۔
 ۲۴۰ ق۔ م۔
 ۲۳۹ ق۔ م۔
 ۲۳۸ ق۔ م۔
 ۲۳۷ ق۔ م۔
 ۲۳۶ ق۔ م۔
 ۲۳۵ ق۔ م۔
 ۲۳۴ ق۔ م۔
 ۲۳۳ ق۔ م۔
 ۲۳۲ ق۔ م۔
 ۲۳۱ ق۔ م۔
 ۲۳۰ ق۔ م۔
 ۲۲۹ ق۔ م۔
 ۲۲۸ ق۔ م۔
 ۲۲۷ ق۔ م۔
 ۲۲۶ ق۔ م۔
 ۲۲۵ ق۔ م۔
 ۲۲۴ ق۔ م۔
 ۲۲۳ ق۔ م۔
 ۲۲۲ ق۔ م۔
 ۲۲۱ ق۔ م۔
 ۲۲۰ ق۔ م۔
 ۲۱۹ ق۔ م۔
 ۲۱۸ ق۔ م۔
 ۲۱۷ ق۔ م۔
 ۲۱۶ ق۔ م۔
 ۲۱۵ ق۔ م۔
 ۲۱۴ ق۔ م۔
 ۲۱۳ ق۔ م۔
 ۲۱۲ ق۔ م۔
 ۲۱۱ ق۔ م۔
 ۲۱۰ ق۔ م۔
 ۲۰۹ ق۔ م۔
 ۲۰۸ ق۔ م۔
 ۲۰۷ ق۔ م۔
 ۲۰۶ ق۔ م۔
 ۲۰۵ ق۔ م۔
 ۲۰۴ ق۔ م۔
 ۲۰۳ ق۔ م۔
 ۲۰۲ ق۔ م۔
 ۲۰۱ ق۔ م۔
 ۲۰۰ ق۔ م۔
 ۱۹۹ ق۔ م۔
 ۱۹۸ ق۔ م۔
 ۱۹۷ ق۔ م۔
 ۱۹۶ ق۔ م۔
 ۱۹۵ ق۔ م۔
 ۱۹۴ ق۔ م۔
 ۱۹۳ ق۔ م۔
 ۱۹۲ ق۔ م۔
 ۱۹۱ ق۔ م۔
 ۱۹۰ ق۔ م۔
 ۱۸۹ ق۔ م۔
 ۱۸۸ ق۔ م۔
 ۱۸۷ ق۔ م۔
 ۱۸۶ ق۔ م۔
 ۱۸۵ ق۔ م۔
 ۱۸۴ ق۔ م۔
 ۱۸۳ ق۔ م۔
 ۱۸۲ ق۔ م۔
 ۱۸۱ ق۔ م۔
 ۱۸۰ ق۔ م۔
 ۱۷۹ ق۔ م۔
 ۱۷۸ ق۔ م۔
 ۱۷۷ ق۔ م۔
 ۱۷۶ ق۔ م۔
 ۱۷۵ ق۔ م۔
 ۱۷۴ ق۔ م۔
 ۱۷۳ ق۔ م۔
 ۱۷۲ ق۔ م۔
 ۱۷۱ ق۔ م۔
 ۱۷۰ ق۔ م۔
 ۱۶۹ ق۔ م۔
 ۱۶۸ ق۔ م۔
 ۱۶۷ ق۔ م۔
 ۱۶۶ ق۔ م۔
 ۱۶۵ ق۔ م۔
 ۱۶۴ ق۔ م۔
 ۱۶۳ ق۔ م۔
 ۱۶۲ ق۔ م۔
 ۱۶۱ ق۔ م۔
 ۱۶۰ ق۔ م۔
 ۱۵۹ ق۔ م۔
 ۱۵۸ ق۔ م۔
 ۱۵۷ ق۔ م۔
 ۱۵۶ ق۔ م۔
 ۱۵۵ ق۔ م۔
 ۱۵۴ ق۔ م۔
 ۱۵۳ ق۔ م۔
 ۱۵۲ ق۔ م۔
 ۱۵۱ ق۔ م۔
 ۱۵۰ ق۔ م۔
 ۱۴۹ ق۔ م۔
 ۱۴۸ ق۔ م۔
 ۱۴۷ ق۔ م۔
 ۱۴۶ ق۔ م۔
 ۱۴۵ ق۔ م۔
 ۱۴۴ ق۔ م۔
 ۱۴۳ ق۔ م۔
 ۱۴۲ ق۔ م۔
 ۱۴۱ ق۔ م۔
 ۱۴۰ ق۔ م۔
 ۱۳۹ ق۔ م۔
 ۱۳۸ ق۔ م۔
 ۱۳۷ ق۔ م۔
 ۱۳۶ ق۔ م۔
 ۱۳۵ ق۔ م۔
 ۱۳۴ ق۔ م۔
 ۱۳۳ ق۔ م۔
 ۱۳۲ ق۔ م۔
 ۱۳۱ ق۔ م۔
 ۱۳۰ ق۔ م۔
 ۱۲۹ ق۔ م۔
 ۱۲۸ ق۔ م۔
 ۱۲۷ ق۔ م۔
 ۱۲۶ ق۔ م۔
 ۱۲۵ ق۔ م۔
 ۱۲۴ ق۔ م۔
 ۱۲۳ ق۔ م۔
 ۱۲۲ ق۔ م۔
 ۱۲۱ ق۔ م۔
 ۱۲۰ ق۔ م۔
 ۱۱۹ ق۔ م۔
 ۱۱۸ ق۔ م۔
 ۱۱۷ ق۔ م۔
 ۱۱۶ ق۔ م۔
 ۱۱۵ ق۔ م۔
 ۱۱۴ ق۔ م۔
 ۱۱۳ ق۔ م۔
 ۱۱۲ ق۔ م۔
 ۱۱۱ ق۔ م۔
 ۱۱۰ ق۔ م۔
 ۱۰۹ ق۔ م۔
 ۱۰۸ ق۔ م۔
 ۱۰۷ ق۔ م۔
 ۱۰۶ ق۔ م۔
 ۱۰۵ ق۔ م۔
 ۱۰۴ ق۔ م۔
 ۱۰۳ ق۔ م۔
 ۱۰۲ ق۔ م۔
 ۱۰۱ ق۔ م۔
 ۱۰۰ ق۔ م۔
 ۹۹ ق۔ م۔
 ۹۸ ق۔ م۔
 ۹۷ ق۔ م۔
 ۹۶ ق۔ م۔
 ۹۵ ق۔ م۔
 ۹۴ ق۔ م۔
 ۹۳ ق۔ م۔
 ۹۲ ق۔ م۔
 ۹۱ ق۔ م۔
 ۹۰ ق۔ م۔
 ۸۹ ق۔ م۔
 ۸۸ ق۔ م۔
 ۸۷ ق۔ م۔
 ۸۶ ق۔ م۔
 ۸۵ ق۔ م۔
 ۸۴ ق۔ م۔
 ۸۳ ق۔ م۔
 ۸۲ ق۔ م۔
 ۸۱ ق۔ م۔
 ۸۰ ق۔ م۔
 ۷۹ ق۔ م۔
 ۷۸ ق۔ م۔
 ۷۷ ق۔ م۔
 ۷۶ ق۔ م۔
 ۷۵ ق۔ م۔
 ۷۴ ق۔ م۔
 ۷۳ ق۔ م۔
 ۷۲ ق۔ م۔
 ۷۱ ق۔ م۔
 ۷۰ ق۔ م۔
 ۶۹ ق۔ م۔
 ۶۸ ق۔ م۔
 ۶۷ ق۔ م۔
 ۶۶ ق۔ م۔
 ۶۵ ق۔ م۔
 ۶۴ ق۔ م۔
 ۶۳ ق۔ م۔
 ۶۲ ق۔ م۔
 ۶۱ ق۔ م۔
 ۶۰ ق۔ م۔
 ۵۹ ق۔ م۔
 ۵۸ ق۔ م۔
 ۵۷ ق۔ م۔
 ۵۶ ق۔ م۔
 ۵۵ ق۔ م۔
 ۵۴ ق۔ م۔
 ۵۳ ق۔ م۔
 ۵۲ ق۔ م۔
 ۵۱ ق۔ م۔
 ۵۰ ق۔ م۔
 ۴۹ ق۔ م۔
 ۴۸ ق۔ م۔
 ۴۷ ق۔ م۔
 ۴۶ ق۔ م۔
 ۴۵ ق۔ م۔
 ۴۴ ق۔ م۔
 ۴۳ ق۔ م۔
 ۴۲ ق۔ م۔
 ۴۱ ق۔ م۔
 ۴۰ ق۔ م۔
 ۳۹ ق۔ م۔
 ۳۸ ق۔ م۔
 ۳۷ ق۔ م۔
 ۳۶ ق۔ م۔
 ۳۵ ق۔ م۔
 ۳۴ ق۔ م۔
 ۳۳ ق۔ م۔
 ۳۲ ق۔ م۔
 ۳۱ ق۔ م۔
 ۳۰ ق۔ م۔
 ۲۹ ق۔ م۔
 ۲۸ ق۔ م۔
 ۲۷ ق۔ م۔
 ۲۶ ق۔ م۔
 ۲۵ ق۔ م۔
 ۲۴ ق۔ م۔
 ۲۳ ق۔ م۔
 ۲۲ ق۔ م۔
 ۲۱ ق۔ م۔
 ۲۰ ق۔ م۔
 ۱۹ ق۔ م۔
 ۱۸ ق۔ م۔
 ۱۷ ق۔ م۔
 ۱۶ ق۔ م۔
 ۱۵ ق۔ م۔
 ۱۴ ق۔ م۔
 ۱۳ ق۔ م۔
 ۱۲ ق۔ م۔
 ۱۱ ق۔ م۔
 ۱۰ ق۔ م۔
 ۹ ق۔ م۔
 ۸ ق۔ م۔
 ۷ ق۔ م۔
 ۶ ق۔ م۔
 ۵ ق۔ م۔
 ۴ ق۔ م۔
 ۳ ق۔ م۔
 ۲ ق۔ م۔
 ۱ ق۔ م۔

رومیوں کے ہاتھ ایٹرس کا نیوں
کی آخری شکست -
فرس کے ساتھ رومی کی جنگ -
ایراٹس تیفنر ہندس -
ہندستان میں اشوک کی حکومت -
قرطاجنہ کے ساتھ رومی کی جنگیں
ہنی بال اطالیہ میں -
عظیم دیوار چین کی ابتدا -
رومی سلطنت اسپین میں -
چین میں ہان خاندان کی حکومت -
شام کے یونانیوں کے خلاف یہودیوں
کی بغاوت -
یاچی منگول مغربی ایشیا میں داخل
ہوتے ہیں -
شام یہودیوں کی آزادی تسلیم کر لیتا ہے -
رومی سلطنت ایشیائے کوچک میں -
مغربی جانب چینی سلطنت کی توسیع -
تمام اطالوی رومی شہریت میں داخل
کر لیے جاتے ہیں -
روم میں سلا کا اقتدار -
پاپسی کی فتوحات مشرق میں -

۲۸۳ ق۔م

۲۸۱ء - ۲۸۵ء ق۔م

۲۸۶ء - ۱۹۴ء ق۔م

۲۸۷ء - ۲۸۳ء ق۔م

۲۸۸ء - ۲۸۶ء ق۔م

۲۱۸ء - ۲۰۳ء ق۔م

۲۱۴ء ق۔م

۲۱۰ء ق۔م

۲۰۷ء ق۔م

۱۶۷ء ق۔م

۱۵۰ء ق۔م

۱۳۱ء ق۔م

۱۳۳ء ق۔م

۱۱۹ء ق۔م

۸۹ء ق۔م

۸۸ء اور ۸۷ء ق۔م

۷۷ء ق۔م

۶۶ ق.م

۶۵ ق-م

۵۹ - ۴۹ - ۳۹ - ۲۹ - ۱۹ - ۹ - ۰

۵۵ ۵۴ ق-م

سَلَمَق-م

۳۱ - ق م

(9) 5.4

249

4. 14. 4. 55

960

2102

9 P14

426

PLC

1. 2. 3.

100-100000-100000

قسطنطنیہ کی بنیاد۔	۶۳۳۰ء
گاتھ روم پر حملہ کرتے ہیں۔	۶۴۱۰ء
انگل، جمویٹ اور ساکسن تو ہیں انگلستان فتح کرتی ہیں۔	۶۴۲۹ء - ۶۶۱۳ء
چالانیس کے مقام پر اٹلیا کے ماتحت ہنوں کی شکست۔	۶۴۵۱ء
دینڈل ریہہ چھوڑ دیتے ہیں۔	۶۴۵۵ء
مشرقی رومی سلطنت کا خاتمہ۔	۶۴۶۵ء
اطالیہ کا گاتھ بادشاہ تھیوڈرک۔	۶۴۹۳ء
شہنشاہ قسطنطنیہ جیٹین۔	۶۵۱۶ء - ۵۶۵ء
لمبارڈ اطالیہ میں داخل ہوتے ہیں۔	۵۶۸ء
حضرت محمد صلعم کی ولادت۔	۵۷۰ء
چین میں ٹانگ خاندان کی حکومت	۶۱۸ء
حضرت محمد صلعم کی تک سے مدینے کو ہجرت	۶۲۲ء
حضرت محمد صلعم کی وفات۔	۶۳۲ء
جنگ یرموک (قسطنطنیہ کے رؤسوں کو عرب شکست دیتے ہیں)۔	۶۳۳ء
قادیہ کی جنگ (عرب ایرانیوں کو شکست دیتے ہیں)۔	۶۳۶ء
عرب قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیتے ہیں۔	۶۶۸ء اور ۶۷۵ء
عربوں کی فتوحات ہندستان میں۔	۶۷۲ء

عرب سلطنت کی انتہائی وسعت۔

9610

قسطنطنیہ میں عربوں کی شکست۔

561A

ٹورس واقع فرانس میں چارلس مارٹل

2644

عربوں کو شکست دیتا ہے۔

پے پن، پوپ کو زنیات عطا کرتا ہے۔

2405

فرانکو کا یاد شاہ شارلی من۔

2A1F 264A

شارلی سن، پے پن کے عطیے کی توثیق

5662

کرتا ہے۔

نشاری من مغرب کا شہنشاہ

شمال کی قوموں کا حملہ۔

1/2000 2000

پورے انگلستان کا بادشاہ ایک برٹ

5. 4. 16

الفرد

29-1 - 2061

کلونیا کسوں کا عروج -

1156 - 91.

جبر منی کا بادشاہ، ہنری دی فوئر۔

919

آلوا غلم ہنگریوں کو شکست دیتا ہے۔

4904

چین میں سنگ خاندان -

२७५०

روم میں شہنشاہ کی حیثیت سے

299

آٹو اعظم کی تاج پوشی۔

ہیو کے پتے فراش کو متحد کرتا ہے۔

2.9.6

بخارا کا ابن سینا -

9-29-20

ہندستان پر افغان حملہ

5/100

شہنشاہ ہنری سوم	۱۰۳۹ء - ۱۱۰۶ء
” ” چہارم	۱۰۵۶ء - ۱۱۰۶ء
سلجوق ترک بغداد کا محاصرہ کر لیتے ہیں -	۱۰۵۸ء
النگھتان کا بادشاہ ولیم اول (زارین فاتح) -	۱۰۶۶ء - ۱۰۸۷ء
پوپ گری گوری ششم -	۱۰۷۳ء - ۱۰۸۵ء
کانورا کے مقام پر ہنری چہارم کی عزتی -	۱۰۷۷ء
صلیبی جنگیں -	۱۰۹۵ء - ۱۲۷۱ء
عوام کی صلیبی جنگ	۱۰۹۶ء
صلیبی جنگ کرنے والے بیت المقدس پر قبضہ کرتے ہیں -	۱۰۹۹ء
شہنشاہ فریڈرک باربروسہ -	۱۱۵۵ء - ۱۱۹۰ء
تاتاری شہنشاہ چنگیز خاں -	۱۱۶۲ء - ۱۲۲۷ء
النگھتان میں جمہوری نظام کا قیام -	۱۱۶۶ء
لگ ناو کی جنگ (المبارڈ لیگ فوڈر باربروسہ کو شکست دیتی ہے) -	۱۱۷۶ء
صلاح الدین حمیت المقدس پر پھر قبضہ کر لیتا ہے -	۱۱۸۷ء
عرب فلسفی ابن رشد قرطبی کی وفات -	۱۱۹۸ء
” بچوں کی صلیبی جنگ “ -	۱۲۱۲ء
شہنشاہ فریڈرک دوم -	۱۲۱۲ء - ۱۲۵۰ء

مختصر تاریخ تمدن

سائنس داں را جربے کن -	۲۳۸
پودی نیاس کی جنگ میں شاہ فرانس	۱۲۱۲ - ۹۲۱۲
کی فتح -	۱۲۱۲
نشور اعظم (انگلستان کے بادشاہ	۱۲۱۵
جان کا عطا کیا ہوا زبردست نشور -	
تاتاری چین کو فتح کر لیتے ہیں -	۱۲۳۲
یورپ پر تاتاریوں کا حملہ	۱۲۳۶ - ۱۲۳۳
انگلستان میں اعزازی مجسٹریٹوں کا تقرر	۱۲۸۳
(یہی مجسٹریٹ بعد میں جسٹس آف	
پیس کہلائے) -	
سائی سن ڈی ماں فورٹ، پہلی انگریزی	۱۲۶۵
پارلی منٹ طلب کرتا ہے -	
دانے -	۱۲۶۵ - ۱۲۳۱
مارکو پولو کی سیاحتیں -	۱۲۶۵ - ۱۲۹۵
شاہ انگلستان ایڈورڈ اول نمونے کی	۱۲۹۵
پارلی منٹ طلب کرتا ہے -	
فرانسیسی پارلی منٹ (اسٹیٹ جرنل)	۱۳۰۲
پہلی دفعہ طلب کی جاتی ہے -	
کوٹ رائی کی جنگ، فلیمی برگر شاہ	۱۳۰۲
فرانس کو شکست دیتے ہیں -	
پاپائی نظام روگیک نان کے مقام پر	۱۳۰۵ - ۱۳۴۴

جلا وطنی میں -

اسکاٹ لینڈ کے باشندے سیانکٹ

۱۳۱۴ء

کی لڑائی میں انگلستان کے بادشاہ

ایڈورڈ دوم کو شکست دیتے ہیں -

سوئزر لینڈ کے باشندے ہینا برگ

۱۳۱۵ء

خاندان کو مارٹ گارٹن کی جنگ میں

شکست دیتے ہیں -

انگلستان اور فرانس کے درمیان دو

۱۳۱۸ء - ۱۳۵۳ء

سال جنگ -

انگریز تیر انداز کرے سی کے مقام پر

۱۳۲۶ء

فرانسیسی فوج کو شکست دیتے ہیں -

انگریز تیر انداز پائی ٹیرس کے مقام

۱۳۵۶ء

پر فرانسیسی فوج کو شکست دیتے ہیں -

چین میں منگ خاندان کی ابتدا -

۱۳۶۸ء

انگریزی پارلیمنٹ بادشاہ کے وزیروں

۱۳۷۶ء

پر الزام لگاتی ہے -

سوئزر لینڈ کے باشندے ہینا برگ

۱۳۶۸ء

خاندان کو سمپاخ کی جنگ میں شکست

دیتے ہیں -

گری سونواس، فلارنس میں یونانی

۱۳۹۹ء

کا پرچار کرتا ہے -

دو دوپوپ۔ ایک رڈ میں اور ایک
اے وگ نان میں۔

۱۳۷۸ء

نشاۃ ثانیہ کا عہد
آگن کورٹ کی جنگ میں انگریز
فرانسیسیوں کو شکست دیتے ہیں۔
جون آف آرک، فرانسیسیوں کو انگریزوں
کے خلاف ابھارتی ہیں۔

۱۳۷۰ء

۱۳۱۵ء

۱۳۲۹ء

چھاپے کی ایجاد۔
مصنوعہ اور سائنس داں لیونا رڈوڈاوسی
ترک قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیتے ہیں۔
”دیاز“ راس اسید پہنچ جاتا ہے۔
موروں کے غرناطہ کی فتح۔

۱۳۸۰ء (تقریباً)

۱۳۵۲ء - ۱۵۱۹ء

۱۳۵۳ء

۱۳۸۷ء

۱۳۹۲ء

۱۳۹۲ء

کولبس شرق الہند میں جزیرے
دریافت کرتا ہے۔

۱۳۹۸ء

کرتا ہے۔

واسکو ڈی گاما ہندستان کے جنوب
میں کالی کٹ پہنچتا ہے۔

۱۳۹۸ء

انگلستان میں کارڈسی نل ولزی کا اقتدار
بال بوا بحر اوقیانوس دریافت کرتا ہے۔

۱۵۱۲ء - ۱۵۲۹ء

۱۵۱۳ء

عہد اصلاح۔

۱۵۱۷ء - ۱۵۵۵ء

جرمنی میں لوتھر اصلاح کی قیادت کرتا ہے۔
کوانز کمسکو فتح کرتا ہے۔

دنیا کے اطراف ہباگ لان کا بحری سفر۔
شہنشاہ چارلس پنجم۔

ہندستان میں مغلوں کی فتوحات
ترک ویانا پر حملہ کرتے ہیں۔

ہنری ہشتم اصلاح کو اپنے ہاتھ میں
لیتا ہے اور انگریزی کلیسا میں ابتری۔
پی زارو، پیرو فتح کرتا ہے۔

میکسیکو کی کتاب "پرنس"
ہنری ہشتم انگریز کلیسا کا صدر بن جاتا ہے۔
کالون، جینیوا میں، پھر فرانس،
اسکاٹ لینڈ اور الینڈ میں تحریک اصلاح
کی قیادت کرتا ہے۔

جیورسٹ نظام کا قیام۔
جوابی اصلاح کا عہد۔

ہندستان میں شہنشاہ اکبر کا زمانہ۔
افغانستان میں ملکہ الزبتھ کا عہد۔
سائنس دان فرانسیس بے کن۔
فرانس میں مذہبی جنگیں۔

ٹیکسیر

۱۵۱۶ء - ۱۵۳۱ء

۱۵۱۹ء - ۱۵۲۰ء

۱۵۱۹ء - ۱۵۲۲ء

۱۵۱۹ء - ۱۵۵۶ء

۱۵۲۶ء

۱۵۲۹ء

۱۵۲۹ء - ۱۵۳۹ء

۱۵۳۱ء

۱۵۳۳ء

۱۵۳۴ء

۱۵۳۶ء - ۱۵۶۲ء

۱۵۴۰ء

۱۵۴۵ء

۱۵۵۶ء - ۱۶۰۵ء

۱۵۵۸ء - ۱۶۰۳ء

۱۵۶۱ء - ۱۶۲۶ء

۱۵۶۲ء - ۱۵۹۸ء

۱۵۶۴ء - ۱۶۱۶ء

ہنیت داں گلیلو
اسپین کے خلاف اہل سوئڈر لینڈ کی
بغاوت -
ولیم دی سائلٹ کا قتل -
انگریز اسپینی آرمیڈا کو شکست دیتے ہیں -
برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام -
انگلستان میں اسٹوارٹ خاندان -
ورجینیا کی نوآبادی (پہلی انگریز نوآبادی)
ہندستان میں پہلی انگریزی تجارتی کمپنی -
جرمنی میں تیس سالہ جنگ -
انگلستان کی نوآبادیوں کا قیام -
ہاروے دوران خون کا انکشاف کرتا ہے
تاج محل کی تعمیر
سانہیر یا کے پارہوسی بحرِ اقیانوس میں
پہنچتے ہیں اور روس کا ملک دریافت
کرتے ہیں -

انگلستان میں خانہ جنگی - بادشاہ اور
پارلیمنٹ کے درمیان جنگ -
ایزک نیوٹن ریاضی داں -
فرانس کا بادشاہ لوئی چہارم -
اہلِ مانچو چین فتح کر لیتے ہیں -

۱۵۶۴ - ۱۶۲۶ء

۱۵۷۲ - ۱۶۰۹ء

۱۵۸۳ء

۱۵۸۵ء

۱۶۰۰ء

۱۶۰۳ - ۱۶۸۸ء

۱۶۰۷ء

۱۶۱۱ء

۱۶۱۸ - ۱۶۴۸ء

۱۶۲۰ء

۱۶۲۸ء

۱۶۲۹ - ۱۶۵۰ء

۱۶۳۸ء

۱۶۴۲ء

۱۶۴۲ - ۱۶۴۷ء

۱۶۴۳ - ۱۶۴۵ء

۱۶۴۴ء

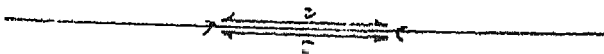
ورسٹ فے ہا کا معاہدہ	۱۶۳۸ء
انگلستان میں کراہول کا دور حکومت	۱۶۳۹ء - ۱۶۵۹ء
ترک ویانا پر حملہ کرتے ہیں۔	۱۶۸۳ء
انگریزی پارلیمنٹ ولیم سوم کو تخت پر بٹھاتی ہے۔	۱۶۸۹ء
روس کا شہنشاہ پیٹر اعظم۔	۱۶۹۶ء - ۱۷۲۰ء
اسپینی تخت کے لیے لڑائی۔	۱۷۱۳ء
جبرالٹر پر برطانیہ کا قبضہ۔	۱۷۰۴ء
روٹ رخ کا صلح نامہ۔	۱۷۱۳ء
شاہ فرانس پندرھواں لوی	۱۷۱۵ء - ۱۷۷۳ء
آسٹریا کے تخت کے لیے جنگ۔	۱۷۴۰ء - ۱۷۴۸ء
فری ڈرک دوم (اعظم) شاہ پروشیا۔	۱۷۴۰ء - ۱۷۸۶ء
صنعتی انقلاب کا عہد۔	۱۷۵۰ء - ۱۸۵۰ء
ڈیٹ ریٹ کی انسائیکلو پیڈیا۔	۱۷۵۲ء
سات سالہ جنگ۔	۱۷۵۶ء - ۱۷۶۳ء
ولف، کیوبک لے لیتا ہے۔	۱۷۵۹ء
عہد نامہ پیرس: کنیڈا برطانیہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔	۱۷۶۳ء
دریافت کے سلسلے میں لگ کی بحری سیاحتیں۔	۱۷۶۳ء - ۱۷۷۹ء
آسٹریا میں جوزف دوم کا اقتدار۔	۱۷۶۵ء

امریکی جنگ آزادی -	۱۷۷۵ء - ۱۷۸۳ء
عہد نامہ ورسائی -	۱۷۸۳ء
آسٹریلیا میں پہلی نوآبادی -	۱۷۸۸ء
انقلابِ فرانس کی ابتدا -	۱۷۸۹ء
واشنگٹن، صدر ممالک متحدہ امریکہ -	۱۷۸۹ء - ۱۷۹۷ء
انقلابی اور نیپولین جنگیں -	۱۷۹۲ء - ۱۸۱۵ء
جیمز ٹیکہ اندازی شروع کرتا ہو -	۱۷۹۶ء
فرانس میں نپولین کا اقتدار -	۱۷۹۶ء - ۱۸۱۵ء
برطانوی پارلیمنٹ غلاموں کی تجارت کو ممنوع قرار دیتی ہو -	۱۸۰۷ء
نیوزی لینڈ میں پہلی نوآبادی -	۱۸۱۴ء
چارچ اسٹیفن سن پہلا انجن بناتا ہو -	۱۸۱۴ء
ویانا کی کانگریس -	۱۸۱۵ء
مقدس اتحاد -	۱۸۱۵ء
جیکسن، صدر ممالک متحدہ امریکہ -	۱۸۲۹ء - ۱۸۳۷ء
انگریزی رفاہی بل -	۱۸۳۲ء
برطانوی مملکت میں غلامی کا افساد -	۱۸۳۳ء
نیوزی لینڈ، برطانوی سلطنت کا ایک حصہ بن جاتا ہو -	۱۸۴۰ء
عملِ جبراحی میں بے ہوش کرنے کا طریقہ پہلی بار استعمال ہوتا ہو -	۱۸۴۶ء

”انقلابوں کا سال“

میںرانی کے تحت رومی جہوڑیت -	۱۸۲۸ء
لن ونگ اسٹن کی سیاحتیں افریقہ میں -	۱۸۲۹ء
پاچھ جراتیم کے متعلق دریافتیں کرتا ہوں -	۱۸۲۹ء - ۱۸۳۳ء
جنگ کریمیا -	۱۸۵۲ء - ۱۸۵۵ء
ڈارون کی کتاب ”آرہجن آف ایشینز“	۱۸۵۹ء
گرے بالڈی جنوبی اطالیہ کو آزاد کرتا ہوں -	۱۸۶۰ء
لن کولن ممالک متحدہ کا صدر منتخب ہوتا ہوں -	۱۸۶۰ء
امریکی خانہ جنگی -	۱۸۶۱ء - ۱۸۶۵ء
لن کولن کا قتل -	۱۸۶۵ء
آسٹریا اور پروشیا کے درمیان جنگ -	۱۸۶۶ء
کنیڈا کی سلطنت کا قیام -	۱۸۶۶ء
آسٹریا اور ہنگری میں مساوات -	۱۸۶۶ء
اطالیہ کا اتحاد - رؤس کا صدر مقام -	۱۸۶۰ء
فرانس اور پروشیا کی جنگ -	۱۸۶۰ء - ۱۸۶۱ء
جرمن سلطنت کا قیام -	۱۸۶۱ء
روس اور ترکی کی جنگ -	۱۸۶۶ء - ۱۸۷۸ء
ہیگ میں صلح کانفرنس -	۱۸۷۸ء
آسٹریلیا کی دولت عامہ کا قیام -	۱۹۰۰ء
ولسن صدر ممالک متحدہ -	۱۹۰۱ء - ۱۹۰۹ء

ٹرانسوال کو حکومت خود اختیاری دی گئی۔	۱۹۰۶ء
پیری، قطب شمال پہنچتا ہے۔	۱۹۰۹ء
روڈبار انگلستان کے پار پہلی دفعہ ہوائی جہاز کی پرواز۔	۱۹۰۹ء
جنوبی افریقہ کی یونین کا قیام۔	۱۹۱۰ء
امنڈسن قطب جنوبی پہنچتا ہے۔	۱۹۱۱ء
چینی جمہوریہ کا قیام۔	۱۹۱۲ء
اسکاٹ قطب جنوبی پہنچتا ہے۔	۱۹۱۲ء
یورپی جنگ عظیم۔	۱۹۱۴ء
روسی انقلاب۔ بالشویک اقتدار حاصل کرتے ہیں۔	۱۹۱۴ء
انگلستان میں عورتوں کو حق طے دہی عطا کیا جاتا ہے۔	۱۹۱۸ء
جرمنی، آسٹریا، بلغاریہ وغیرہ میں انقلاب۔	۱۹۱۸ء
پیرس میں صلح کانفرنس۔	۱۹۱۹ء
مجلس اقوام کا قیام۔	۱۹۱۹ء
ہندوستانی اصلاحات کی اسکیم۔	۱۹۱۹ء
آئرلینڈ کو حکومت خود اختیاری عطا کی گئی۔	۱۹۲۱ء



ہماری زبان

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولہویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔
چند سالانہ ایک روپیہ فی پرچہ ایک آنہ

اُردو

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا سالانہ رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔

اس میں ادب اور اُردو کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ تنقیدی اور تحقیقی مضامین خاص
انتیاء دیکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، ان پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت
ہے۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات
روپے۔ سکہ انگریزی (آٹھ روپے سکہ عثمانیہ) نو روپے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (دو روپے سکہ عثمانیہ)

رسالہ سائنس

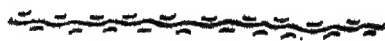
انجمن ترقی اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

دہرا گڑی مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے۔
اس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے۔
دنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں یا پیشیاں یا ایجادیں ہو رہی
ہیں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس
زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات
میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔
قیمت سالانہ صرف پانچ روپے سکہ انگریزی (چھ روپے سکہ عثمانیہ)
خط و کتابت کا پتہ: منظم مجلس ادارت رسالہ سائنس۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

تاریخ تمدن حصہ اول دوم

سرٹاس بکل کی شہرہ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے، تمدن کے ہر مسئلے پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے، قیمت حصہ اول مجلد دو روپے (۲) ، بلا جلد ایک روپیہ آٹھ آنے (۸) ، حصہ دوم مجلد دو روپے (۲) ، بلا جلد ایک روپیہ آٹھ آنے (۸) (بیر)



تاریخ ملل قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں بعض قدیم اقوام، سلطنت کلدانی، آشوری، بابل بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت، عقائد اور صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دل چسپی اور خوبی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے (۱۲) (بیر)

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

